وفناک ترین ناول
دہشت زدہ
اے۔ حمید

1

سرد اندھیری رات تھی۔

آسمان کو سیاہ بادلوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ پہاڑی علاقوں کی برفیلی ہوا چل رہی تھی۔ بجلی چمکتی تو بادلوں کی دبی دبی گرج بھی سنائی دیتی۔ بارش ابھی شروع نہیں ہوئی تھی' لیکن لگتا تھا کہ کسی بھی وقت مینہ پڑنا شروع ہو جائے گا۔ ہم دونوں دوست' یعنی میں اور خالد اس پہاڑی مقام پر انگریزوں کے بنائے ہوئے ایک قدیم قلعے کی شکستہ فصیل کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ کسی وقت بجلی چمکتی تو تھوڑی دیر کے لئے پہاڑی پگڈنڈی نظر آ جاتی اور ہم پھونک پھونک کر قدم رکھتے چلنے لگتے۔ اس قدیم قلعے کے پیچھے گوروں کا دو سو سالہ پرانا قبرستان تھا' جس کی قبریں ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں۔ اس قبرستان میں ساری قبریں انگریزوں کی تھی جو جنگِ آزادی کے زمانے میں مارے گئے تھے۔ یہاں ایک چھتری والی قبر تھی' جس کے بارے میں یہ روایت شروع سے مشہور چلی آ رہی تھی کہ اگر کوئی شخص اس قبر میں رات گزارے تو قبر کا مردہ قبر میں ظاہر ہو کر اس شخص کی ایک خواہش ضرور پوری کرتا ہے۔ کئی لوگوں نے قبر میں رات گزارنے کی ہمت کی تھی لیکن کچھ ڈر کر قبر سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے' کچھ خوف کے مارے بے ہوش ہو گئے تھے اور کچھ دہشت زدہ ہو کر قبر کے اندر ہی مر گئے تھے اور صبح لوگوں نے ان کی لاشیں باہر نکالی تھیں۔ اس کے بعد کسی کو قبر میں رات گزارنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔

جو لوگ قبر میں بے ہوش ہو گئے تھے' انہوں نے ہوش میں آنے کے بعد بتایا تھا کہ قبر کے اندر لیٹنے کے تھوڑی ہی دیر بعد انہیں انسان کے اکھڑے اکھڑے سانس لینے کی آواز سنائی دی' جیسے کوئی مر رہا ہو۔ اس کے بعد ایک انسانی سر اندھیرے میں نظر آیا' جس کی کٹی ہوئی گردن سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک بھیانک انسانی چیخ بلند ہوئی' جیسے قبر پھٹ گئی ہو پھر ہمیں کچھ ہوش نہیں رہا۔ اس چھتری والی قبر کے ڈراؤنے واقعات کسی زمانے میں اخباروں میں بھی چھپتے رہے۔ دہشت کے مارے جب لوگوں نے اس قبرستان کی طرف جانا ہی چھوڑ دیا تو اخباروں' رسالوں میں واقعات چھپنے بھی بند ہو گئے۔ جس زمانے میں اس قبر کے بارے میں عجیب و غریب پُراسرار واقعات شائع ہوتے تھے' میں انہیں شوق سے پڑھا کرتا تھا اور اخبار میں سے تراشے کاٹ کر اپنی کاپی میں چسپاں کر دیا کرتا تھا۔ کیونکہ مجھے آسیبی کہانیاں پڑھنے کا شروع ہی سے بڑا شوق تھا۔ ان دنوں میں دسویں جماعت میں لاہور کے ایک اسکول میں پڑھتا تھا۔ اب میں نے بی اے پاس کر لیا تھا۔ ہماری فیملی بڑی مختصر سی تھی۔ ہم دو بہن بھائی تھے۔ بہن مجھ سے دو سال بڑی تھی۔ والد صاحب کا لاہور کی اکبری منڈی میں آڑھت کا درمیانے درجے کا کاروبار تھا۔ بڑا اچھا گزارہ ہو رہا تھا۔ کرنا خدا کا ایسا ہوا کہ میری بڑی بہن عاصمہ کو ایک بیماری لاحق ہو گئی۔

اسے دورے پڑنے لگے۔ جب اسے دورہ پڑتا تو آنکھیں لال انگارہ بن جاتیں۔ حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکلنے لگتیں اور وہ بے ہوش ہو جاتی۔ گھنٹے آدھ گھنٹے بعد جب ہوش آتا تو بالکل نارمل حالت میں ہو جاتیں اور پوچھتیں کہ مجھے کیا ہو گیا تھا۔ جب ہم اسے بتاتے کہ اس کی آنکھیں لال ہو گئی تھیں' حلق سے ڈراؤنی آوازیں نکلنے لگی تھیں تو وہ حیران ہو کر کہتی:

"مجھے تو کچھ معلوم نہیں۔"

میری بہن عاصمہ کو بی اے کئے دو سال ہو گئے تھے۔ ایک جگہ اس کی شادی کی بات

بھی چل رہی تھی۔ لڑکا امریکہ میں ملازم تھا۔ اس بیماری کی خبر سن کر لڑکے والوں نے یہاں اپنے بیٹے کی شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ ایک دو اور رشتے بھی آئے لیکن جب انہیں یہ پتہ چلا کہ لڑکی کو کوئی جن چمٹا ہوا ہے اور اُسے دورے بھی پڑتے ہیں تو انہوں نے بھی بات آگے نہ بڑھائی اور یہی کہا کہ آپ پہلے اپنی لڑکی کا علاج کرائیں پھر کسی جگہ شادی کی بات چلائیں۔

والد صاحب اور والدہ کو بیٹی کا غم لگ گیا۔ کئی ڈاکٹروں سے علاج کروایا' حکیموں کو دکھایا۔ جن بھوت نکالنے والے عاملوں سے جھاڑ پھونک بھی کرائی لیکن عاصمہ کی پُراسرار بیماری ویسی کی ویسی رہی' اسے دورے پڑتے رہے۔ اسے ہفتے میں ایک آدھ دورہ ضرور پڑ جاتا تھا اور کچھ پتہ نہیں ہوتا تھا کہ یہ دورہ کس وقت پڑ جائے۔ مجھے اپنی بہن کی بیماری کا دکھ تو تھا ہی' اس کے ساتھ اپنے ماں باپ کی پریشانی بھی نہیں دیکھی جاتی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ عاصمہ بہن کی شادی ہو بھی سکے گی یا نہیں۔ اس کے مستقبل کا کیا بنے گا؟ ان ہی دنوں میری نگاہ اچانک اپنی اس پرانی کاپی پر پڑ گئی' جس میں' مَیں نے پہاڑی قلعے والے گوروں کے قدیم قبرستان والی پُراسرار خبریں کاٹ کر چسپاں کی ہوئی تھیں۔ جب میں نے اس خبر کو دوبارہ پڑھا تو اس قلعے والے گوروں کے پرانے قبرستان میں ایک چھتری والی قبر بھی ہے' جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگر کوئی آدمی اس قبر میں ایک رات گزار لے تو قبر کا مردہ اس آدمی کی زندگی کی ایک خواہش ضرور پوری کر دیتا ہے' تو میں سوچ میں پڑ گیا۔ عاصمہ کی بیماری کے علاج کے معاملے میں ہم ہر طرف سے مایوس ہو چکے تھے۔ اب کوئی معجزہ ہی اسے اس بیماری سے نجات دلا سکتا تھا۔ میں نے سوچا' کیوں نہ میں چھتری والی قبر میں ایک رات گزار کر قسمت آزماؤں۔ ہو سکتا ہے رات کے وقت قبر کا مردہ واقعی ظاہر ہو جائے اور مجھ سے پوچھے کہ میری زندگی کی آخری اور سب سے اہم خواہش کیا ہے۔ تب میں اسے کہوں گا کہ میری زندگی کی ایک ہی خواہش ہے کہ میری بہن کی بیماری ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ ہو سکتا ہے چھتری والی قبر کسی بزرگ پادری کی

ہو اور اس کی دعا سے میری بہن عاصمہ کو بیماری سے نجات مل جائے۔ اس میں لگتا بھی کچھ نہیں تھا۔ صرف ذرا ہمت اور جرأت سے کام لینے کی ضرورت تھی اور وہ میرے اندر موجود تھی۔ مجھے بچپن ہی سے پرانے قلعے' آسیبی حویلیاں' پُراسرار کھنڈر اور ایسے قدیم کنوئیں اور تاریخی باولیاں دیکھنے کا شوق تھا' جن کے بارے میں یہ مشہور ہو کہ وہاں جن بھوت چڑیلیں رہتی ہیں اور وہاں آدھی آدھی راتوں کو کبھی عورتوں کے قہقہے لگانے اور بچوں کے رونے کی آوازیں آتی ہیں۔ میرا شوق اور ذوق تجسس مجھے بے دھڑک ایسی جگہوں پر لے جاتا تھا اور میں ذرا نہیں ڈرا کرتا تھا۔ میں ایسی کہانیاں اور ناول بھی بڑے شوق سے پڑھتا تھا' جن میں جن بھوتوں' چڑیلوں' جادوگروں اور بدروحوں کا ذکر ہوتا تھا۔

چنانچہ میں نے اس وقت فیصلہ کرلیا کہ میں گوروں کے قبرستان میں چھتری والی قبر میں ایک رات لیٹ کر ضرور گزاروں گا۔ میں نے گھر میں کسی سے اپنے اس فیصلے کا ذکر نہ کیا۔ میرا ایک ہی گہرا اور ہم راز دوست خالد تھا۔ میں نے اسے بتا دیا کہ میں اپنی بہن کی بیماری کے علاج کے لئے گوروں کے قبرستان میں جو چھتری والی قبر ہے' اس میں ایک رات گزارنا چاہتا ہوں۔

خالد نے میرے ساتھ ہی لاہور کے ایک کالج سے بی ایس سی کا امتحان پاس کیا تھا اور اب ایک کیمیکل فیکٹری کی لیبارٹری میں ملازم تھا۔ اس نے میری بات بڑی توجہ سے سنی اور بولا:

"میں ان باتوں کو نہیں مانتا، یہ سب توہمات ہیں۔ بھلا کوئی مرا ہوا آدمی بھی کبھی دنیا میں واپس آیا ہے۔ مَیں حیران ہوں کہ تم پڑھے لکھے ہو کر اس قسم کی باتوں پر یقین رکھتے ہو۔"

میں نے کہا:

"اس میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ آخر قسمت آزمانے میں کیا حرج ہے۔ تم تو جانتے ہو کہ بہن عاصمہ کی وجہ سے ہمارے گھر کے سبھی لوگ کس قدر پریشان ہیں۔ خود عاصمہ بہن

اندر ہی اندر اس غم میں گھلتی جا رہی ہے۔ ہو سکتا ہے خدا اِسی سبب سے اس کی بیماری دور کر دے۔"

خالد بولا: "مَیں تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ اس خیال کو دل سے نکال دو۔ یہ خلافِ اسلام بات ہے۔ یہ شرک ہے۔ آگے تم خود مختار ہو' جو تمہاری مرضی ہے کرو۔"

مَیں فیصلہ کر چکا تھا۔ اس لئے خالد کی باتوں پر کوئی دھیان نہ دیا۔ خالد نے جب دیکھا کہ میں توہم پرستی سے کسی صورت باز نہیں آ رہا تو وہ کہنے لگا:

"اس میں تمہاری جان جانے کا بھی خطرہ ہے۔ تم نے کاپی میں خبروں کے جو تراشے کاٹ کر رکھے ہوئے ہیں' ان میں پڑھا نہیں کہ اپنی زندگی کی آخری خواہش پوری کرانے کئی لوگ چھتری والی قبر میں رات گزارنے کے لئے لیٹے اور صبح کو مردہ پائے گئے۔"

مَیں نے کہا: "اپنی پیاری بہن کی بیماری دور کرانے میں اگر میری جان بھی چلی جاتی ہے تو مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔"

خالد خاموش ہو گیا۔ پھر کچھ سوچ کر کہنے لگا۔

"اس آسیبی مہم پر مَیں تمہیں اکیلے نہیں جانے دوں گا۔ مَیں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا۔"

مَیں نے کہا: "لیکن میری ایک شرط ہے کہ تم اس بارے میں کسی سے کوئی بات نہیں کرو گے اور مکمل رازداری سے کام لو گے۔"

خالد بولا: "مجھے کسی کو بتانے کی کیا ضرورت ہے۔"

اس کے بعد ہم نے اس پہاڑی مقام کی طرف جانے کی تیاری شروع کر دی' جہاں قدیم قلعے کے کھنڈر تھے اور قلعے کے پیچھے گوروں کا قبرستان تھا اور اس قبرستان میں کسی گورے کی چھتری والی قبر بھی تھی۔ ہم نے کچھ گرم کپڑے اپنے ساتھ رکھ لئے کیونکہ اکتوبر کا مہینہ شروع ہو چکا تھا اور اس موسم میں پہاڑوں پر برفیلی ہوائیں چلنے لگتی ہیں اور سخت سردی ہو جاتی ہے۔ لاہور سے ہم ایک بس میں سوار ہو کر شام ہونے سے ذرا پہلے

راولپنڈی پہنچ گئے۔ رات ہم نے پنڈی کے ایک ہوٹل میں بسر کی اور دوسرے روز لاری میں بیٹھ کر اس پہاڑی مقام کی طرف روانہ ہو گئے' جہاں گوروں کا قدیم قبرستان تھا۔ میں کسی وجہ سے اس جگہ کا نام نہیں لکھنا چاہتا۔ جگہ کا نام لکھنے اور نہ لکھنے سے کوئی خاص فرق بھی نہیں پڑتا۔ لیکن اس جگہ کو صیغۂ راز میں ہی رکھنا چاہتا ہوں۔ آپ صرف میری سچی داستانِ عبرت اور آپ بیتی سنیں' جس نے میری اور میری بہن کی زندگی کو ایک ایسے عذاب میں مبتلا کر دیا کہ اگر بزرگوں کی دعائیں اور اللہ کا کرم ہمارے شاملِ حال نہ ہوتا اور آج میں اپنی عبرت ناک آپ بیتی سنانے کے لئے زندہ نہ ہوتا۔

ڈھائی تین گھنٹوں کے پہاڑی سفر کے بعد ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے اور ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں کمرہ کرائے پر لے لیا۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ہم گوروں کے قبرستان میں چھتری والی قبر کا جائزہ لینے ہوٹل سے چل پڑے۔ یہ قبرستان انگریزوں کے زمانے کے بنے ہوئے ایک پہاڑی قلعے کے پیچھے نشیب میں واقع ہے۔ موسم سرد تھا۔ شروع اکتوبر کی سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ آسمان ابر آلود تھا، کافی ٹھنڈ تھی۔ ہم نے خوب گرم کپڑے پہن رکھے تھے۔ سروں پر اونی گرم ٹوپیاں تھیں۔ مختلف پہاڑی راستوں سے گزرتے ہوئے' آخر ہم پرانے قلعے کے کھنڈر کے نشیب میں واقع گوروں کے قبرستان میں آ گئے۔ قبرستانوں کی فضا ویسے ہی بڑی اداس اور عبرت انگیز ہوتی ہے' لیکن اس قبرستان پر کچھ زیادہ ہی ویرانی برس رہی تھی۔ ایک تو یہ ڈھائی تین سو سال پرانا قبرستان تھا۔ دوسرے اس میں ایسے انگریزوں کی قبریں تھیں' جن کے لواحقین بھی مر کھپ گئے تھے اور قبروں کی خبر گیری کرنے والا کوئی نہیں رہا تھا۔ جب تک انگریزوں کی حکومت رہی' اس قبرستان کی دیکھ بھال ہوتی رہی۔ انگریز بوریا بستر لپیٹ کر چلے گئے تو انہیں کوئی پوچھنے والا بھی نہ رہا۔ قبریں ٹوٹ پھوٹ گئیں، کتبے اکھڑ گئے۔ لوگ اینٹیں پتھر اٹھا کر لے گئے۔

کچھ قبروں کے ایک طرف جھکے ہوئے خاک آلود کتبے ابھی باقی تھے۔ ایک کتبے پر

انگریزی میں لکھے ہوئے الفاظ بڑی مشکل سے پڑھے گئے۔ یہ کسی انگریز فوجی افسر کی قبر تھی جو اس قبرستان میں دفن دوسرے گوروں کی طرح 1857ء کی جنگِ آزادی میں قتل ہو گیا تھا۔ کتبے کے نیچے تاریخ اور سن درج تھا۔ تاریخ تو نہیں پڑھی گئی۔ سن ۱۸۵۷ء کندہ کیا ہوا تھا۔ اکثر قبریں بارش کی وجہ سے اکھڑ چکی تھیں اور ان میں گڑھے پڑ گئے تھے۔ ایک عجیب سی بدن پر کپکپی طاری کر دینے والی آسیبی ویرانی کا احساس ہوتا تھا۔ ہمیں چھتری والی قبر کی تلاش تھی۔ آخر یہ قبر ہمیں مل گئی۔ اس قبر کا چبوترا اگرچہ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا' مگر اپنی جگہ پر قائم تھا اور اس کے اوپر لگی ہوئی پتھر کی چھتری بھی جو دھوپ اور پہاڑی بارشوں کی مار کھا کر سیاہ پڑ چکی تھی' اپنی جگہ پر قائم تھی۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ اس قبر کے متعلق بڑی ڈراؤنی آسیبی روایت مشہور تھی' اس لئے کوئی انسان ڈر کے مارے اس کے پاس نہیں آتا تھا۔ چبوترے میں ایک جانب زمین میں گہرا شگاف پڑا ہوا تھا۔ ہم نے جھک کر دیکھا۔ شگاف کے اندر قبر کی لحد نظر آ رہی تھی۔ جہاں کہیں کہیں خشک گھاس اگی ہوئی تھی۔ مرنے والے کی ایک بھی ہڈی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ بارشوں میں شگاف کے اندر پہاڑوں کی مٹی بہہ بہہ کر جاتی رہی تھی' جس میں ہڈیاں یا تو دب گئی تھیں اور یا انہیں جنگلی جانور اٹھا کر لے گئے تھے۔ قبر کے اندر سے عجیب ناگوار سی بو آ رہی تھی۔

قبر کا یہ شگاف ان لوگوں کا بنایا ہوا تھا جو کچھ عرصہ پہلے قبر کے مردے سے اپنی زندگی کی کوئی اہم خواہش پوری کروانے کے لئے رات کے وقت اس میں داخل ہوتے رہے تھے۔ اب چونکہ کئی برسوں سے اس طرف کوئی نہیں آیا تھا' اس لئے شگاف کے کناروں پر گھاس اگ آئی تھی۔ خالد نے کہا:

”کیا اس گڑھے میں تم رات بسر کرو گے؟ میں تو کہتا ہوں کہ اب بھی وقت ہے' اس خیال کو دل سے نکال دو اور میرے ساتھ لاہور واپس چلو۔ خوامخواہ کہیں کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤ۔“

میں نے کہا۔ "دوست! تم میری مجبوری اچھی طرح جانتے ہو۔ مجھے جو کچھ کرنا ہے ایک بار کر لینے دو۔ ممکن ہے قدرت اسی وسیلے سے میری پیاری بہن کی بیماری دور کر دے۔"

خالد نے کہا۔ "اگر اس طرح لوگوں کی بیماریاں دور ہونے لگیں تو دنیا کے سارے ڈاکٹر بیکار ہو جائیں اور ہسپتالوں میں خاک اڑتی نظر آئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم اپنی زندگی کی سب سے بڑی حماقت کرنے والے ہو۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ تم ایک بہت بڑا گناہ کرنے والے ہو۔ خدا تمہیں معاف کرے اور سیدھا راستہ دکھائے۔ میں تمہارے لئے دعا ہی کر سکتا ہوں' کیونکہ مجھے معلوم ہے تم باز نہیں آؤ گے۔"

حقیقت بھی یہی تھی کہ مجھ پر خالد کی نصیحتوں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ آج میں سوچتا ہوں کہ اگر میں اپنے دوست کی نصیحت پر عمل کر لیتا تو کس قدر ہولناک عذاب سے بچ جاتا۔ لیکن میں نے ایسا نہ کیا اور اپنے ساتھ اپنی بہن کو بھی ایک ایسے اذیت ناک عذاب میں مبتلا کر دیا کہ جس کو یاد کر کے آج بھی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہم چبوترے کے اوپر آ گئے۔ یہاں پتھروں سے بنائی ہوئی ٹوٹی ہوئی قبر کا نشان موجود تھا۔ البتہ کتبہ غائب تھا۔ یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ قبر کس انگریز کی ہے' وہ کوئی راہب تھا یا فوجی سپاہی تھا۔ نیچے اتر کر میں نے ایک بار پھر شگاف میں جھانک کر قبر کی لحد کا جائزہ لیا۔ خالد سے نہ رہا گیا۔ اس نے ایک بار پھر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"کیا تم اس قبر میں ساری رات لیٹے رہو گے؟"

"میں نے کہا۔ "میں ایسا کرنے پر مجبور ہوں دوست!"

خالد بولا۔ "تو پھر بازار سے میں ایک صف لا کر قبر میں بچھا دیتا ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

لیکن خالد نے شام کے وقت قبر کے اندر اپنا بڑا تولیہ بچھا دیا۔ دن کے وقت آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھائے رہے، شام کو بادل گہرے ہو گئے۔ چھتری والی قبر کے بارے میں جو

روایت مشہور تھی' اس کے مطابق مجھے رات کے بارہ بجے کے بعد قبر میں لیٹنا تھا۔ میں اور خالد رات کے ٹھیک پونے بارہ بجے ہوٹل سے نکل آئے۔ اس نوقت بادلوں میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد بجلی چمکنے لگی تھی۔ جب ہم اندھیرے میں پرانے قلعے کی فصیل کے قریب آئے تو خالد کہنے لگا۔ "اگر بارش شروع ہو گئی تو تمہارا قبر میں لیٹے رہنا مشکل ہو جائے گا۔ شگاف میں سے قبر میں پانی آ جائے گا۔"

میں نے کہا۔ "اگر ایسی بات ہوئی تو میں واپس آ جاؤں گا۔"

ہم قلعے کی ڈھلان سے اتر کر گوروں کے پرانے قبرستان میں داخل ہو گئے تھے۔ بجلی چمکی، تو چھتری والی قبر نظر آ گئی۔ وہ اس وقت مجھے بدروحوں کا مسکن لگی۔ یہی وہ قبر تھی جہاں باقی کی رات مجھے اس میں لیٹ کر گزارنی تھی۔

مجھے اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ میں خلافِ اسلام اور خلاف عقل فعل کر رہا ہوں' شرک کر رہا ہوں۔ اپنی بہن کی پُراسرار بیماری کے سلسلے میں صرف اللہ تعالیٰ کے حضور شفا کی دعا مانگنی چاہیے' لیکن دنیاوی اور خاص طور پر خون کے رشتوں کی انسانی کمزوری مجھ پر غالب آ گئی تھی۔ میرا ضمیر بھی مجھے شرک کے اس مذموم فعل پر اندر ہی اندر ملامت کر رہا تھا مگر ایک خاص حد سے آگے بڑھی ہوئی ماں باپ اور بہن کی محبت نے میری عقل پر پردہ ڈال دیا تھا اور میں شرک کے گناہِ عظیم کے عذاب سے بے خبر غلط راہ پر آگے ہی آگے بڑھا چلا جا رہا تھا۔

ہم چھتری والی قبر کے شگاف کے پاس آ کر رک گئے۔ میں نے جھک کر قبر میں دیکھا۔ قبر میں تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ بجلی چمکی تو قبر میں بچھا ہوا تولیہ دکھائی دیا۔ میں نے خالد سے کہا:

"اب تم بے شک واپس ہوٹل چلے جاؤ' اگر بارش شروع ہو گئی تو میں بھی واپس آ جاؤں گا۔"

میرے دوست کا واپس جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا مگر میرے مجبور کرنے پر وہ چلا گیا۔

قبرستان کی تاریکی میں وہ دوسرے ہی لمحے میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اب میں گوروں کے اس قدیم اور ویران قبرستان کی سرد اندھیری رات میں اکیلا رہ گیا۔ ایک لمحے کے لئے میرے دل میں خیال آیا کہ مجھے بھی ہوٹل واپس چلے جانا چاہیے' کہیں میں واقعی کسی عذاب میں نہ پھنس جاؤں۔ لاہور واپس جا کر مجھے عاصمہ بہن کی بیماری کا علاج کرنے کے لئے کسی اور ڈاکٹر سے مشورہ کرنا چاہیے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میرے ذہن پر منفی خیالات غالب آ گئے اور میں سوچنے لگا کہ اتنے ڈاکٹروں کو دکھا چکا ہوں' کسی کے علاج سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ یہ ایک آخری موقع ہاتھ آیا ہے۔ اسے بھی آزما لینا چاہیے۔ اور میں قبر کے اندھیرے میں اتر گیا۔

میں شگاف میں سے رینگ کر قبر میں گیا تھا۔ قبر لمبائی میں انسان کے نارمل قد کے مطابق تھی' مگر زیادہ اونچی نہیں تھی۔ میں نے بیٹھنے کی کوشش کی تو میرا سر اوپر چھت سے ٹکرا گیا۔ میں تولیہ پر بالکل سیدھا لیٹ گیا اور سردی سے بچنے کے لئے دونوں ہاتھ اپنی گرم جیکٹ کے اندر کر لئے۔ میری نائیلون کی جیکٹ کافی گرم تھی لیکن قبر کی زمین سال ہا سال کی بارشوں سے اتنی نم آلود ہو گئی تھی کہ مجھے قبر میں لیٹنے کے تھوڑی دیر بعد ہی تولیئے میں سے ٹھنڈ چڑھنے لگی۔ میں نے سر پر گرم اونی ٹوپی پہنی تھی اور گلے میں گرم مفلر بھی تھا' اس کے باوجود مجھے سردی لگ رہی تھی۔

میں قبر میں لیٹ گیا تھا اور دل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اگر بارش زیادہ تیز ہو گئی تو قبر سے باہر آ جاؤں گا ورنہ باقی کی ساری رات قبر میں ہی لیٹ رہوں گا اور دیکھوں گا کہ اس قبر کے مردے کی روح یا بدروح ظاہر ہوتی ہے یا نہیں۔ بجلی چمکتی تو قبر کی تاریکی تھوڑی دیر کے لئے چمک اٹھتی اور اس کے بعد اندھیرا اور زیادہ گہرا ہو جاتا۔ میں بالکل خاموش چت لیٹا ہوا تھا۔ مجھے اپنے سانس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد بجلی چمکنا بند ہو گئی۔ بادلوں کی گرج بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔ قبرستان کی تاریک رات اس قدر سنسان اور ساکت ہو گئی کہ مجھے خوف سا محسوس ہونے لگا۔ قبر کی زمین کی ٹھنڈ تولیہ میں

سے گزر کر میرے جسم کو جیسے سن کر رہی تھی۔ اب بجلی چمکتی تھی' نہ بادل گرجتے تھے' نہ بارش ہوتی تھی' ایک رونگٹے کھڑے کر دینے والا ہیبت ناک سناٹا چھا گیا تھا۔ پہلے مجھے اپنے سانس کی آواز سنائی دیتی تھی اب دل کی دھڑکن بھی سنائی دینے لگی تھی۔

ایک بار تو میں گھبرا کر اٹھنے لگا کہ قبر سے نکل کر بھاگ جاؤں اور ہوٹل کے کمرے میں جا کر لحاف اوپر لے کر سو جاؤں۔ لیکن کسی طاقت نے نہیں' بلکہ میری مجبوری نے مجھے اٹھنے نہ دیا اور قبر میں ہی جکڑے رکھا۔ رات آہستہ آہستہ گزرتی جا رہی تھی۔ پہلے میں ذہن میں اندازہ لگاتا جاتا تھا کہ اب رات کے سوا بارہ بج چکے ہوں گے۔ اب ساڑھے بارہ بجے ہوں گے۔ لیکن کچھ دیر کے بعد وقت کا احساس ختم ہو گیا اور قبر کی فضا نے مجھے اپنے اندر جذب کر لیا۔ قبر ———— جہاں کوئی دن نہیں ہوتا' کوئی رات نہیں ہوتی' کوئی موسم نہیں ہوتا' کوئی وقت نہیں ہوتا' کوئی آواز نہیں ہوتی۔ صرف مرگ آلود سکوت ہوتا ہے اور تاریکی ہوتی ہے۔ ایسی تاریکی' جس میں کوئی لہر نہیں ہوتی' کوئی حرکت نہیں ہوتی۔ ایک ازلی اور ابدی تاریکی ہوتی ہے جو قبر میں آ کر بند ہو جاتی ہے اور وہیں سیاہ پتھر کی طرح جم جاتی ہے۔

مجھے محسوس ہونے لگا کہ قبر کے باہر بھی وقت تھم گیا ہے۔ تاریکی اور گہری ہو گئی ہے اور کسی گہری سیاہ چٹان کی طرح اپنی جگہ پر پتھر ہو گئی ہے' ساکت ہو گئی ہے۔ نہ بجلی کی ہلکی ہلکی چمک تھی' نہ بادلوں کی دھیمی دھیمی گرج تھی۔ دور اور نزدیک سے کسی پرندے کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ قبر کی مہیب تاریکی نے جیسے کائنات کی تمام آوازوں کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔ تمام آوازیں پتھر ہو گئی تھیں۔ صرف مجھے اپنے سانس کے چلنے اور دل کے دھڑکنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ صرف ان دو آوازوں سے مجھے یقین ہو رہا تھا کہ میں اگرچہ قبر کے اندر ہوں لیکن ابھی زندہ ہوں۔ مجھے کچھ پتہ نہیں' باہر رات کتنی گزر چکی تھی کہ مجھے گہرے گہرے سانس لینے کی سرگوشیوں ایسی آواز سنائی دی۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ یہ میرے اپنے سانس کی آواز ہے۔ میں نے اپنا سانس روک لیا۔

گہرے سانس لینے کی آواز اب بھی آ رہی تھی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ میرے سانس کی آواز نہیں تھی۔ قبر کی تاریکی میں میرے علاوہ کوئی دوسرا بھی سانس لے رہا تھا۔ مجھے اسی چھتری والی آسیبی قبر کے بارے میں مشہور افسانوی روایت یاد آ گئی۔ جو لوگ قبر میں دہشت زدہ ہو کر بے ہوش ہو گئے تھے' انہوں نے ہوش میں آنے کے بعد بتایا تھا کہ رات کے پچھلے پہر قبر میں کسی کے لمبے لمبے سانس لینے کی آوازیں آتی ہیں۔ پھر دو لال انگارہ ایسی آنکھیں نمودار ہوتی ہیں' پھر ایک چیخ بلند ہوتی ہے' جیسے قبر پھٹ گئی ہو۔ میں سمجھ گیا کہ جس مردے کا میں چلہ کاٹ رہا ہوں اس کے نمودار ہونے کی علامات ظاہر ہونا شروع ہو گئی ہیں۔ چنانچہ میں نے اپنے اوپر خوف کو غالب نہ آنے دیا اور قبر کے اندر اپنی پوری قوتِ ارادی سے کام لے کر لیٹا رہا۔

لمبے لمبے سانس لینے کی انسانی آواز میرے اتنے قریب آ گئی کہ لگتا تھا کوئی بالکل میرے کان کے پاس آ کر سانس لے رہا ہے۔ میں ضبط کر کے لیٹا رہا۔ میری آنکھیں کھلی تھیں مگر قبر کے اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ آہستہ آہستہ گہرے سانس لینے کی آواز مجھ سے دور ہوتی گئی، پھر آواز آنا بند ہو گئی۔ میں نگاہیں نیچی کئے قبر میں اپنے پاؤں کی سمت والی دیوار کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک تاریکی میں دیوار درمیان میں سے سرخ ہونے لگی۔ پھر اس تاریکی میں دہکتے ہوئے لال انگاروں ایسی دو آنکھیں ابھر آئیں۔ پہلے میں یہی سمجھا کہ یہ دہکتے ہوئے انگارے ہیں' لیکن جب ان انگاروں نے پلکیں جھپکیں تو معلوم ہُوا کہ یہ دو آنکھیں ہیں۔ میں نے اپنے آپ کو دہشت زدہ نہیں ہونے دیا بلکہ بڑی دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے قبر میں لیٹا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب ایک قیامت خیز چیخ کی آواز آئے گی۔ میں نے اپنے آپ کو چیخ سننے اور اسے برداشت کرنے کے لئے تیار کر لیا۔ آدمی اگر اپنے آپ کو کسی خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کر لے تو خطرے کی شدت آدھی ضرور کم ہو جاتی ہے۔ میں نے سوچا کہ مجھے چیخ کی شدت کو مزید کم کرنے کے لئے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لینی چاہئیں۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک

ایک ایسی فلک شگاف چیخ بلند ہوئی کہ جیسے کوئی پہاڑ پھٹ پڑا ہو۔ قبر میں ایک لمحے کے لئے زلزلہ سا آ گیا۔ میں قبر میں ایک فٹ اوپر اچھل کر نیچے گر پڑا۔ مگر میں نے اپنے ہوش و حواس کو قابو میں رکھا۔ مجھے علم تھا کہ یہ میرے چلے کا آخری مرحلہ ہے اور اس کے بعد وہ مردہ نمودار ہونے والا ہے' جس نے میری زندگی کی آخری خواہش کو پورا کرنا ہے۔ ایک بار پھر وہی موت کا سناٹا چھا گیا تھا۔ میں اندھیرے میں ٹکٹکی باندھے قبر میں اپنے پاؤں کی سمت دیکھ رہا تھا۔

اندھیرے میں ایک انسانی شکل کا ہیولا سا ابھرنے لگا۔ لال انگارہ آنکھیں غائب ہو گئی تھیں۔ انسانی ہیولے کی شکل پوری طرح نظر نہیں آ رہی تھی۔ یہ ایک دھندلی سی انسانی کھوپڑی تھی' جس کی آنکھوں اور نتھنوں کی جگہوں پر سیاہ گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ کھوپڑی کا رخ میری جانب تھا۔ میں نے بھی اپنی نظریں اس کھوپڑی پر جما رکھی تھیں۔ گہرے سانس لینے کی آواز آہستہ آہستہ پھر ابھرنے لگی۔ پھر ایک اکھڑی اکھڑی انسانی آواز سنائی دی۔

"میں تمہاری ایک خواہش پوری کرنے کا پابند ہوں۔ اپنی خواہش بتاؤ۔"

میں سمجھ گیا کہ یہ چھتری والی قبر کے مردے کی آواز ہے اور میرا چلہ کامیاب ہو گیا ہے۔ اس کے باوجود قبر میں لیٹنے اور وہاں کسی مردے کی آواز سننے کا یہ میری زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔ میرے جسم پر خوف کے مارے ایک کپکپی سی ضرور طاری ہو گئی تھی۔

میں نے پوری ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"میری بہن کو کوئی پُراسرار بیماری لگ گئی ہے۔ میری پہلی اور آخری خواہش ہے کہ میری بہن کی بیماری دور ہو جائے۔"

چھتری والی قبر کے مردے یا بدروح کی آواز خاموش ہو گئی تھی۔ اس نے میری خواہش کے اظہار کے جواب میں خاموشی اختیار کر لی تھی۔ اس کی کھوپڑی کے نقوش قبر کی تاریکی میں مجھے صاف دکھائی دے رہے تھے اور لمبے لمبے گہرے گہرے سانس لینے کی

آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ میں نے کہا:

"میں نے تمہارا چلہ کاٹا ہے۔ اگر تم قول کے سچے ہو اور اپنے وعدے کے پابند ہو تو تمہیں میری خواہش پوری کرنی ہوگی۔"

بدروح کی اکھڑی اکھڑی آواز دوبارہ سنائی دی۔

"تمہاری بہن پر جس طاقت کا سایہ ہے میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ لیکن تمہاری بہن کی بیماری دور کرنے میں تمہاری مدد ضرور کروں گا۔ میری بات کو دھیان سے سنو! یہاں سے جنوب کی طرف کھنڈوہ نام کا ایک شہر ہے۔ اس شہر سے پچاس میل دُور دریائے نربدا کے کنارے مدن سینا نام کا ایک جنگل ہے۔ اس جنگل میں میشور نام کا ایک مندر پہاڑی پر بنا ہُوا ہے۔ اس پہاڑی میں ایک پرانا غار ہے۔ اس غار میں بکرم نام کا ایک سادھو سمادھی لگائے بیٹھا ہے۔ اس کے پاس جا کر کہنا مجھے چھتری والی قبر کے مردے نے بھیجا ہے' اس کے بعد کچھ نہ بولنا۔ وہ سب سمجھ جائے گا کہ تم کیا چاہتے ہو۔ صرف اس سادھو کی مدد سے تمہاری بہن کی بیماری دور ہو سکتی ہے۔ اب میری قبر سے نکل جاؤ' اور سنو! جو کچھ میں نے تمہیں بتایا ہے، اس کا کسی دوسرے سے ذکر نہ کرنا۔ جاؤ' نکل جاؤ، میری قبر سے نکل جاؤ۔"

اس کے فوراً بعد گہرے انسانی سانسوں کی آواز بند ہو گئی اور کھوپڑی کا ہیولا بھی تاریکی میں تحلیل ہو گیا۔ قبر کے اندر اور باہر ایک بار پھر وہی موت کا سناٹا چھا گیا۔ میں نے اپنے اکڑے ہوئے ٹھنڈے جسم کو حرکت دی اور رینگتا ہُوا قبر کے شگاف سے باہر نکل آیا۔ مجھے ایسی خوشی ہو رہی تھی' جیسے میں نے اپنی پیاری بہن کی بیماری کا علاج تلاش کر لیا ہے اور اب اسے بیماری سے نجات مل جائے گی۔ آسمان پر اسی طرح گہرا اندھیرا تھا۔ چاروں طرف قبرستان پر تاریکی کا راج تھا۔ مَیں ٹوٹی پھوٹی قبروں کے بکھرے ہوئے پتھروں کے درمیان پھونک پھونک کر قدم رکھ کر چلتے ہوئے پرانے قلعے کی دیوار کے پاس آ گیا۔ میرے دل کی کیفیت اس آدم ایسی تھی' جو کسی سخت آزمائش میں سے گزرنے میں

امیاب ہو گیا ہو یا پھر جیسے کسی کی لاٹری نکل آئی ہو۔

مجھے اب قبرستان اور پرانے قلعے کے آسیبی کھنڈروں سے کسی قسم کا خوف محسوس یں ہو رہا تھا۔ مَیں قلعے کے بڑے دروازے کی ڈھلان اترنے کے بعد چھوٹی سی پہاڑی ڑک پر آ گیا اور تیز تیز اپنے ہوٹل کی طرف چل پڑا۔ ہوٹل کے کمرے کا دروازہ بند ھا۔ مَیں نے دستک دی۔ خالد جاگ رہا تھا۔ اس نے دروازہ کھول کر مجھے دیکھا تو بے ختیار بولا:

"یا اللہ! تیرا شکر ہے کہ یہ شخص زندہ سلامت واپس آ گیا۔ جلدی سے بتاؤ کیا ہُوا؟ تم دو گھنٹے بعد ہی واپس آ گئے ہو۔"

ہوٹل میں آ کر مجھے پتہ چلا کہ مَیں دو گھنٹے سے قبر میں لیٹا رہا تھا۔ حالانکہ قبر کے اندر مجھے ایسا لگا تھا جیسے مَیں نے ساری رات گزار دی ہو۔ قبر کے اندر وقت شاید بے حد سست رفتار ہو گیا تھا۔ چھتری والی قبر کے مردے نے مجھے ہدایت کی تھی کہ مَیں یہ راز کسی کو نہ بتاؤں کہ اس نے مجھے کیا کہا ہے۔ مَیں نے خالد سے کہا:

"دوست! بات اصل میں یہ ہے کہ میں تم سے کچھ نہیں چھپا سکتا۔ میں قبر میں ڈر گیا تھا اور بھاگ آیا ہوں۔"

خالد بولا: "مَیں نے تمہیں پہلے ہی کہا تھا کہ اِن توہمات سے باز آؤ۔ خدا کا شکر ہے کہ تم زندہ بچ کر آ گئے ہو۔ ہُوا کیا تھا؟"

مَیں نے یونہی اسے ایک جھوٹی کہانی بنا کر سنا دی اور کہا کہ قبر میں ایک چڑیل آ گئی تھی۔ اس نے میرا گلا دبانا چاہا' مَیں چیخ مار کر قبر سے نکل آیا۔

"میری توبہ! اب مَیں کبھی اس قسم کے واہیات خیال دل میں نہیں لاؤں گا اور اپنی بہن کا علاج کسی بہتر سے بہتر ڈاکٹر سے کراؤں گا۔"

خالد بڑا خوش ہُوا کہ مَیں سیدھی راہ پر آ گیا ہوں۔ اسے کیا معلوم تھا کہ مَیں ایک راہ پر چل نکلا ہوں جو سیدھی پاتال کے دوزخ میں جاتی ہے۔ خالد کہنے لگا:

"ہمارے ایک قریبی رشتے دار کی فیملی کینیڈا میں آباد ہے۔ مَیں کوشش کروں گا' عاصمہ بہن کو کینیڈا بھجوا دوں۔ وہاں کے ڈاکٹروں کے علاج سے وہ ضرور اچھی ہو جا گی۔"

مَیں نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا:

"یہ بڑی اچھی بات کی ہے تم نے ——— مَیں خود اسے لے کر کینیڈا چلا جاؤ گا۔"

ہم کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ مَیں نے تھرمس میں سے گرم گرم چائے نکال کر جس سے میرے جسم کی سردی دور ہو گئی۔ پھر مَیں لحاف اوڑھ کر سو گیا۔ چھتری والی کے مردے نے جو کچھ کہا تھا' وہ مجھے زبانی یاد ہو گیا تھا۔ مجھے سب سے پہلے لاہور سے کھنڈوہ شہر جانا تھا۔ وہاں سے پچاس میل دور دریائے نربدا کے کنارے مدن سینا کے جنگ میں پہنچ کر ہیشور نام کی پہاڑی تلاش کرنی تھی' جس کے اندر غار میں سادھی لگا کر بیٹ بکرم نام کے سادھو سے ملنا تھا۔

صبح اٹھ کر مَیں نے یہ ساری باتیں اپنی ڈائری پر لکھ لیں تا کہ بھول نہ جاؤں۔ لاہور واپس آ گئے۔ لاہور آنے کے بعد مَیں نے ریلوے سٹیشن جا کر انکوائری آفس سے کھنڈوہ شہر کے بارے میں پوچھا کہ یہ شہر انڈیا میں کس جگہ پر ہے۔ معلوم ہُوا کہ یہ ش لاہور سے بمبئ جاتے ہوئے بھوپال کی جانب راستے میں آتا ہے۔ یہ داستان جو میں آپ سنا رہا ہوں' پاکستان کے قیام سے تین چار سال پہلے کی ہے اور آدمی جس جگہ چاہے بغ ویزے کے سفر کر سکتا تھا۔ کسی شہر کا ویزہ لینے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ابھی انڈیا انگریزوں کی حکومت تھی۔ گھر والوں سے مَیں نے یہ کہا کہ مجھے کسی نے بتایا ہے کہ دو میں ایک پارسی ڈاکٹر ہے جو عاصمہ کی بیماری کا علاج کر سکتا ہے۔ اسی لئے میں پہلے خود جا اس ڈاکٹر سے ملنا چاہتا ہوں تا کہ عاصمہ بہن کی بیماری کے بارے میں اسے ساری تفصیلا سے آگاہ کر سکوں' اس کے بعد مَیں عاصمہ کو بھی وہاں بلا لوں گا۔ گھر والوں کو کیا اعتراض

سکتا تھا۔ والد صاحب اور والدہ صاحبہ نے مجھے بخوشی اجازت دے دی۔ ہم کوئی اتنے دولت مند بھی نہیں تھے لیکن روپے پیسے کی کبھی کمی بھی نہیں ہوئی تھی۔ مَیں کالج سے فارغ ہونے کے بعد خود بھی اکبری منڈی میں والد صاحب کے ساتھ تھوڑا بہت کمیشن ایجنسی کا کام کر لیتا تھا۔ کچھ میرے پیسے بینک میں جمع تھے' کچھ پیسے مجھے والد صاحب نے دے دیئے۔ انہیں تو یہی معلوم تھا کہ مَیں دوبئ جا رہا ہوں' زیادہ پیسوں کی ضرورت ہو گی۔ اس زمانے میں لوگ سمندری جہازوں میں بصرہ' دوبئ وغیرہ جایا کرتے تھے۔

اپنے دوست خالد کو بھی میں نے یہی بتایا تھا کہ میں پارسی ڈاکٹر سے بہن کی علالت کی بات کرنے دوبئ جا رہا ہوں۔ سردیوں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ مَیں ایک دو بار کلکتے ضرور گیا تھا۔ دلی بھی دیکھا ہوا تھا مگر بمبئ کی طرف ابھی تک جانے کا اتفاق نہیں ہُوا تھا۔ مَیں نے اپنے ساتھ کوئی سامان وغیرہ نہیں لیا تھا۔ گھر والوں کو مَیں نے یہی بتایا تھا کہ دوبئ میں مَیں اپنے ایک دوست کے ہاں ٹھہروں گا۔ دو فالتو پتلونیں اور ایک گرم جیکٹ وغیرہ چھوٹے سے اٹیچی کیس میں رکھ لی تھی۔ مجھے اپنی جھوٹی کہانی کے مطابق کراچی سے بحری جہاز میں سوار ہونا تھا۔ والد صاحب مجھے گاڑی پر چڑھانے آنے لگے تو مَیں نے انہیں منع کر دیا کہ آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں' مَیں خود ہی چلا جاؤں گا۔ اس کی وجہ ظاہر تھی کہ مجھے کراچی والی گاڑی میں نہیں بلکہ بمبئ جانے والی گاڑی میں سوار ہونا تھا۔

اس گاڑی کے متعلق مَیں نے مکمل تفصیل ایک روز پہلے ہی سٹیشن پر جا کر معلوم کر لی تھی۔ یہ گاڑی فرنٹیئر میل تھی۔ یہ ٹرین پشاور سے بمبئ تک چلا کرتی تھی۔ اسی لئے اس کا نام فرنٹیئر میل تھا۔ یہ لاہور کے سٹیشن پر رات کے آٹھ بجے کے قریب پہنچتی تھی اور کچھ دیر رکنے کے بعد بمبئ کی طرف روانہ ہو جاتی تھی۔ مَیں اکیلا ہی تانگے میں بیٹھ کر سٹیشن پر آ گیا۔ یہاں بکنگ آفس سے میں نے لاہور سے کھنڈرہ تک کا انٹر کلاس کا ٹکٹ لے لیا۔ فرنٹیئر میل تھرڈ کلاس نہیں ہوتی تھی۔ فسٹ کلاس' سیکنڈ کلاس اور انٹر کلاس کے ڈبے ہوتے تھے' میں فرنٹیئر میل کے انٹر کلاس کے ایک ڈبے میں مسافروں میں

چھپ کر بیٹھ گیا۔ اس خیال سے کہ کوئی دیکھ نہ لے کہ میں کراچی جانے والی گاڑی کی بجائے بمبئی جانے والی گاڑی میں سوار ہوا تھا۔

بہرحال ٹرین چل پڑی۔ بڑا لمبا سفر تھا۔ دو راتوں کے سفر کے بعد ٹرین صبح کے وقت کھنڈوہ شہر کے ریلوے سٹیشن پر رکی تو میں اٹیچی کیس اٹھا کر پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ آج کل تو بھارت کے دوسرے شہروں کی طرح اس شہر کی آبادی میں بھی بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے۔ میں جس زمانے کی داستان سنا رہا ہوں یعنی ۴۶-۱۹۴۵ء میں اس شہر کی آبادی زیادہ نہیں تھی۔ مختصر سا صاف ستھرا شہر تھا۔ سستا زمانہ تھا۔ ابھی فائیو سٹار ہوٹلوں کا رواج نہیں پڑا تھا۔ میں نے ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں کمرہ لے لیا۔ نہا دھو کر ناشتہ کیا۔ اس علاقے میں پنجاب کے مقابلے میں سردی بہت ہی کم تھی اور خوشگوار موسم تھا۔ وہاں سے بمبئی کا شہر آدھے دن کی مسافت پر تھا۔ میں نے ہوٹل کے مینجر کے آگے اپنے آپ کو ہندو ظاہر کیا تھا اور پرکاش چند کے نام سے ہوٹل میں کمرہ لیا تھا۔ کیونکہ مجھے میشور مندر والے ٹیلے کا کھوج لگانا تھا۔ میں نے ہوٹل کے مینجر سے کہا:

"مہاراج! میں پہلی بار اس علاقے میں آیا ہوں۔ دریائے نربدا کے کنارے میشور نام کے مندر کی یاترا کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے معلوم کرنا ہے کہ میں اس مندر تک کیسے پہنچ سکتا ہوں؟"

ہوٹل کے مینجر نے بتایا کہ کھنڈوہ سے پچاس میل آگے دریائے نربدا کے کنارے منڈیل کر نام کا ایک قصبہ آباد ہے۔ وہاں سے دریا کے پار مدن سینا کا جنگل شروع ہو جاتا ہے۔ اس جنگل میں ایک پہاڑی ہے' جس کے اوپر میشور جی کا مندر ہے۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ منڈیل کر کے قصبے تک کوئی ریل گاڑی نہیں جاتی۔ لاریاں اس طرف چلتی ہیں۔ ایک رات میں نے کھنڈوہ کے ہوٹل میں بسر کی اور دوسرے روز صبح صبح لاری میں بیٹھ کر منڈیل کر کی طرف چل پڑا۔ چھوٹا سا قصبہ تھا۔ وہاں لاری سے اتر گیا۔ وہاں سے کشتی میں دریا پار کیا۔ دریا کی دوسری طرف گھنا جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ یہی وہ جنگل تھا'

جس میں میشور جی کا مندر تھا۔

وہ یاترا کا موسم نہیں تھا۔ پھر بھی مندر والے ٹیلے کی طرف یکے اور بیل گاڑیاں جاتی تھیں۔ میں بھی ایک یکے پر دوسری سواریوں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ بڑا سنسان اور گھنا جنگل تھا۔ دن کے وقت بھی درختوں کے نیچے اندھیرا سا چھایا ہوا تھا۔ دو گھنٹے تک جنگل میں سفر کرنے کے بعد وہ ٹیلہ یا پہاڑی آ گئی' جس کے اوپر میشور جی کا مندر تھا۔ مندر تک جانے کے لئے پہاڑی پر سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ مگر مجھے مندر نہیں جانا تھا۔ مجھے تو بکرم سادھو کے غار کو تلاش کرنا تھا۔ میں نے پہاڑی کے دامن میں غار کی تلاش شروع کر دی۔ اس قسم کے سادھو جو سادھی لگا کر گیان دھیان کرتے ہیں عام طور پر لوگوں سے چھپ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں کسی ایسی جگہ پر اپنا ٹھکانہ بناتے ہیں جہاں وہ آسانی سے نظر نہ آ سکیں لیکن میں نے غار کو تلاش کر لیا۔ غار کا دہانہ جنگلی جھاڑیوں میں چھپا ہوا تھا۔ میں جھاڑیوں کو ہٹا کر غار میں داخل ہو گیا۔ یہ قدرتی غار تھی۔ اس کی چھت اتنی اونچی تھی کہ آدمی چل سکتا تھا۔ غار میں اندھیرا تھا۔

میں غار کی دیوار کو پکڑ کر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ کچھ دور چلنے کے بعد فضا میں سیندور اور لوبان کی ہلکی ہلکی بُو آنے لگی۔ اس قسم کی بُو لاہور کے ایک مندر میں سے آیا کرتی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ بکرم سادھو غار میں موجود ہے۔ مزید آگے جا کر غار میں سامنے کی جانب سے ہلکی ہلکی روشنی آتی دکھائی دی۔ میں ذرا آگے گیا تو دیکھا کہ یہاں غار ایک طرف کو مڑ جاتا تھا۔ میں نے سر ذرا آگے کر کے دیکھا کہ غار کے درمیان ایک سفید بالوں والا بوڑھا ضعیف سادھو آلتی پالتی مارے بیٹھا ہے۔ اس کے آگے تین چار دیئے روشن ہیں۔ اس کے سر کے اوپر سفید بالوں کا جوڑا بندھا ہوا ہے۔ میں آہستہ آہستہ چل کر سادھو کے قریب ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ سادھو واقعی بہت ہی بوڑھا تھا۔ لمبی داڑھی سفید تھی' سر کے بال بھی برف کی طرح سفید تھے۔ آنکھ کے اوپر بھنوئیں بھی سفید ہو گئیں تھیں۔ جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا تھا۔ کمر سے لے کر کندھے تک گیروے رنگ کا

کپڑا لپیٹا ہوا تھا۔ سادھو کی آنکھیں بند تھیں، لیکن شاید اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ کچھ دیر تک خاموشی رہی، پھر سادھو نے کمزور سی آواز میں پوچھا:

"کون ہو؟ کس لئے آئے ہو؟"

میں نے کہا: "مہاراج! مجھے چھتری والی قبر کے مردے نے آپ کے پاس بھیجا ہے اور کہا ہے کہ سادھو بکرم بابا سے جا کر ملو۔"

یہ سن کر سادھو خاموش ہو گیا۔ ایک ڈیرھ منٹ تک خاموش رہا، پھر اس نے آنکھیں کھولے بغیر کہا:

"مَیں سمجھ گیا ہوں تم کس لئے آئے ہو مگر تمہاری بہن کا علاج میرے اختیار میں بھی نہیں ہے۔ تمہاری بہن پر جس آسیب کا سایہ ہے اس کا توڑ ماتا دیو داسی کے سوا اور کسی کے پاس نہیں ہے۔ تم ماتا دیو داسی کو جا کر ملو اور اس سے کہو کہ تمہیں بکرم رشی مہاراج نے بھیجا ہے۔"

مَیں نے پوچھا: "مہاراج! یہ ماتا دیو داسی مجھے کہاں ملے گی؟"

سادھو بکرم کہنے لگا:

"اسی جنگل میں، مدن سینا کے پچھمی کنارے پر ایک ندی بہتی ہے۔ ندی کے کنارے رام تیرتھ کا مندر ہے۔ ماتا دیو داسی اسی مندر میں رہتی ہے۔"

مَیں مزید کچھ پوچھنے لگا تو بوڑھا سادھو بولا:

"کچھ اور پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ماتا دیو داسی کے پاس ہی تمہارے دکھوں کا علاج ہے۔"

مَیں اٹھ کر واپس چل پڑا۔ مجھے اسی جنگل کے پچھم کی طرف جانا تھا۔ مَیں وہاں آ کر بیٹھ گیا، جہاں سے سیڑھیاں اوپر مندر کی طرف جاتی تھیں۔ وہاں سے ایک پجاری کا گزر ہوا۔ مَیں نے اس سے پوچھا کہ پچھم کی طرف جو رام تیرتھ کا مندر ہے اس کو کون سا راستہ جاتا ہے؟ پجاری نے مجھے راستہ بتا دیا۔ پھر کہنے لگا:

"یہ جنگل بڑا خطرناک ہے، اکیلے مت جانا۔ اکیلے جاؤ گے تو کسی شیر چیتے کا نوالہ بن جاؤ گے۔"

"پھر مَیں وہاں تک کیسے جاؤں مہاراج؟ مَیں یاتری ہوں اور رام تیرتھ مندر کی یاترا کرنے آیا ہوں۔"

پجاری بولا: "تم ایسا کرو، یہاں سے پیچھے ایک فرلانگ کے فاصلے پر جا کر بائیں طرف مڑ جانا۔ ذرا آگے جاؤ گے تو تمہیں جنگلی لوگوں کے جھونپڑے ملیں گے۔ یہ جنگلی لوگ پیسے لے کر تمہارے لئے کسی نہ کسی سواری کا بندوبست کر دیں گے۔ مزید پیسے دو گے تو تمہاری حفاظت کے لئے ایک برچھی والا آدمی بھی تمہارے ساتھ کر دیں گے۔"

مَیں نے پجاری کا شکریہ ادا کیا اور پیچھے کی طرف چلنے لگا۔ جو راستہ مجھے پجاری نے بتایا تھا اس پر چلتے ہوئے میں جنگلی لوگوں کے جھونپڑوں کے پاس پہنچ گیا۔ جنگلی لوگ مجھے دیکھ کر میرے گرد جمع ہو گئے۔ ان کے ہاتھوں میں نیزے تھے اور بدن پر سوائے ایک لنگوٹی کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ مَیں نے انہیں بڑی مشکل سے سمجھایا کہ مجھے رام تیرتھ مندر جانا ہے۔ کوئی سواری چاہیئے۔ وہ چپ کھڑے میرا منہ تکنے لگے۔ مَیں نے جیکٹ کی جیب سے دس دس روپے کے سات آٹھ نوٹ نکال کر انہیں دیئے تو وہ خوش ہو گئے۔ فوراً ایک آدمی جھونپڑیوں کے پیچھے گیا اور ایک بیل لے آیا۔ انہوں نے مجھے بیل پر بٹھا دیا۔ ایک نیزہ بردار جنگی پیدل ہی میرے ساتھ ہو گیا اور ہم رام تیرتھ مندر کی طرف روانہ ہو گئے۔

ساتھ ساتھ کھڑے درختوں کے گنجان جنگل میں ہم ایک گھنٹے تک سفر کرتے رہے۔ آخر ہم اس ندی پر پہنچ گئے جس کے اونچے چبوترے پر ایک قدیم مندر کی چھوٹی سی عمارت نظر آئی۔ مندر کے چبوترے پر کچھ پجاری آلتی پالتی مارے بیٹھے ہوئے تھے۔ دو عورتیں اور ایک مرد ندی میں نہا رہے تھے۔ عورتوں نے باریک ساڑھیاں لپیٹی ہوئی تھیں، جس میں سے ان کے جسم زیادہ نمایاں ہو کر نظر آ رہے تھے۔ ہندوؤں میں جسم کی

حیاداری کا اتنا خیال نہیں کیا جاتا۔ اس کی وجہ ہندو عورتوں کا ایک احمقانہ عقیدہ ہے کہ کسی مندر کے تالاب یا گھاٹ پر نہاتے ہوئے ان کے جسم پر جتنے مردوں کی نظر پڑے گی' اتنے ہی ان عورتوں کے پاپ (گناہ) جھڑ جائیں گے۔

ایک پجاری سے میں نے ماتا دیوی کے بارے میں پوچھا تو اس نے اوپر مندر کی طرف اشارہ کر کے کہا:

"ماتا دیوی! مندر کے پیچھے اپنے استھان پر ملیں گی۔"

مَیں مندر کے چبوترے کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گیا۔ مندر چھوٹا سا تھا۔ اس کے پیچھے ایک گھاس پھونس کی جھونپڑی تھی' جس کے باہر چٹائی پر ایک بوڑھی عورت بیٹھی مالا جاپ کر رہی تھی۔ مَیں نے قریب جا کر اسے ہندوؤں کی طرح ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا او خاموشی سے ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ عورت نے تھوڑی دیر بعد آنکھ اٹھا کر میری طرف دیکھا اور پوچھا:

"کہو بالک! کیا بات ہے؟"

مَیں نے بڑے ادب سے کہا:

"ماتا دیوی! مجھے بکرم رشی مہاراج نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔"

ماتا دیوی نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے چہرے کے تاثرات ایسے تھے' جیسے کچھ د رہی ہو۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ کہنے لگی:

تمہاری بہن کے روگ کا علاج نرتکی کامنی کے پاس ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم بڑ کشٹ اٹھا کر یہاں تک پہنچے ہو۔ اس لئے مَیں تمہاری ضرور مدد کروں گی۔"

مَیں نے کہا: "آپ کی بڑی کرپا ہو گی۔ نرتکی کامنی مجھے کہاں ملے گی؟"

ماتا دیوی نے مالا والا ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا:

"وہ آکاش کے گندھروں کی نرتکی ہے۔ اسے ہوس کے لوبھی ایک عیاش سادھو جادو کے زور سے کانچ کا منکا بنا کر ڈبیا میں بند کر رکھا ہے۔ جہاں رات پڑتی ہے، سادھو

میں سے کانچ کا منکا نکال کر اس پر منتر پھونکتا ہے۔ کانچ کا منکا کامنی نرتکی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ عیاش سادھو کامنی سے پیار محبت کرنے کے بعد اسے دوبارہ کانچ کا منکا بنا کر ڈبی میں بند کر کے اپنے پاس رکھ لیتا ہے اور پھر سو جاتا ہے۔"

مَیں حیران سا ہو کر ماتا دیوی کی کتھا سن رہا تھا۔ مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے مَیں الف لیلیٰ کی دنیا میں پہنچ گیا ہوں۔ سوچنے لگا کہ خدا جانے آگے میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ لیکن مَیں اپنی بہن کی خاطر جس راہ پر چل نکلا تھا' اب اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے بغیر واپس نہیں مڑ سکتا تھا۔ مَیں نے ماتا دیوی سے پوچھا:

"دیوی جی! اگر کامنی نرتکی سادھو کے جادو ٹونے میں قید ہے تو مَیں اس کے ساتھ کیسے ملاقات کر سکتا ہوں؟"

ماتا دیوی نے کہا: "وہ سادھو بڑی زبردست طاقت والا ہے۔ جب وہ کامنی نرتکی سے پیار محبت کر رہا ہوتا ہے تو اگر اس وقت کوئی اس کے سامنے چلا جائے تو وہ جل کر بھسم ہو جائے گا۔ سادھو نے اپنے گرد ایک دائرہ کھینچا ہوا ہوتا ہے۔ اس دائرے کے نہ کوئی اندر جا کر زندہ رہ سکتا ہے نہ باہر نکل کر زندہ رہ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کامنی نرتکی کوشش کے باوجود سادھو کی قید سے آج تک نہیں نکل سکی۔"

"پھر مجھے کیا کرنا ہو گا؟" مَیں نے پوچھا۔

ماتا دیوی بولی:

"مَیں رشی بکرم جی کی پجارن ہوں اور تم اپنی بہن کی ہمدردی میں جس طرح مصیبتیں جھیل کر یہاں تک آئے ہو مَیں اس کی بھی بڑی قدر کرتی ہوں۔"

ماتا دیوی یہ کہہ کر جھونپڑی کے اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد باہر آئی تو اس کے ہاتھ ں ٹین کی ایک چھوٹی سی ڈبیا تھی۔ اس نے ڈبیا میں سے ایک پڑیا نکال کر مجھے دی اور کہا:

"اس پڑیا میں ایک جادوئی راکھ ہے۔ عیاش سادھو آج سورج غروب ہونے سے ذرا

پہلے منڈیل کر گاؤں کے نربدا گھاٹ والے جنگل میں سے گزرے گا۔ گھاٹ کے قریب گھنے جنگل میں برگد کا بہت گھنا درخت ہے۔ وہ اس درخت کے نیچے پڑاؤ ڈالے گا اور کامنی نرتکی کو ڈبیا میں سے نکال کر اس سے پیار محبت کرے گا۔ تم چھپ کر انہیں دیکھتے رہنا۔ پیار محبت کرنے کے بعد جب سادھو کامنی نرتکی کو دوبارہ ڈبیا میں بند کر کے سو جائے تو آگے بڑھ کر اس پڑیا کی راکھ سادھو کے جسم پر چھڑک دینا۔ یہ رشیوں منیوں کے شمشان گھاٹ کی راکھ ہے۔ اس راکھ کے اثر سے عیاش سادھو رات بھر کے لئے بے ہوش ہو جائے گا۔"

مَیں نے پوچھا:

"لیکن دیوی جی! آپ نے تو کہا تھا کہ سادھو اپنے اِرد گرد جادو کا دائرہ کھینچ لیتا ہے۔ جو کوئی اس دائرے کے اندر جائے گا' بھسم ہو جائے گا۔ پھر مَیں کیسے زندہ بچوں گا؟"

ماتا دیوی نے کہا۔ "مورکھ! تمہارے پاس رشی منی لوگوں کے شمشان گھاٹ کی راکھ ہو گی۔ تم پر سادھو کا جادو بے اثر ہو جائے گا۔ آگے غور سے سنو! سادھو کے بدن پر راکھ چھڑکنے کے بعد اس نے ڈبیا جہاں بھی چھپائی ہو گی' نکال کر اسے کھولنا اور باقی کی راکھ اس ڈبیا میں بند کانچ کے منکے پر چھڑک دینا۔ کامنی نرتکی فوراً اپنے عورت کے روپ میں واپس آ جائے گی۔ اسے بتانا کہ تمہیں ماتا دیوی نے بھیجا ہے اور اسے اپنی بہن کا روگ بتانا' صرف وہی تمہیں بتا سکے گی کہ تمہاری بہن کا روگ ہمیشہ کے لئے کیسے ختم کیا جا سکتا ہے۔ مَیں نے جادوئی راکھ کی پڑیا لے کر اپنے پاس سنبھال کر رکھ لی۔ ماتا دیوی کا شکریہ ادا کیا اور نربدا گھاٹ کی طرف چل پڑا۔ مجھے اس وقت اپنے اوپر جن بھوتوں والی کہانیوں کے کسی کردار کا شبہ ہو رہا تھا۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ میں نادانستہ طور پر کس دلدل میں دھنستا چلا جا رہا ہوں۔

کسی نہ کسی طرح میں شام ہونے سے پہلے نربدا گھاٹ پر پہنچ گیا۔ وہاں سے مدن سینا کا گھنا جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ مَیں جنگل میں داخل ہو گیا۔ میں نے ایک جگہ بَرگد کا بہت بڑا

درخت دیکھا۔ اس کی شاخیں زمین کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ یہی وہ درخت تھا' جس کے متعلق ماتا دیوی نے کہا تھا کہ عیاش سادھو وہاں پڑاؤ کرے گا۔ وہاں بَرگد کا دوسرا کوئی درخت نہیں تھا۔ میں تھوڑے فاصلے پر ایک اور درخت کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ وہاں سے مجھے بَرگد کا درخت واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ مَیں عیاش سادھو کا انتظار کرنے لگا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ گھنے درختوں کی وجہ سے جنگل میں وقت سے پہلے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ اتنے میں مجھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ درختوں کے درمیان ایک جٹا دھاری سادھو چلا آ رہا تھا۔ اس کے کندھے پر ایک گٹھڑی لٹک رہی تھی۔ ہاتھ میں ترشول تھا۔ اس نے بالوں کا سر کے اوپر جوڑا بنا رکھا تھا۔ سادھو چلتے چلتے برگد کے درخت کے نیچے آ کر رک گیا۔ اس نے چاروں طرف ایک نظر ڈالی اور پھر ترشول سے زمین پر دائرے کا نشان بنایا اور دائرے کے درمیان میں بیٹھ گیا۔ بیٹھنے کے بعد اس نے اپنے بالوں کے جوڑے میں ہاتھ ڈال کر کوئی شے نکالی۔ میں سمجھ گیا کہ اس نے وہی ڈبیا نکالی ہے' جس میں کامنی نرتکی قید ہے۔

سادھو نے ڈبیا کھول کر اس میں سے کانچ کا منکا نکالا اور اسے اپنے سامنے رکھ کر منتر پڑھنے لگا۔ منتر پڑھنے کے بعد اس نے منکے پر پھونک ماری۔ دوسرے لمحے وہاں کانچ کے منکے کی جگہ ایک حسین و جمیل عورت بیٹھی تھی۔ یہی کامنی نرتکی تھی' جسے سادھو نے اپنے جادوئی منتر کی طاقت سے اپنے قبضے میں کیا ہُوا تھا۔ سادھو عورت سے پیار محبت کرنے لگا۔ میں درخت کی اوٹ میں چھپا یہ سارا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ کافی دیر تک سادھو عورت سے پیار محبت کرتا رہا۔ مَیں نے دیکھا کہ اس دوران عورت نے سادھو کی کسی حرکت کے خلاف مدافعت نہ کی۔ وہ سادھو کے ہر حکم کی تعمیل کرتی رہی۔ جب سادھو کا دل بھر گیا تو اس نے منتر پڑھ کر عورت پر پھونک ماری۔ عورت غائب ہو گئی۔ اس کی جگہ کانچ کا منکا ہی رہ گیا تھا۔ سادھو نے منکا اٹھا کر ڈبیا میں بند کیا اور ڈبیا اپنے سر کے بالوں کے جوڑے میں چھپا دی اور وہیں لیٹ گیا۔ جب مجھے سادھو کے خراٹوں کی آواز آئی تو مَیں

درخت کی آڑ سے نکل کر سادھو کی طرف بڑھا۔ سادھو نے وہاں بیٹھنے سے پہلے اپنے
اِردگرد ایک طلسمی دائرہ بنا دیا تھا۔ میں دائرے کی لکیر کے پاس جا کر رُک گیا۔ اگرچہ ماتا
دیوی نے کہا تھا کہ تم بے دھڑک طلسمی دائرے میں داخل ہو جانا۔ تمہارے پاس رش
منی لوگوں کی راکھ ہے۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ لیکن قدرتی طور پر مجھے تھوڑا سا خطرہ
محسوس ہُوا۔

لیکن مَیں نے ہمت سے کام لیا اور دائرے کے اندر داخل ہو گیا۔ واقعی مجھے کچھ نہیں
ہُوا تھا۔ مَیں نے جیب سے ماتا دیوی کی دی ہوئی راکھ کی پڑیا نکال کر کھولی اور راکھ سوئے
ہوئے سادھو کے جسم پر چھڑک دی۔ جیسے ہی مَیں نے راکھ چھڑکی۔ سادھو کے جسم نے
اس طرح حرکت کی جیسے اسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ اس کے بعد اس کا جسم بالکل ساکت ہو
گیا۔ مَیں نے سادھو کے بالوں کے جوڑے میں ہاتھ ڈالا۔ سادھو اسی طرح بے حس
حرکت پڑا رہا۔ مَیں نے ٹٹول کر جوڑے میں سے ڈبیا نکال لی۔ ڈبیا لے کر میں طلسمی
دائرے کے حصار سے باہر آ گیا۔ ماتا دیوی کی ہدایت کے مطابق مَیں زمین پر بیٹھ گیا۔ ڈبیا
کھول کر دیکھا۔ اس میں کانچ کا منکا رکھا ہُوا تھا۔ مَیں نے منکا نکال کر اپنے سامنے زمین
رکھ دیا اور پڑیا میں سے راکھ کی ایک چٹکی بھر کر منکے پر چھڑک دی۔

منکا غائب ہو گیا اور اس کی جگہ وہی حسین و جمیل عورت ظاہر ہو گئی‘ جس کے سا
تھوڑی دیر پہلے سادھو پیار و محبت کر رہا تھا۔ اگرچہ درختوں میں شام کا اندھیرا گہرا ہو گیا
لیکن اس اندھیرے میں بھی مجھے اس عورت کا حسن و جمال صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ا
نے گیروے رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ بالوں میں گل مہر کا سرخ پھول سج رہا تھا۔
واقعی بے حد خوبصورت عورت تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک مقناطیسی کشش تھ
اس نے میری طرف گھوڑ کر دیکھا اور بولی:

”تم کون ہو جس نے مجھے اس عیاش راکھشش سے نجات دلائی ہے؟“

مَیں نے کہا۔ ”مجھے ماتا دیوی نے تمہارے پاس بھیجا ہے۔“

پھر میں نے اسے ساری کہانی بیان کر دی کہ مَیں ماتا دیوی کے مندر میں کیوں گیا تھا اور
اس کے پاس کس غرض کے لئے آیا ہوں۔ وہ میرے سامنے بیٹھی بڑے غور سے سنتی
رہی۔ جب میں نے اپنی داستان غم ختم کی تو اس نے کہا:

”تم نے مجھے ایک چنڈال کی قید سے چھڑا کر مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ مَیں تمہاری
ضرور مدد کروں گی۔ لیکن پہلے مجھے اس چنڈال سادھو کو ختم کرنا ہو گا تا کہ یہ مجھ پر پھر کبھی
اپنے طلسمی منتر کا وار نہ کر سکے۔“

وہ اٹھ کر بے ہوش سادھو کے ترشول کے پاس گئی۔ سادھو نے ترشول زمین پر گاڑا
ہوا تھا۔ ترشول انڈیا کے سادھو جوگی لوگ اکثر اپنے پاس رکھتے ہیں۔ ترشول کا لفظ اصل
میں تری اور سول سے مل کر بنا ہے۔ تری سنسکرت کی زبان میں تین کو کہتے ہیں۔ پنجابی
میں بھی تین کے عدد کو تری بولا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پنجابی زبان پر سنسکرت کا
گہرا اثر ہے۔ سول کانٹے کو کہتے ہیں۔ ترشول ایک لمبی مضبوط سلاخ ہوتی ہے‘ جس کے
اوپر تین چھریاں بنی ہوتی ہیں، سادھو لوگ جنگل کے درندوں اور جنگلی جانوروں سے اپنا
دفاع کرتے ہیں۔

اس عورت یعنی کامنی نے زمین میں گڑا ہوا ترشول نکالا اور پوری طاقت سے اسے
سادھو کے پیٹ میں دھنسا دیا۔ سادھو کا جسم پہلے کی طرح ایک بار اچھلا اور بے حس و
حرکت ہو گیا۔ اس کے جسم سے خون ضرور نکلا ہو گا مگر اندھیرے میں خون مجھے نظر نہیں
آیا تھا۔ ترشول ایک نیزے کی طرح آدھے سے زیادہ سادھو کے پیٹ میں دھنسا ہُوا تھا۔

کامنی نرتکی سادھو کا کام تمام کر کے میرے پاس آئی تو اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی
تھیں۔ مجھے چھتری والی قبر کی بھیانک رات یاد آ گئی‘ جب قبر کے اندر دو لال انگارہ
آنکھیں نمودار ہوئی تھیں۔ مَیں جھوٹ نہیں بولوں گا، اس وقت مجھے اس حسین عورت
سے خوف محسوس ہُوا تھا۔ اس نے ایک بے رحم سفاک قاتل ہونے کا ثبوت دیا تھا۔
اگرچہ بدمعاش سادھو کے غلیظ کردار کا یہی تقاضا تھا کہ اسے ختم کر دیا جائے لیکن جس

بے دردی سے اور پیشہ وارانہ مہارت سے کامنی نے اس کے پیٹ میں ترشول ٹھونسا تھا' وہ کوئی عادی قاتل ہی کر سکتا تھا۔

کامنی نرتکی نے مجھے اپنی لال لال آنکھوں سے گھورتے ہوئے کہا۔ "تمہیں مجھ سے ڈر تو نہیں لگ رہا؟"

مجھے ڈر لگ رہا تھا لیکن میں آخر ایک مرد تھا اور اپنی کمزوری ایک عورت پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مَیں نے کہا: "بالکل ڈر نہیں لگ رہا۔"

وہ بولی۔ "تمہیں مجھ سے ڈرنا بھی نہیں چاہیے۔ تم نے مجھے اس چنڈال کے طلسم سے آزاد کر کے مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ میں اب ساری زندگی تمہاری غلام رہوں گی۔"

مَیں ایک بار پھر ڈر گیا۔ کیونکہ مَیں ایسی مردمار جادوگرنی قسم کی ہوائی مخلوق کو اپنا غلام یا کنیز بنا کر اپنے ساتھ کیسے رکھ سکتا تھا۔ مَیں جتنی جلدی ہو سکے اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا اور اپنی روگی بہن کا علاج پوچھنا چاہتا تھا۔ جب میں نے اس سے اپنی بہن کی بیماری کی بات کی تو کامنی نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ کامنی کا ہاتھ کسی مردے کے ہاتھ کی طرح برف کی مانند ٹھنڈا تھا۔ مجھے کپکپی سی آ گئی۔ اس نے میرا ہاتھ اپنی مضبوط گرفت میں اس طرح لے رکھا تھا کہ مَیں نے ایک بار ہاتھ چھڑانے کی کوشش بھی کی' لیکن میرا ہاتھ اس کی گرفت سے آزاد نہ ہُوا۔ کہنے لگی:

"تمہاری بہن پر پاتالی چڑیل کا سایہ ہے۔ پاتالی چڑیل دھوئیں سے بنی ہے۔ اس کے سیاہ فام مکروہ جسم سے ہر وقت دھواں اٹھتا رہتا ہے۔ پاتالی جب تمہاری بہن سے چمٹتی ہے تو اس کا خون بھی پیتی رہتی ہے۔ تمہاری بہن خوبصورت ہے اور اس کا خون میٹھا ہے۔ پاتالی خوبصورت مسلمان لڑکیوں کے میٹھے خون کی دیوانی ہے۔"

مَیں نے کامنی سے کہا:

"میری بہن کا اس منحوس چڑیل سے پیچھا چھڑا دو۔ ہم بھی حیران تھے کہ جب عاصمہ پر

وہ پڑتا ہے تو اس کا رنگ مٹی کی طرح کیوں ہو جاتا ہے۔"

کامنی نے کہا۔ "پاتالی چڑیل کے پاس پاتال کے تمام سانپوں' بچھوؤں' بھوتوں اور عفریتوں کی طاقت ہے۔ وہ پاتال لوک کے سب سے خطرناک جادوگر منگل کی شاگرد رہی ہے۔ اس کے پاس چڑیل ہونے کے علاوہ ایسے ایسے جادوئی منتر ہیں کہ بڑے سے بڑے جادوگر اس کا نام سن کر کانپ اٹھتے ہیں۔"

میں نے اس سے پوچھا:

"اس کا مطلب ہے کہ تم بھی اس کے نام سے ڈرتی ہو؟"

کامنی بولی۔ "مَیں ڈرتی نہیں ہوں۔ میرے پاس اس چڑیل کے آسیب کا کوئی توڑ نہیں ہے۔ وہ مجھ سے بہت زیادہ طاقتور ہے۔ لیکن مَیں تمہاری بہن کو اس منحوس چڑیل کے سائے سے ضرور نجات دلاؤں گی۔ لیکن اس کام میں تمہیں بھی میری مدد کرنی ہوگی۔"

"مَیں عاصمہ بہن کی خاطر اپنی جان بھی قربان کر سکتا ہوں۔"

کامنی نرتکی کہنے لگی:

"تمہیں جان دینے کے لئے تیار رہنا ہوگا۔ کیونکہ اس کام میں تمہاری جان بھی جا سکتی ہے۔"

سچی بات ہے میں اندر سے کچھ ڈر سا گیا۔ مَیں نے پوچھا:

"ایسا کون سا کام ہے یہ؟"

کامنی نے کہا۔ "مَیں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی۔ ابھی یہاں سے چلو۔"

"سادھو کی لاش کا کیا بنے گا؟" مَیں نے پوچھا۔

کامنی بولی۔ "اسے جنگلی جانور رات کو چٹ کر جائیں گے۔ میرے ساتھ آؤ۔"

ہم جنگل سے نکل کر دریائے نربدا کے قصبے والے گھاٹ پر آ گئے۔ رات کا اندھیرا چاروں طرف چھا گیا تھا۔ یہ دریا کے جنگل والا کنارا تھا اور جنگل بھی وہ کہ جہاں دن کے وقت لوگ جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ رات کے وقت تو اس طرح کسی انسان کے آنے کا

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دریا کا گھاٹ بھی تاریکی میں ویران پڑا تھا۔ وہاں نہ کشتی تھ
نہ کوئی ملاح تھا۔ نربدا کافی بڑا دریا تھا اور پانی بھی بڑا تیز بہتا تھا۔ میں نے کامنی سے پوچھا

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

وہ بولی۔ "پہلے تو ہم دریا پار منڈیل کر گاؤں میں جائیں گے۔ اس کے بعد تمہیں بتاؤ
گی کہ ہمیں کہاں جانا ہے؟"

میں نے کہا۔ "ہم دریا کیسے پار کریں گے۔ یہاں تو نہ کوئی کشتی ہے' نہ ملاح ہے؟"

کامنی نے میرے کندھے پر اپنا ٹھنڈا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

"اس چنڈال سادھو کی قید سے آزاد ہونے کے بعد میری ساری اندر لوک کی طاق
مجھے واپس مل گئی ہیں۔ مورکھ انسان! تم کو معلوم ہی نہیں کہ تم نے مجھ پر کتنا بڑا اح
چڑھا دیا ہے۔ ہمیں کسی کشتی' کسی ملاح کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہیں اپنے ساتھ
پار کراؤں گی۔"

مجھ پر ابھی تک یہ بات واضح نہیں ہو سکی تھی کہ یہ عورت زمین کی مخلوق ہے' ز
کے اندر کی مخلوق ہے یا دوزخ کی مخلوق ہے۔ یہ عورت میرے لئے ایک معمہ بن
تھی اور مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ غائب ہونے کے بعد ڈبیا میں بند تھ
میں نے اس پر ماتا دیوی کی راکھ چھڑک کر اسے پھر سے انسانی شکل میں لے آیا ہوں
دریا کے کنارے کنارے چلتے ایک ایسی جگہ آ گئے جہاں پتھر کی سیڑھیاں دریا میں ا
تھیں۔ کامنی آخری سیڑھی کے پتھر پر ہو گئی۔ سیڑھی کے پتھروں کے ساتھ لہریں ٹکرا
تھیں۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ کھڑا کر لیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ میرے ساتھ تیر کر
پار کر لے گی لیکن ایسی بات نہیں تھی۔

دریائے نربدا پر رات کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔

دور دریا کے دوسرے کنارے پر قصبہ منڈیل کر کی اکا دکا بتیاں جھلملا رہی تھیں۔

کامنی نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ لیا اور کہا:

"گھبراؤ گے تو نہیں؟"

میں نے کہا۔ "مجھے تیرنا بہت کم آتا ہے۔"

میں یہی سمجھ رہا تھا کہ اس کا ارادہ تیر کر دریا کے پار جانے کا ہے۔ کہنے لگی:

"فکر نہ کرو۔ ہم دریا میں نہیں اتریں گے۔ بس تم اپنے دل کو مضبوط رکھنا اور میرا
ہاتھ نہ چھوڑنا۔"

اس کے بعد وہ خاموش ہو گئی۔ پھر مجھے ایسی آواز آنے لگی' جیسے وہ کچھ پڑھ رہی
ہے۔ شاید وہ کوئی طلسمی منتر پڑھ رہی تھی۔ منتر پڑھ کر وہ اوپر کو اچھلی۔ میں بھی اس کے
ساتھ اپنے آپ اوپر کو تھوڑا سا اچھل گیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کا مجھے یقین نہیں آ
رہا تھا۔ ہم دونوں دریا کی سطح سے کوئی پانچ چھ فٹ کی بلندی پر ہوا میں اڑتے ہوئے دریا
کے دوسرے کنارے کی طرف جا رہے تھے۔ میں ڈر گیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے کسی بھی وقت
میں دریا میں گر پڑوں گا۔ میں نے خوف کے مارے آنکھیں بند کر لیں۔ کامنی نے کہا:

"آنکھیں بند نہ کرو۔ جب تک تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہے' تم دریا میں نہیں گرو

گے۔"

مَیں نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھول دیں۔ مَیں نے نیچے دیکھا۔ میرے پاؤں کے نیچے پانچ چھ فٹ کے فاصلے پر اندھیرے میں دریا کی خوفناک موجیں بہہ رہی تھیں۔ مجھے دریا کی موجوں کا شور صاف سنائی دے رہا تھا۔ مَیں نے زندگی میں آج تک کبھی اس حالت میں کوئی دریا پار نہیں کیا تھا۔ ہم کوئی دس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دریا کے اوپر اڑ رہے تھے۔ خوف اور دہشت کی وجہ سے مَیں نے آنکھیں ایک بار پھر بند کرلیں۔ مَیں بالکل ہلکا ہو گیا تھا۔ اپنے جسم کا معمولی سا بوجھ بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے میں روئی کا بنا ہُوا ہوں۔ میرا خیال تھا ہم دریا پار کر کے زمین پر اتر جائیں گے مگر کامنی دریا پار کرنے کے بعد مجھے ساتھ لے کر زمین سے اور بلند ہو گئی۔ رات کے اندھیرے میں درخت ہمارے نیچے سے گزر رہے تھے۔ ہم درختوں سے کافی بلندی پر تھے۔ مَیں نے کامنی سے پوچھ ہی لیا کہ ہم کہیں اتریں گے کہ نہیں؟ اس نے ذرا سخت لہجے میں کہا:

"تم بہت سوال کرتے ہو۔ خاموش رہو۔"

مَیں خاموش ہو گیا۔ ہم منڈیل کر قصبے کے بھی اوپر سے گزر گئے۔ مَیں سوچ رہا تھا کہ اس اندھیرے میں بالفرض محال ہمیں کسی نے ہوا میں پرواز کرتے دیکھ لیا تو وہ تو کس قد حیران ہوگا۔ اس وقت ہم ستر اَسی فٹ کی بلندی پر اڑ رہے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق اتنی ہی بلندی تھی۔ میرے دل کی دھڑکن خوف کے مارے تیز ہو گئی تھی۔ مجھے یہی دھڑکا لگا تھا کہ کسی بھی وقت مَیں زمین پر گر سکتا ہوں اور اب ہمارے نیچے دریا بھی نہیں تھا۔ سخت زمین تھی۔ اس پر گرنے سے میرا جو حشر ہو سکتا تھا' اس کا اندازہ آپ بھی لگا سکتے ہیں۔ مَیں نے نیچے نگاہ ڈالی۔ درخت تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ہم قصبہ منڈیل کر سے کافی دور نکل آئے تھے۔ مَیں نے آنکھیں بند کر لیں اور دل میں خدا سے دعائیں مانگنے لگا کہ یا اللہ پاک مَیں نے کوئی گناہ کیا ہے تو مجھے معاف کر دے۔ مَیں نے محسوس ک

میں نیچے آ گیا ہوں۔ مَیں نے آنکھیں کھول دیں۔ اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اتنا واضح طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ ہم نیچے اتر رہے ہیں۔

ستر اَسی فٹ کی بلندی سے اتر کر ہم زمین کی سطح کے قریب آ گئے تھے۔ ایک دفعہ میرے پاؤں جھاڑیوں سے بھی ٹکرائے۔ مَیں نے اندھیرے میں بڑے غور سے دیکھا۔ میری بائیں جانب کسی عمارت کی اونچی دیوار کھڑی تھی۔ کامنی دیوار کے پاس آ کر اوپر کو اُٹھی۔ مَیں بھی اس کے ساتھ ہی اوپر کو اٹھ گیا۔ اب ہم دیوار کی دوسری طرف تھے۔ ہم عمارت کی چھت پر اتر گئے۔ چھت پر جیسے ہی میرے پاؤں لگے' میرے جسم کا بوجھ مجھے دوبارہ محسوس ہونا شروع ہو گیا۔ کامنی نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ کہنے لگی۔ "یہ میرا گھر ہے۔ میرا آشرم ہے۔ مَیں یہیں رہتی ہوں۔ بدمعاش سادھو مجھے اسی جگہ سے اغوا کر کے لے گیا تھا۔"

یہ عمارت کسی پرانی عمارت کا کھنڈر لگتی تھی۔ چھت پر کہیں کہیں گھاس اُگی ہوئی تھی۔ اللہ ہی بہتر جانتا تھا کہ یہ پُراسرار عورت مجھے یہاں کس غرض کے لئے لے آئی تھی۔ کھنڈر کی چھت پر سے ایک اندھیرا زینہ نیچے جاتا تھا۔ ہم زینے سے اتر کر نیچے کھنڈر کے احاطے میں آ گئے۔ یہ جگہ بھوتوں اور بدروحوں کا مسکن لگ رہی تھی۔ مجھے اس عورت کامنی سے صرف ایک ہی لالچ یا غرض تھی کہ یہ مجھے میری بہن کی بیماری کا علاج بتائے اور میری اس سے جان چھوٹے۔ لیکن یہ سارا پُراسرار سلسلہ لمبا ہوتا جا رہا تھا۔ رات کی تاریکی اس ڈراؤنے کھنڈر میں آ کر اور زیادہ بھیانک محسوس ہو رہی تھی۔ احاطے میں جگہ جگہ ملبے کے چھوٹے ڈھیر پڑے تھے۔ اینٹیں پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ اندھیرے میں جھاڑیاں ایسے لگ رہی تھیں' جیسے بدروحیں کالے کمبل اوڑھ کر خاموش بیٹھی ہوئی ہوں۔ احاطے کے کونے میں ایک کوٹھڑی تھی۔ کوٹھڑی کا دروازہ بند تھا اور اس پر تالا پڑا ہوا تھا۔ کامنی دروازے کے پاس آ کر رک گئی۔ کہنے لگی:

"جیسے مَیں کہوں ویسے ہی کرنا۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی:

"آنکھیں بند کر لو۔ جب تک مَیں نہ کہوں، آنکھیں مت کھولنا۔"

مَیں اس کے ہر حکم کی تعمیل کرنے پر مجبور تھا۔ مَیں نے آنکھیں بند کر دیں۔ اس نے کہا:

"چل پڑو۔"

مَیں چل پڑا۔ مجھے یقین تھا کہ دوسرا قدم اٹھانے کے بعد مَیں کوٹھڑی کے بند دروازے سے ٹکرا جاؤں گا۔ دروازے کے ساتھ ٹکرانے سے بچنے کے لئے مَیں نے اپنا خالی ہاتھ اپنے منہ کے آگے کر لیا۔ لیکن مَیں دروازے سے بالکل نہ ٹکرایا۔ میری آنکھیں بند تھیں۔ ہم تھوڑا چل کر کسی جگہ پہنچ گئے تھے۔ کامنی نے کہا:

"اب آنکھیں کھول دو۔"

مَیں نے آنکھیں کھول دیں۔ کیا دیکھتا ہوں کہ مَیں ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں ہوں۔ دِیا جل رہا ہے۔ دِیئے کی روشنی میں مجھے دیواروں پر عجیب ڈراؤنی شکلوں والی مورتیاں بنی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ کوٹھڑی کے درمیان سیاہ پتھر کا زمین سے ایک فٹ اونچا شیولنگ باہر نکلا ہوا تھا' جس پر سیندور ملا ہُوا تھا۔ کامنی نے شیولنگ کے آگے ماتھا ٹیکا اور ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی۔ اس نے مجھے بھی اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی مائل پُراسرار چمک بھی آ گئی تھی۔ کہنے لگی:

"میں جانتی ہوں تم ہندو نہیں ہو' مسلمان ہو۔ مسلمان ہماری مورتی پوجا کے سخت خلاف ہیں۔ اگر تم کسی اور حالات میں مجھے ملتے تو ہو سکتا تھا کہ تمہیں منتر پھونک کر پتھر کا بت بنا دیتی' لیکن تم نے مجھے بدمعاش سادھو کے طلسم سے نجات دِلا کر مجھ پر بہت احسان کر دیا ہے' اب مَیں تمہاری دشمن نہیں ہوں۔"

مَیں اس عورت کی باتوں سے سخت بیزار ہو چکا تھا۔ مَیں نے کہا:

"دیوی جی! ان باتوں کا اب ذکر نہ کریں۔ مجھے صرف اتنا بتا دیں کہ آپ میری بہن پُراسرار بیماری کو کیسے دور کریں گی۔ مجھے آپ سے اور کچھ نہیں چاہیے۔"

کامنی نرتکی بولی:

"مَیں تمہیں پہلے بتا چکی ہوں کہ تمہاری بہن کی بیماری کو ختم کر دوں گی اور وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی' لیکن اس سلسلے میں تمہیں بھی میری مدد کرنی ہوگی۔"

مَیں نے کہا۔ "مجھے بتاؤ! مَیں تمہاری ہر طرح سے مدد کرنے کو تیار ہوں۔"

کامنی کہنے لگی:

"مَیں تمہیں ایک منتر بتاتی ہوں۔ اس منتر کو پوری طرح سے زبانی یاد کر لو۔ یہ بہت ضروری ہے۔ اگر تم منتر کا ایک حرف بھی بھول گئے تو تمہاری بہن پر کوئی آفت نازل ہو سکتی ہے۔"

مَیں نے پوچھا۔ "یہ کس زبان کا منتر ہے اور کتنا لمبا ہے؟"

کامنی نے کہا۔ "یہ دو سطروں کا منتر ہے۔ یہ اندر لوک کے گندھروں کی زبان ہے' جسے اس دنیا میں سوائے میرے اور کوئی نہیں سمجھ اور بول سکتا۔ کیونکہ مَیں آکاش کے ایک گندھرو دیوتا کی من پسند نرتکی (رقاصہ) رہ چکی ہوں۔ مَیں منتر بولتی ہوں، تم غور سے سنو۔"

اس کے بعد کامنی نے منتر کی دو سطریں بولیں۔ اس نے ایک ایک لفظ الگ الگ کر کے آہستہ آہستہ بولا تھا۔ مجھے وہ کوئی جناتی زبان لگی' پہلی دفعہ میرے کچھ پلے نہ پڑا اور مَیں اس کا ایک لفظ بھی یاد نہ کر سکا۔ کامنی کو اس ردِعمل کا اندازہ تھا۔ اس نے چھ سات مرتبہ منتر دہرایا اور بولی:

"اب تم یہ منتر جیسا تمہیں یاد رہا ہے بولو۔" مَیں نے رُک رُک کر منتر کے الفاظ ادا کرنے کی کوشش کی' لیکن کئی لفظ مَیں بھول گیا تھا اور کامنی اس وقت تک آہستہ آہستہ منتر بولتی رہی' جب تک کہ پورا منتر مجھے یاد نہیں ہو گیا۔ کہنے لگی: "اب تین مرتبہ منتر دہراؤ۔"

مَیں نے تین کی بجائے چھ سات مرتبہ منتر کو دہرا دیا۔ اس نے کہا: "بس اسے بھولنا

مت۔ اب مَیں تمہیں ایک ایسی جگہ بھیج رہی ہوں' جہاں تم اکیلے ہی جاؤ گے۔ ڈر خوف کو اپنے ذہن سے نکال دینا' اگر ڈر گئے تو سمجھ لو کہ تمہاری بہن کی بیماری کبھی دور نہیں ہوگی اور پاتال کی جس خبیث پاتالی بدروح کا اس کو آسیب چمٹا ہوا ہے وہ آہستہ آہستہ اس کا سارا خون چوس لے گی اور تمہاری بہن ایک برس کے اندر اندر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر مرجائے گی۔"

مَیں نے کہا۔ "مَیں بالکل نہیں ڈروں گا۔ تم بتاؤ مجھے کہاں جانا ہوگا؟"

کہنے لگی۔ "یہاں سے تھوڑی دور جنگل میں ایک اندھا کنواں ہے۔ یہ کنواں کورو پانڈو کے زمانے کا ہے۔ اس میں پانی نہیں ہے صرف درختوں کی گلی سڑی ٹہنیاں اور روڑے مٹی ہے۔ اس کنوئیں میں زہریلے سانپ بچھو رہتے ہیں۔ کنوئیں کی تہہ میں دیوار میں ایک پرانی کھڑکی ہے۔ اس کھڑکی کے اندر ایک طاق بنا ہُوا ہے۔ اس طاق میں ایک انسانی کھوپڑی رکھی ہوئی ہے۔ تمہیں وہ کھوپڑی لا کر مجھے دینی ہوگی۔"

یہ ساری تفصیل سنتے ہوئے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ مَیں نے کہا۔ "یہ کام میری بجائے تم خود کیوں نہیں کر لیتیں؟ کیا تمہارے پاس کوئی ایسا طلسمی منتر نہیں ہے کہ جس کی مدد سے تم کنوئیں کے طاق والی کھوپڑی یہاں حاضر کر لو؟"

کامنی کہنے لگی:

"تم مورکھ دنیا والے صرف اعتراض کرنا ہی جانتے ہیں۔ اس سنسار میں کیسی کیسی طاقتیں کام کر رہی ہیں تم کو ان کا کوئی علم نہیں ہے۔ اگر میں خود ایسا کر سکتی تو تمہیں کبھی نہ کہتی۔ سنو! اس کنوئیں پر جس آسیب کا سایہ ہے وہ میرا دشمن ہے اور میری طاقت اس کی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ وہاں میرے منہ سے نکلا ہوا منتر بھی دُھواں بن کر اُڑ جائے گا اور اس کا کچھ اثر نہیں ہوگا۔ تم چونکہ مسلمان ہو اور مسلمان ایک خدا کو مانتا ہے' اس لئے کنوئیں کے خوفناک طاقت رکھنے والے آسیب کا تم پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔"

مَیں نے کہا۔ "لیکن کنوئیں کے اندر جو سانپ بچھو ہیں' مَیں ان سے کیسے بچ سکوں

؟"

کامنی بولی۔ "اس کا اپائے میں کردوں گی۔ مَیں مہاناگ کا منتر پڑھ کر تم پر پھونک دوں ں۔ اس منتر کے اثر سے کوئی بچھو کوئی سانپ تمہارے قریب بھی نہیں پھٹکے گا۔"

مَیں دل میں سوچنے لگا کہ کیا معلوم اس کا منتر اثر نہ کرے اور کنوئیں کے زہریلے انپ بچھو مجھے ڈس کر ہلاک کر ڈالیں۔ آخر میں ایک عام انسان تھا۔ میرے اندر بھی لمزوریاں تھیں۔ مَیں نے کامنی سے کہا:

"کیا کنوئیں کے اندر سے کھوپڑی لانی بہت ضروری ہے؟ کیا اس کے بغیر تم میری ن کی بیماری کا علاج نہیں کر سکتیں؟"

اس نے کہا۔ "تم نے پھر آگے سے بحث شروع کر دی ہے۔ اس سوال جواب سے وائے اس کے اور کچھ حاصل نہیں ہوگا کہ پاتال چڑیل تمہاری بہن کا سارا خون پی کر سے ہلاک کر ڈالے گی۔"

مَیں نے جلدی سے کہا۔ "مَیں اب کوئی سوال نہیں کروں گا۔ مجھے صرف اتنا بتا دو کہ ں اندھے آسیبی کنوئیں میں کس طرح اتروں گا؟"

کامنی نے کہا۔ "کنوئیں میں اترنے کے لئے پرانے زمانے میں سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ وہ سیڑھیاں تلاش کر کے تم کنوئیں میں اتر سکو گے۔ یاد رکھنا' کنوئیں میں اتر گے تمہارے بائیں طرف دیوار میں ایک کھڑکی سی نظر آئے گی۔ بے دھڑک اس کھڑکی میں اخل ہو جانا۔ آگے تنگ سا غار ہوگا' جہاں ایک طاق میں وہ انسانی کھوپڑی پڑی ہوگی' جو نہیں اٹھا کر میرے پاس لانی ہوگی۔ سمجھ لو کہ اس کھوپڑی میں تمہاری بہن کی بیماری کا لاج چھپا ہُوا ہے۔"

مَیں اس ڈراؤنی مہم پر جانے کے لئے بالکل تیار ہو گیا۔ مَیں نے اس سے پوچھا کہ مجھے ہاں کس وقت جانا ہوگا۔ کامنی نے کہا:

"ابھی کافی رات باقی ہے۔ یہ کام تمہیں سورج نکلنے سے پہلے پہلے کرنا ہوگا۔ کنوئیں

کے طاق والی کھوپڑی پر قدیم زمانے سے ایک ایسا طلسم پھونکا گیا ہے کہ وہ صرف رار کے وقت ظاہر ہوتی ہے۔ دن کے وقت دنیا والوں کی نگاہوں سے غائب ہو جاتی ہے کھوپڑی کا رات کے اندھیرے میں ہی طاق سے اٹھا کر میرے پاس لانا ضروری ہے میرے ساتھ آؤ۔ مَیں تمہیں آسیبی کنوئیں سے تھوڑی دور تک لے جا سکتی ہوں اٹھو۔"

وہ کوٹھڑی سے نکل گئی۔ وہ آگے آگے تھی میں پیچھے پیچھے تھا۔ ہم اس قدیم کھ سے باہر آ گئے۔ کامنی رات کے تاریک سناٹے میں ایک طرف کو چل پڑی۔ ہم اندھیری رات کے غار میں سے گزر رہے تھے۔ ہمارے اِردگرد درخت ساکت کھڑ تھے۔ کسی پرندے تک کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ کامنی کو میں اندھیرے میں باقاعدہ رہا تھا اور اس کے نقشِ قدم پر چل رہا تھا۔ یہ بڑا ہی ویران اور آسیب زدہ علاقہ عجیب قسم کی جھاڑیاں تھیں۔ بعض کی شاخیں میرے سامنے آ جاتی تھیں اور مجھے ہاتھ سے ہٹانا پڑتا تھا۔ چلتے چلتے کامنی ٹھہر گئی۔ میرے کان کے قریب اپنا منہ لا کر سرگوشی بولی:

"ہم اندھے کنوئیں کے قریب آ گئے ہیں۔ مَیں یہاں سے آگے نہیں جا سکتی۔ طاقت کی حد یہاں ختم ہوتی ہے اور آسیبی کنوئیں کے آسیب کی حد شروع ہو جاتی۔ یہاں سے آگے تم اکیلے ہی جاؤ گے۔ میں اسی جگہ رک کر تمہارا انتظار کروں گی۔"

جب میں اللہ کا نام لے کر چلنے لگا تو کامنی نے کہا:

"بھولنا مت' اندھے کنوئیں میں اترنے سے پہلے تمہیں تین بار وہ منتر پڑھ کر کنو میں پھونک مارنی ہو گی' جو تھوڑی دیر پہلے میں نے تمہیں یاد کرایا تھا۔ میرے کان میں مرتبہ منتر دہراؤ۔"

منتر مجھے واقعی زبانی یاد ہو گیا تھا۔ مَیں نے آہستہ سے منتر کی دونوں سطریں دہرا د کامنی نے دبی آواز میں کہا:

"ٹھیک ہے۔ اب جاؤ۔"

اس نے مجھے کنوئیں کی طرف جانے والا رستہ دکھا دیا تھا۔ مَیں اس پر چل پڑا۔ یہ ایک چھوٹی سی پگڈنڈی تھی' جس کے اوپر درخت جھکے ہوئے تھے۔ یہ درخت بھی مجھے آسیب زدہ لگ رہے تھے۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ ان کی ٹہنیاں کسی بھی وقت مجھے اپنے شکنجے میں جکڑ لیں گی۔ مجھ پر دہشت ضرور طاری تھی' لیکن میں جس مقصد کے لئے جا رہا تھا وہ مقصد مجھے آگے لئے جا رہا تھا۔ مَیں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کامنی نے بتایا تھا کہ کنوئیں کی منڈیر زمین سے اونچی ہے اور اس پر ایک بہت بڑے درخت نے سایہ ڈال رکھا ہے۔ ایک جگہ مجھے بہت بڑا گنجان درخت نظر آ گیا۔

مَیں نے آیت الکرسی پڑھنی شروع کر دی۔ مجھے اندھیرے میں کنوئیں کی اونچی منڈیر نظر آ گئی۔ مَیں پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔ ہر طرف ایک ہیبت ناک سناٹا چھایا ہُوا تھا۔ میرے پاؤں تلے کسی خشک پتے کے کچلے جانے کی آواز آتی تو مَیں خود ڈر سا جاتا۔ مَیں اندھے کنوئیں کی منڈیر کے پاس پہنچ گیا۔ مجھے وہ سیڑھیاں تلاش کرنی تھیں' جو نیچے کنوئیں کی تہہ میں جاتی تھیں۔ کنواں کافی بڑا تھا۔ میں اس کی منڈیر کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ساتھ جھک کر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش بھی کر رہا تھا کہ نیچے جانے والی سیڑھیاں کس جگہ پر ہیں۔ کنواں ایک عرصے سے ویران پڑا لگتا تھا۔ اس کی منڈیر پر جگہ جگہ گھاس اگی ہوئی تھی۔ کسی جگہ گھاس نے منڈیر کو اپنے اندر چھپایا ہُوا تھا۔ ایک عجیب سی ناگوار بو کنوئیں میں سے اٹھ رہی تھی۔ آخر میں نے سیڑھیاں تلاش کر لیں۔ یہ گھاس کے اندر چھپی ہوئی تھیں۔ میں نے دل میں کامنی کا یاد کرایا ہُوا منتر دہرایا۔ مجھے سارا منتر یاد تھا۔ پھر میں نے تین مرتبہ منتر پڑھا اور کنوئیں کی طرف پھونک ماری۔

کامنی نے کہا تھا کہ منتر پھونک دینے کے بعد مجھے کنوئیں کا آسیب اور کنوئیں کے اندر جو زہریلے سانپ بچھو رہتے تھے' ان کا کوئی اثر نہیں ہو گا' مجھے کامنی کے منتر پر کوئی یقین نہیں تھا۔ لیکن مجبوراً مجھے یقین کرنا پڑ رہا تھا۔ یقین نہ کرنے کی صورت میں کنوئیں میں

اترنا تو دور کی بات ہے، مَیں اس کے قریب بھی نہیں جا سکتا تھا۔ تین مرتبہ طلسمی منتر پھونکنے کے بعد مَیں نے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر بڑی عاجزی سے کہا:

"یا اللہ پاک! تو دلوں کا حال جانتا ہے۔ میرا ایمان ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ تو جانتا ہے کہ مَیں کسی دنیاوی لالچ کے لئے یہ سب کچھ نہیں کر رہا۔ میری پیاری بہن بستر مرگ پر ہے۔ تمام ڈاکٹروں حکیموں، عالموں نے جواب دے دیا ہے۔ میں چاروں طرف سے مجبور ہو کر یہ کر رہا ہوں۔ مجھے معاف کر دینا اور اپنی رحمت کے صدقے میری بہن کی شفایابی کا کوئی سبب دینا۔"

یہ دعا مانگنے سے میرے اندر ایک نئی توانائی پیدا ہو گئی۔ مَیں نے جھک کر کنوئیں میں دیکھا۔ کنوئیں میں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ ایسی رونگٹے کھڑے کر دینے والی سنسناہٹ کی آواز آ رہی تھی، جیسے کوئی دہشت ناک آسیب کنوئیں کی تہہ میں عفریت کی طرح سانس لے رہا ہو۔ مَیں نے اللہ کو یاد کیا اور کنوئیں کی سیڑھیاں اترنے لگا۔ سیڑھیاں پتھروں سے بنائی گئی تھیں، جو جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی تھیں۔ اس خیال سے کہ کہیں میں پھسل جانے سے کنوئیں میں نہ گر پڑوں، میں بیٹھ کر ایک ایک زینہ کر کے نیچے اتر رہا تھا۔ جیسے جیسے مَیں نیچے اتر رہا تھا۔ کنوئیں کا اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا اور کنوئیں کی ناگوار بو تیز ہوتی جا رہی تھی۔ آخری سیڑھی پر پہنچ کر مَیں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ کنوئیں کی تہہ میں اس قدر سیاہ کالا اندھیرا تھا کہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے باوجود مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھے اس کھڑکی کی تلاش تھی، جس کے بارے میں کامنی نرتکی نے بتایا تھا وہ کنوئیں کی تہہ میں دیوار میں بنی ہوئی ہے۔ مجھے بیک وقت دو تین سانپوں کی پھنکار سنائی دیں۔ میرے جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ مجھے کنوئیں کی تہہ میں قدم رکھ کر کنوئیں کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کھڑکی کو تلاش کرنا تھا لیکن سانپوں کی پھنکاروں نے جیسے میرے قدم وہیں جکڑ لئے تھے۔ میں نیچے پاؤں نہیں

رکھ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ جیسے ہی میں نے کنوئیں کی تہہ میں پاؤں رکھا، زہریلے سانپ اور بچھو میرے اوپر چڑھ جائیں گے اور ڈس کر مجھے موت کی نیند سلا دیں گے۔

لیکن مَیں جس مہم کا عزم لے کر وہاں تک آیا تھا، وہ مجھے ہر حالت میں کامیابی کے ساتھ مکمل کرنی تھی۔ میں کنوئیں کی تہہ سے صرف ایک زینے کی بلندی پر تھا۔ کنوئیں کی تہہ میں کوڑا کرکٹ بھرا ہوا تھا۔ ناگوار بُو ساری فضا پر حاوی تھی۔ مَیں نیچے اتر گیا۔ میرا پاؤں سوکھی گھاس میں دھنس گیا۔ مَیں نے کنوئیں کی دیوار کے ساتھ چلنا شروع کر دیا۔ ہر قدم پر موت کا ڈر لگا تھا۔ ہر قدم پر لگتا تھا کہ کوئی نہ کوئی بچھو یا سانپ مجھے ڈس لے گا۔ ایک سانپ نے اس طرح پھنکارا جیسے میرا پاؤں ان جانے میں اس کے اوپر آ گیا ہو۔ مَیں ڈر گیا۔ گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مَیں کنوئیں کی دیوار کو ہاتھ سے ٹٹولتا جا رہا تھا۔ آخر ایک جگہ میرا ہاتھ دیوار کے اندر چلا گیا۔ یہی کنوئیں کی کھڑکی تھی۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ کھڑکی کے اندر کچھ نظر نہ آیا۔ میں اس کے اندر چلا گیا۔

مجھے محسوس ہُوا کہ مَیں نرم اور گیلی مٹی پر چل رہا ہوں۔ اندھیرا یہاں اور بھی گہرا ہو گیا تھا۔ مجھے کھوپڑی والے طاق کی تلاش تھی۔ میں سر اونچا نہیں کر سکتا تھا۔ اس غار کی چھت بہت نیچی تھی۔ مجھے چھتری والی قبر یاد آ گئی۔ مَیں ہاتھ سے دیوار کو ٹٹولنے لگا۔ آخر میرا ہاتھ دیوار کے ایک شگاف میں چلا گیا۔ یہ شاید طاق تھا۔ مَیں نے اندھیرے میں ہاتھ ادھر ادھر مارا۔ میرا ہاتھ ایک انسانی کھوپڑی پر پڑ گیا۔ مَیں نے اسے اٹھا لیا۔ جیسے ہی میں نے اسے طاق میں سے اٹھایا، میرے ہاتھوں کو ایک ہلکا سا جھٹکا لگا۔ میں نے کوئی پروا نہ کی اور کھوپڑی کو لے کر شگاف کی کھڑکی سے باہر کنوئیں میں آ گیا۔ مجھے ایسی آواز سنائی دی، جیسے کسی نے بالکل قریب سے گہرا ٹھنڈا سانس بھرا ہو۔ پھر کسی نے جیسے میرے کندھے پر اپنا ٹھنڈا ہاتھ رکھ دیا ہو۔ میرے حلق سے بے اختیار ایک چیخ نکل گئی۔ میں اس طرح دیوانہ وار کنوئیں کے زینے کی طرف دوڑا، جس طرح آدمی گھٹنے گھٹنے پانی میں دوڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ جیسے ہی میں زینے پر پہنچا کسی نے پیچھے سے میری ٹانگ پکڑ لی۔ میں زور

سے پاؤں کو جھٹک کر سیڑھیاں چڑھنے' بلکہ بھلانگنے لگا۔ سیڑھیاں ختم ہونے میں نہ آ
تھیں۔ خوف اور دہشت کے مارے میرا جسم برف کی طرح ٹھنڈا اور بے جان سا ہو گ
تھا۔ جونہی میں آخری سیڑھی پر آیا' مَیں نے کنوئیں کے باہر چھلانگ لگا دی۔

مَیں جھاڑیوں میں گرا۔ گرتے ہی اٹھا اور جس پگڈنڈی سے ہو کر آیا تھا' اس پر ـ
تحاشا بھاگنے لگا۔ خدا جانے یہ دہشت کا اثر تھا یا کیا تھا کہ چند قدم دوڑنے کے بعد ہی م
سانس اکھڑنے لگا۔ انسانی کھوپڑی میں نے اپنے سینے کے ساتھ لگا رکھی تھی۔ میری ٹانگو
میں سے جیسے جان نکل گئی تھی۔ مَیں وہیں بیٹھ گیا۔ کھوپڑی کی یہ حالت تھی کہ وہ کبھی گر
ہو جاتی اور کبھی ٹھنڈی ہو جاتی تھی۔ مگر مَیں نے اسے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ ا
کھوپڑی میں میری بہن کی بیماری سے نجات کا راز پوشیدہ تھا۔ مَیں اسے اپنے سے
الگ کر سکتا تھا۔ جب ذرا ٹانگوں میں جان آئی تو مَیں اٹھا اور سامنے والے درختو
جانب بڑھا۔ ان درختوں کے نیچے کامنی میرا انتظار کر رہی تھی۔ مَیں درختوں کے پاس
تو اچانک ایک طرف سے کامنی کسی چڑیل کی طرح نکل کر میرے سامنے آ گئی۔ مجھے
کی آنکھوں میں موم بتیاں سی جلتی نظر آئیں۔ اس نے پوچھا۔ "کھوپڑی لے آئے ہو؟"

میں نے کہا۔ "لے آیا ہوں۔"

اور میں نے کھوپڑی والا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے کھوپڑی میرے ہاتھ
لے لی اور بولی:

"تم نے دشمن کے قلعے کا دروازہ توڑ دیا ہے' اب قلعے میں داخل ہونا ہی باقی ہے۔
وہ مجھے واپس کھنڈر والے اپنے آشرم میں لے آئی۔ یہاں دیا جل رہا تھا۔ کامنی
دیئے کی روشنی میں کھوپڑی کو اپنے ہاتھوں میں گھما کر غور سے دیکھا۔ کہنے لگی:

"دیکھا میرے طلسمی منتر کا اثر؟ تم وہ کھوپڑی کنوئیں میں سے نکال لائے ہو' جس
سن کر دیوتا لوگ بھی ایک بار کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں۔"

میں نے کامنی سے کہا:

"میں نے تمہاری شرط پوری کر دی ہے' اب تم نے جو بھی جادو ٹونہ کرنا ہے کرو اور
میری بہن کو اس موذی مرض سے نجات دلاؤ' جو اسے آہستہ آہستہ الم‌ناک موت کی
طرف لئے جا رہا ہے۔"

کامنی نے کہا:

"تم اس کی فکر نہ کرو۔ تم نے مجھ پر جو احسان کیا ہے مَیں اس کا بدلہ تمہیں ضرور
دوں گی' تمہاری بہن کو مَیں پاتالی چڑیل کے پنجے سے ضرور آزاد کرا دوں گی۔"

اس نے کھوپڑی شولنگ کے گول لمبوترے پتھر کے اوپر رکھ دی اور منتر پڑھنے شروع
کر دیئے۔ میں ذرا پیچھے ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ دیر تک منتر پڑھ پڑھ کر کھوپڑی پر پھونکتی رہی۔
پھر اس نے مٹی کے لوٹے میں سے پانی نکال کر سات بار کھوپڑی پر پانی کے چھینٹے مارے۔
اس کے بعد کامنی نے آنکھیں بند کر لیں اور سر جھکا دیا' جیسے کسی کو دیکھ کر اس کی تعظیم
کر رہی ہو۔ وہ دس پندرہ منٹ تک اسی حالت میں رہی۔ مَیں دیئے کی روشنی میں انسانی
کھوپڑی کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک کھوپڑی میں حرکت پیدا ہوئی۔ وہ شولنگ کے پتھر کے اوپر
کانپنے لگی۔ کانپتے کانپتے وہ اوپر کو اٹھی اور اس نے کوٹھڑی میں اڑنا شروع کر دیا۔ کامنی
نے آنکھیں کھول دیں اور میری طرف دیکھ کر ہاتھ کی انگلی سے مجھے خاموش رہنے کا
اشارہ کیا۔"

انسانی کھوپڑی کوٹھڑی کے اندر دائرے کی شکل میں چکر لگا رہی تھی۔ کامنی نے دوبارہ
منتر پڑھنے شروع کر دیئے تھے۔ اب وہ اونچی آواز میں منتر پڑھ رہی تھی۔ جیسے جیسے کامنی
کے منتروں کی آواز بلند ہو رہی تھی' کھوپڑی کے گردش کرنے کی رفتار بھی تیز ہوتی جا
رہی تھی۔ یہاں تک کہ کھوپڑی کوٹھڑی کی دیواروں سے ٹکرانے لگی۔ اس کی حالت اس
زخمی پرندے کی طرح ہو رہی تھی' جو بند پنجرے سے باہر نکلنے کی سر توڑ کوشش کر رہا ہو
لیکن اسے باہر نکلنے کا راستہ نظر نہ آ رہا ہو۔ کامنی برابر اونچی آواز میں منتر پڑھے جا رہی
تھی۔ انسانی کھوپڑی دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر جیسے تھک گئی تھی۔ اس کی رفتار دھیمی

ہونے لگی۔ وہ کوٹھڑی کی بند فضا میں اڑتے اڑتے جھول کھانے لگی۔ پھر اپنے آپ
شولنگ کے پتھر کے اوپر آکر ٹک گئی۔ تب کامنی نے غضبناک آواز میں کہا:

"جل سنگھنی! جل سنگھنی! اب تو میرے قابو میں ہے۔ اب تو میرے ہر حکم کی پالن
کرنے پر مجبور ہے۔"

میری سراسیمہ نظریں کھوپڑی پر جمی ہوئی تھیں۔ میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ مجھے
اس دھما چوکڑی سے نجات مل گئی تھی۔ مجھے اپنی جان کا خطرہ پڑ گیا تھا کہ اتنی تیزی کے
ساتھ گردش کرتی انسانی کھوپڑی اگر میرے سر سے ٹکرا گئی تو میری اپنی کھوپڑی اڑ جائے
گی۔ کامنی نے لوٹے میں سے پانی کا چلو بھرا اور کھوپڑی پر چھڑک دیا۔ پھر اس نے کھوپڑی
کو اٹھا لیا اور میری طرف دیکھ کر بولی:

"میں نے تمہاری بہن میں گھسے ہوئے آسیب پاتالی چڑیل کو اپنے قبضے میں کر لیا ہے۔
اب صرف ایک شرط پوری کرنی رہ گئی ہے۔"

"وہ کیا شرط ہے؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

کامنی نرتکی بولی:

"اس کھوپڑی کو اپنے ساتھ اپنے گھر لاہور لے جاؤ۔ اس کے اندر چٹکی بھر شکر پڑیا
میں باندھ کر رکھنے کے بعد اسے ایک رات کے لئے چھتری والی قبر کے اندر چھوڑ آنا۔
دھوپ نکلنے کے بعد قبر میں جانا۔ کھوپڑی میں سے شکر کی پڑیا نکال کر اپنے پاس سنبھال کر
رکھ لینا اور کھوپڑی کو اسی چھتری والی پرانی قبر کے اندر دفن کر دینا۔ گھر آکر پہلا کام
کرنا کہ اپنی بہن کو پڑیا والی شکر پانی کے ساتھ پلا دینا۔ تمہاری بہن کو پاتالی چڑیل کے
منحوس آسیب سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نجات مل جائے گی۔"

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ چلو ایک سبب تو پیدا ہوا۔ میں کامنی کا شکریہ ادا کرنے
تو وہ بولی:

"اس کی ضرورت نہیں ہے اور ہاں ایک اور ضروری بات میں تمہیں کہنا بھول گئی

ہوں۔ زندگی میں کبھی تمہیں میری مدد کی ضرورت پڑے تو میں تمہیں اس پرانی کوٹھڑی
میں ملوں گی۔ یہ کوٹھڑی جس کھنڈر میں واقع ہے اور جہاں تم اس وقت بیٹھے ہو، یہ اس
علاقے میں مرن گھاٹ کے نام سے مشہور ہے۔ لوگوں میں یہ بات مشہور ہے کہ جو کوئی
مرن گھاٹ یعنی اس کھنڈر میں آتا ہے مر جاتا ہے اور اس کی لاش کھنڈر کے دروازے پر
ٹنگی ہوئی ملتی ہے۔ مگر تم بے دھڑک چلے آنا۔ اس کھنڈر، مرن گھاٹ میں بدروحیں بھی
رہتی ہیں لیکن گھبرانا مت۔ یہ تمام بدروحیں میری دوست ہیں۔ وہ تمہیں کچھ نہیں کہیں
گی۔ اگر میں تمہیں یہاں نہ ملی تو یہاں بیٹھ کر میرا انتظار کرنا۔ میں جہاں بھی ہوں گی، مجھے
پتہ چل جائے گا کہ تم میرے آشرم میں آئے ہو۔ میں اسی وقت آ جاؤں گی۔"

کامنی نے انسانی کھوپڑی کپڑے میں لپیٹ کر ایک تھیلے میں ڈال کر مجھے دے دی اور
کہا:

"اسے ایک لمحے کے لئے بھی اپنے سے الگ نہ کرنا۔ اگرچہ میں نے اس کھوپڑی کے
ذریعے تمہاری بہن کو چمٹی ہوئی بدروح چڑیل پاتالی کو اپنے قبضے میں کر لیا ہوا ہے۔ لیکن
پاتالی چڑیل بڑی عیار اور خطرناک چڑیل ہے۔ وہ اپنے طور پر خواہ کتنا جادو ٹونہ کر لے یہ
کھوپڑی حاصل نہ کر سکے گی۔ کھوپڑی واپس لینے کے لئے شرط ہے کہ تم اسے اپنے ہاتھ
سے دے دو۔ وہ کسی بھی بھیس میں تمہارے پاس آکر تم سے کھوپڑی دیکھنے کی خواہش کا
اظہار کر سکتی ہے۔ لیکن خواہ کچھ بھی ہو جائے تم اس وقت تک یہ کھوپڑی کسی کو نہ دکھانا،
جب تک کہ تم اسے چھتری والی قبر میں دفن نہیں کر لیتے۔ ایک بار یہ کھوپڑی قبر میں
دفن ہو گئی تو اس کے بعد پاتالی چڑیل اسے اپنے قبضے میں نہیں لے سکے گی۔ کھوپڑی کو قبر
میں زمین گہری کھود کر دفن کرنا۔ اب تم سو جاؤ۔ صبح تمہیں جگا دوں گی۔ اس کے بعد تم
ریل میں سوار ہو کر لاہور واپس چلے جانا۔"

اس بدروحوں کی کوٹھڑی میں سیندور اور لوبان کی بو سے میرا دماغ بند ہو رہا تھا۔ میں
کھلی ہوا میں جانے کو بے تاب تھا۔ کھوپڑی والا تھیلا میں نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ میں

نے کامنی سے کہا:

"مجھے بالکل نیند نہیں آ رہی۔ میں جلدی سے جلدی اپنی بہن کے پاس پہنچ جانا چاہتا ہوں' تاکہ اس کی بیماری کا علاج کر سکوں۔ اس لئے میں اسی وقت کھنڈوہ ریلوے سٹیشن کی طرف روانہ ہو جانا چاہتا ہوں۔ کوئی نہ کوئی دلی جانے والی گاڑی مجھے مل جائے گی۔"

کامنی کہنے لگی:

"اس وقت تمہیں سٹیشن تک کوئی سواری نہیں ملے گی۔ کیا چالیس پچاس میل پیدل چل کر جاؤ گے؟"

میں نے کہا: "کامنی دیوی! میرا جانا بڑا ضروری ہے۔" اس نے ایک پل کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ منہ ہی منہ میں شاید کوئی منتر بڑبڑا رہی تھی یا کسی نظر نہ آنے والی مخلوق سے کوئی بات کر رہی تھی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ کہنے لگی:

"میں نے تمہارا انتظام کر دیا ہے۔ اس مرن گھاٹ والے کھنڈر سے نکلنے کے بع بائیں طرف چل پڑنا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد تمہیں درختوں میں ایک جگہ ایک یکہ کھڑ نظر آئے گا۔ اس کا کوچوان آگے بیٹھا ہو گا۔ تم خاموشی سے یکے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ جانا خبردار یکے کے کوچوان کو بلانے یا اس سے بات چیت کرنے کی غلطی نہ کر بیٹھنا۔ یک تمہیں کھنڈوہ ریلوے سٹیشن پہنچا دے گا۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

میں نے کھوپڑی والا تھیلا اپنی گردن میں اسی طرح لٹکایا کہ کھوپڑی میرے سینے ۔ ساتھ لگ گئی۔ میں نے کامنی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا ا خاموشی سے کوٹھڑی سے نکل گیا۔ مرن گھاٹ کھنڈر سے باہر آ کر میں بائیں جانب چلنے لگ یہ جنگل کا زیادہ گھنا حصہ نہیں تھا۔ درختوں کے جھنڈ فاصلے فاصلے پر تھے' مگر جھاڑ بے شمار تھیں۔ چلتے چلتے میں گھنے درختوں کے جھنڈ سے باہر نکلا تو سامنے اندھیرے مجھے ایک تانگہ یعنی یکہ کھڑا دکھائی دیا۔

قریب آ کر دیکھا کہ یکہ بالکل خالی تھا۔ اگلی سیٹ پر کوچوان بالکل ساکت اور سیدھ

کر بیٹھا تھا۔ کامنی نے کہا تھا کہ یکے میں خاموشی سے بیٹھ جانا اور کوچوان سے کوئی بات نہ کرنا۔ اگر وہ خود بات کرے تو کوئی جواب نہ دینا، خاموش رہنا۔ میں کامنی کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے یکے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میرے بیٹھتے ہی کوچوان کے جسم میں حرکت پیدا ہو گئی۔ اس نے گھوڑے کو سانٹا مارا۔ گھوڑا ایک بار اُچھلا پھر دوڑنے لگا۔ گھوڑا یکے سمیت اس طرح گھنی جھاڑیوں اور درختوں والے نیم جنگلاتی علاقے میں دوڑ رہا تھا جیسے وہ کوئی کھلی اور کشادہ سڑک ہو۔ عجیب بات یہ بھی تھی کہ یکے کو کوئی جھٹکا نہیں لگ رہا تھا۔ یکہ ایسے جا رہا تھا جیسے دریا میں کشتی تیر رہی ہو۔ مجھے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ گھوڑا اپنے آپ اِدھر اُدھر مڑ رہا تھا۔ ہر لمحہ اس بات کا خدشہ محسوس ہو رہا تھا کہ یکہ کسی درخت سے نہ ٹکرا جائے۔ لیکن ایسا ایک بار بھی نہیں ہوا اور یکہ جنگل سے نکل کر کھلی جگہ پر آ گیا۔ اب وہ ایک کچی سڑک پر جا رہا تھا اور اس کی رفتار پہلے سے تیز ہو گئی تھی۔ نہ گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز آ رہی تھی' نہ یکے کے چوں چرا کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ یہ کوئی جادوئی اڑن کھٹولا تھا جو زمین سے تھوڑا بلند ہو کر پرواز کر رہا تھا۔

فاصلہ بڑی جلدی جلدی طے ہو رہا تھا۔

دور سے مجھے روشنیاں نظر آئیں۔ یہ کافی روشنیاں تھیں اور کھنڈوہ شہر کی روشنیاں ہی ہو سکتی تھیں۔ میں کوچوان سے پوچھنے ہی والا تھا کہ یہ کھنڈوہ شہر کی روشنیاں ہیں؟ تو اچانک مجھے خیال آ گیا کہ کامنی نے مجھے ہدایت کی تھی کہ راستے میں کوچوان سے کوئی بات نہ کروں۔ وہ اگر کوئی بات کرے تو اس کے جواب میں بالکل خاموش رہوں۔ میں نے کوچوان سے کوئی بات نہ کی۔ جب روشنیاں قریب آ گئیں اور یکہ رات کی تاریکی میں ایک پکی سڑک پر آ گیا تو کوچوان نے کہا: "بابو! کہاں کے رہنے والے ہو؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے پھر ایک سوال کیا: "بابو! کھنڈوہ سے آگے کہاں جاؤ گے؟" میں نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا اور خاموش بیٹھا رہا۔ کوچوان تیسری بار بولا:

"بابو! رات کے وقت سٹیشن پر جا کر کیا کرو گے۔ میرے ساتھ گھر چلو۔ میرے ساتھ گھر چلو۔ میرے ساتھ گھر چلو۔"

کوچوان کسی مشینی انسان کی طرح بول رہا تھا۔ مَیں نے اپنے ہونٹ بند رکھے۔ اس کی کسی بات کا جواب نہ دیا۔ اس کے بعد کوچوان نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ اچانک مجھے ایک دھچکا سا لگا، جیسے یکہ ایک دم زمین پر اتر آیا ہو۔ اب مجھے یکے کے ہلکے ہلکے دھچکے بھی لگ رہے تھے اور گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز بھی آنے لگی تھی۔

ایک چوک آ گیا' جہاں کافی روشنی تھی۔ اِکا دکا سواری کسی وقت گزر جاتی تھی۔ کوچوان نے یکے کو سڑک کی ایک طرف روک لیا اور خود بالکل ساکت ہو کر بیٹھا رہا۔ اس نے مجھے یہ بھی نہ کہا کہ سامنے ریلوے اسٹیشن ہے۔ وہاں تک پیدل چلے جانا' مَیں جلدی سے یکے سے اتر آیا۔ میرے اترتے ہی کوچوان نے یکے کو سڑک پر موڑا اور یکہ تیزی سے سڑک پر واپس چل پڑا۔ میں اسے دیکھ رہا تھا۔ سڑک پر تھوڑی دور جانے کے بعد یکہ اچانک میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

میں نے سر جھٹک کر خدا کا شکر ادا کیا اور کھنڈوہ شہر کی روشنیوں کا رخ کر لیا۔ کھوپڑی والا تھیلا میرے گلے میں لٹک رہا تھا۔ مَیں نے گلے سے تھیلا اتار کر بغل میں دبا لیا۔ راستے میں ایک آدمی سے سٹیشن کا راستہ پوچھا اور سٹیشن پر آ گیا۔ سٹیشن کے کلاک پر نگاہ ڈالی تو معلوم ہوا کہ رات کے تین بجنے والے ہیں۔ دلی کی طرف جانے والی گاڑی صبح چھ بجے کھنڈوہ پہنچتی تھی۔ ویٹنگ روم میں یا پلیٹ فارم کے بنچ پر سونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مجھے ایک لمحے کے لئے بھی کھوپڑی سے غافل نہیں ہونا تھا۔ مَیں نے چائے کی کنٹین پر کھڑے ہو کر گرم چائے کا ایک گلاس پیا' تھیلے میں لپیٹی ہوئی کھوپڑی کا گولا سا بنا کر مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ کچھ دیر پلیٹ فارم پر ٹہلتا رہا۔ پھر ایک بنچ پر آ کر بیٹھ گیا۔ کسی کسی وقت مجھے ایسے لگتا جیسے کوئی میرے کان کے قریب آ کر گہرے گہرے سانس لے رہا ہے۔ پہلے مَیں نے کوئی خیال نہ کیا لیکن جب ہر تین چار منٹ کے بعد میرے کان

ں کسی کے لمبے لمبے سانس لینے کی آواز آنے لگی تو بنچ سے اُٹھ کر پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا۔ مَیں سمجھ گیا تھا کہ یہ کسی بدروح کے سانس لینے کی آواز ہے جو کھوپڑی کے پیچھے لگ ئی ہے۔ مَیں یہ بھی جانتا تھا کہ کامنی نرتکی نے بڑے زبردست طلسم سے اس کھوپڑی کی روح پر فتح حاصل کی ہے اور یہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ اس نے مجھے خبردار بھی کر دیا تھا کہ جب تک تم کھوپڑی کو چھتری والی قبر میں دفن نہیں کر لو گے' اس کھوپڑی کی بَدروح کھوپڑی اپنے قبضے میں کرنے کے لئے تمہارے پیچھے لگی رہے گی' لیکن کامنی نے کھوپڑی جو طلسم پھونکا تھا' اس نے بقول کامنی کے میرے اِردگرد ایک طلسمی حصار بنا دیا تھا' ں کی وجہ سے کوئی بَدروح میرے قریب بھی نہیں پھٹک سکتی تھی۔ کچھ وقت تک برے کانوں میں بَدروح کے سانسوں کی آواز آتی رہی۔ پھر اپنے آپ غائب ہو گئی۔ دن ل آیا۔ چاروں طرف دن کی روشنی ہو گئی۔ پلیٹ فارم پر مسافروں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا ما۔ ٹرین اپنے ٹائم سے آدھا گھنٹہ لیٹ آئی۔ مَیں تھرڈ کلاس کے ڈبے میں بیٹھ گیا۔ سارا ن' ساری رات ٹرین چلتی رہی۔ دوسرے روز صبح کے وقت ٹرین دلی پہنچ گئی۔ دلی سے ں نے پنجاب ایکسپریس پکڑی اور لاہور پہنچ گیا۔

گھر والوں کے لئے میں بہن کی بیماری کے سلسلے میں کسی ماہر ڈاکٹر سے ملنے دو ہی گیا ہُوا ما۔ وہ مجھے اپنے سامنے اچانک دیکھ کر حیران بھی ہوئے اور خوش بھی ہوئے۔ والد ماحب گھر پر ہی تھے' کہنے لگے:

"ڈاکٹر سے بات ہوئی؟ یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟"

ان کا اشارہ کپڑے میں لپٹی ہوئی کھوپڑی کی طرف تھا۔ والدہ بھی موجود تھیں۔ میں نے کہا:

"یہ ——— یہ میں اپنے دوست خالد کے بھانجے کے لئے گھر میں کھیلا جانے والا ٹ بال لایا ہوں۔" اور میں نے اپنے کمرے میں جا کر کھوپڑی کو الماری میں بند کر کے تالا ا دیا۔ اتنے میں عاصمہ بہن بھی اپنے کمرے سے نکل کر آ گئی۔ اسے دیکھ کر میرا دل بے

حد مغموم ہوا۔ اس کا رنگ زرد تھا، آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے۔ لگتا تھا کہ اس کے جسم میں صرف اتنا ہی خون باقی رہ گیا ہے، جس سے وہ گرتے پڑتے زندہ ہے۔ منحوس پاتالی چڑیل نے اس کے جسم کا کافی خون پی لیا تھا۔ اپنے کمرے سے بڑے کمرے تک آتے آتے عاصمہ کا سانس پھول گیا تھا۔ والدہ نے اسے سہارا دے کر صوفے پر لیٹا دیا۔ میں نے اسے کہا:

"فکر نہ کرو عاصمہ بہن! مجھے ایک ایسی دوائی مل گئی ہے، جس کی ایک ہی خوراک سے تم بالکل تندرست ہو جاؤ گی۔"

والد صاحب نے کہا۔ "مجھے بتاؤ وہ کونسی دوائی ہے، دوبئی والے ڈاکٹر نے کیا ک
ہے؟"

میں نے کہا۔ "دوبئی والا ڈاکٹر واقعی بڑا تجربے کار اور ذہین ڈاکٹر ہے۔ اس کا چھو
بھائی راولپنڈی میں پریکٹس کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فون پر پنڈی والے ڈاکٹر کو عاصمہ
علالت کی علامات بتا دی تھیں۔ عاصمہ کو جس دوائی کی ضرورت ہے، اتفاق سے وہ دو
اور دوسری عرب امارات میں کسی میڈیکل سٹور میں نہیں تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے پنڈ
اپنے ڈاکٹر بھائی کو فون کیا تو معلوم ہوا کہ اس کے پاس مطلوبہ دوائی موجود ہے۔ میں آ
ہی پنڈی جا رہا ہوں۔ کل دوائی لے کر واپس آ جاؤں گا۔"

ابھی تک میں خالد سے نہیں ملا تھا۔ چھتری والی قبر میں کھوپڑی دفن کرنے سے پ
میں خالد سے ملنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ یہ ساری باتیں مجھے راز میں رکھنی تھیں اور ا
عزیز سے عزیز دوست کو بھی کچھ نہیں بتانا تھا۔ صبح کے وقت میں لاہور پہنچا تھا۔ تھو
دیر گھر میں بیٹھنے کے بعد میں نے ایک چھوٹے اٹیچی کیس میں کپڑے میں لپیٹی ہوئی کھو
بند کی اور بس میں سوار ہو کر پنڈی کی طرف روانہ ہو گیا۔ پنڈی کے راجہ بازار میں ج
میں نے ایک دکان سے ایک پاؤ شکر خریدی۔ میں ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ ہوٹل کے کمر
میں آ کر میں نے شکر کے لفافے میں سے چٹکی بھر شکر نکالی۔ اسے چھوٹی سی پڑیا میں با

اور اٹیچی کیس میں سے کھوپڑی نکال کر اس کے اندر پڑیا رکھ دی۔ میں کھوپڑی کو کپڑے میں لپیٹنے لگا تو کھوپڑی ذرا سی کانپی۔ میں نے اپنی گرفت مضبوط رکھی۔ کھوپڑی کی بدروح یا پاتال چڑیل کی بدروح کھوپڑی حاصل کرنے کے لئے مجھ پر حملے پر حملہ کر رہی تھی مگر کامنی کے منتروں نے میرے اِردگرد حصار کا جو طلسمی ہالہ بنا دیا تھا، وہ ان بدروحوں کو نہ صرف میرے قریب نہیں آنے دیتا تھا، بلکہ ان کا ہر حملہ ناکام ہو رہا تھا۔ پنڈی سے میں ایک بس میں سوار ہو کر دو ڈھائی گھنٹے کے سفر کے بعد اس پہاڑی مقام پر آ گیا جہاں ویران قلعے کے پہلو میں گوروں کا پرانا قبرستان تھا اور جہاں چھتری والی قبر بھی تھی۔ اس پہاڑی شہر کے ایک چھوٹے سے ہوٹل کے کمرے میں ٹھہر گیا۔ موسم سرما شروع ہو چکا تھا۔ پہاڑی کا یہ چھوٹا سا شہر خالی خالی سا ہو گیا تھا۔ ابھی دن کی روشنی باقی تھی۔ میں نے اٹیچی کیس میں سے کپڑے میں لپٹی ہوئی کھوپڑی نکال کر بغل میں دبائی اور گوروں کے قبرستان کی طرف چل پڑا۔ تھوڑی سی پہاڑی اترائی چڑھائی کے بعد میں قبرستان میں آ گیا۔ قبرستان پر دن کے وقت بھی سناٹا چھایا ہوا تھا۔

چھتری والی قبر دور سے نظر آ رہی تھی۔ میں ٹوٹی پھوٹی قبروں کے درمیان سے گزرتا چھتری والی قبر کے پاس آ کر قبر کے شگاف کے پاس بیٹھ گیا۔ قبر میری دیکھی بھالی تھی۔ مجھے اس سے کوئی خوف بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں قبر میں اتر گیا۔ مجھے ایک رات کے لئے کھوپڑی قبر کے اندر رکھنی تھی۔ بقول کامنی نرتکی کے قبر کے اندر کھوپڑی کی حفاظت اس طلسم نے کرنی تھی، جو کامنی نے منتر پڑھ کر کھوپڑی پر پھونکا ہوا تھا۔ میں نے کھوپڑی کو قبر کے اندر سرہانے کی جانب کونے میں رکھ دیا اور واپس آ گیا۔ کامنی نے کہا تھا کہ ایک بار کھوپڑی چھتری والی قبر کے اندر پہنچ گئی تو پھر بڑے سے بڑے جادوگر کا جادو بھی اسے اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکے گا۔

ہوٹل میں واپس آتے آتے شام ہو گئی۔ باہر سخت سردی تھی۔ ہوٹل کے کمرے میں پھر بھی کچھ سکون تھا۔ رات کا کھانا کھا کر میں لحاف اوڑھ کر بستر پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ

اگر کسی جادوگر یا کھوپڑی کی بدروح کا کوئی منتر چل گیا تو کہیں کھوپڑی غائب نہ ہو گئی ہو۔ کافی دیر تک مَیں یہی کچھ سوچتا رہا۔ پھر مجھے نیند آ گئی اور مَیں سو گیا۔ سونے سے پہلے میں نے صبح کے چار بجے کا الارم لگا دیا تھا کیونکہ کامنی نے کہا تھا کہ دوسرے دن منہ اندھیرے جا کر کھوپڑی میں سے شکر کی پڑیا نکال لینا اور کھوپڑی کو وہیں قبر میں دبا دینا۔ صبح کے ٹھیک چار بجے الارم نے مجھے جگا دیا۔ مَیں نے جلدی جلدی کپڑے پہنے۔ سر پر اُونی ٹوپی جمائی اور گوروں کے قبرستان کی طرف چل پڑا۔ مَیں نے ایک مقامی دکان سے راج مزدوروں والی چھوٹی کانڈی خرید لی تھی' تاکہ اس کی مدد سے قبر کے اندر زمین کھود سکوں۔ کانڈی میرے لمبے گرم کوٹ کی جیب میں تھی۔ پہاڑی راستوں پر دھند چھائی ہوئی تھی۔ مَیں دونوں ہاتھ گرم اوورکوٹ کی جیبوں میں دیئے قبرستان کی طرف چلا جا رہا تھا۔ آسمان پر بادل تھے۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ راستے کا مجھے پتہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد مَیں گوروں کے قبرستان میں چھتری والی قبر کے پاس پہنچ کر قبر کے شگاف کے دہانے پر بیٹھ گیا۔ مَیں نے اوور کوٹ اتار کر باہر رکھ دیا۔ ماچس کی تیلی جلا کر اندر روشنی ڈالی۔ کھوپڑی قبر کی لحد میں اسی طرح پڑی تھی' جس طرح میں اسے رکھ گیا تھا۔ مَیں قبر کی لحد میں اتر گیا۔

میں نے پہلا کام یہ کیا کہ کھوپڑی میں سے شکر کی پڑیا نکال کر جیب میں رکھ لی۔ اس کے بعد کانڈی کی مدد سے قبر کے اندر سرہانے کی جانب زمین کھودنی شروع کر دی۔ زمین سخت تھی۔ ڈیڑھ فٹ گڑھا کھودتے کھودتے مجھے ایک گھنٹہ لگ گیا تھا۔ مجھے سورج نکلنے سے پہلے کھوپڑی کو قبر میں دبا دینا تھا۔ جب قبر میں سوراخ گہرا ہو گیا تو مَیں نے کھوپڑی نیچے لے جا کر رکھ دی اور اوپر سے مٹی ڈال کر گڑھے کو بند کر دیا۔ اس کے اوپر باہر سے روڑے پتھر خشک پتے لا کر ڈال دیئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب مَیں کھوپڑی قبر میں دفن کرنے لگا تھا تو میرے کانوں نے کسی کی چیخ کی آواز سنی تھی۔ یہ آواز بڑی دور سے آتی محسوس ہوئی تھی۔ ظاہر ہے جو بدروح اس کھوپڑی کے پیچھے لگی تھی یہ اسی کی چیخ کی

نی۔ وہ چھتری والی قبر سے دور دور پھر رہی تھی۔ قبر میں آ کر کھوپڑی اٹھا کر لے
ں اس میں نہ تو ہمت پڑ رہی تھی اور نہ اس کے پاس کامنی کے پھونکے ہوئے منتر کا
ڑ ہی تھا۔

انی کھوپڑی کو قبر میں دفن کرنے کے بعد مَیں ہوٹل واپس آ گیا۔ وقت ضائع کرنے کا
پاس کوئی جواز نہیں تھا۔ مجھے شکر والی پڑیا لے کر جلدی سے جلدی اپنی بیمار بہن
ں واپس لاہور پہنچنا تھا۔ پہاڑ کا سیزن ختم ہو چکا تھا۔ پنڈی تک لاری دیر دیر بعد
وتی تھی۔ دوپہر کے بعد مجھے ایک لاری مل گئی۔ مَیں راولپنڈی آ گیا۔ یہاں ٹرین
ور لاہور پہنچ گیا۔ شام ہو چکی تھی۔ والد صاحب گھر پر ہی تھے۔ مَیں نے انہیں بتایا
ں ڈاکٹر سے میں دوائی لے کر آیا ہوں' اس کا شمار راولپنڈی کے مشہور ڈاکٹروں میں
' وہ مریض کو مرض کی پوری تشخیص کرنے کے بعد دوائی دیتا ہے۔ پھر میں نے
یب سے پڑیا نکال کر دکھائی اور کہا:

اکٹر نے بہت غور و فکر کرنے کے بعد یہ دوائی دی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ یہ گھر
ا پانی کے ساتھ مریضہ کو کھلا دینا۔ انشاء اللہ اس کے بعد اسے شفا ہو جائے گی اور
ی بیماری سے اسے ہمیشہ کے لئے نجات مل جائے گی۔"

رہ اور والد بڑے خوش ہوئے۔ عاصمہ بہن اپنے کمرے میں کمبل اوڑھ کر پلنگ پر
تھی۔ مَیں' والد صاحب اور والدہ ہم تینوں اس کے پاس آ گئے۔ میرے ہاتھ میں
اس تھا۔ مَیں نے جو باتیں والدہ صاحبہ اور اور والد صاحب کے سامنے کی تھیں'
صمہ بہن کے سامنے بھی دہرا دیا اور کہا:

دوائی پانی کے ساتھ پی لو۔ انشاء اللہ تم بالکل تندرست ہو جاؤ گی۔"

ہ بہن بے حد کمزور ہو گئی ہوئی تھی۔ والدہ نے اسے سہارا دے کر پلنگ پر سیدھا
اسنے پڑیا عاصمہ کو دے کر کہا:

کٹر صاحب نے کہا تھا کہ دوائی بڑی میٹھی ہے۔"

عاصمہ نے میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر اداسی ہی اداسی چھائی ہوئی تھی۔
نے پڑیا میں جو چٹکی بھر شکر تھی اسے منہ میں ڈال کر اوپر سے پانی کے تین چار گھ
پئے۔ عین اس وقت جب عاصمہ دوائی پی چکی تو کمرہ کسی عورت کی بھیانک چیخ سے
اٹھا۔ مَیں بھی اپنی جگہ پر کانپ گیا۔ لیکن میں یہ دیکھ کر حیرت زدہ ہو کر رہ گیا کہ ک
میں کسی پر اس چیخ کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ بلکہ چیخ کی بھیانک آواز سے گھبرا کر میں ا
اُدھر دیکھنے لگا تو والدہ نے پوچھا:

"کیا بات ہے سلیم؟"

مَیں نے آنکھیں جھپکتے ہوئے کہا:

"کچھ نہیں امی جان! آنکھ میں کچھ پڑ گیا تھا۔"

ثابت ہو گیا تھا کہ کمرے میں کسی عورت کی بھیانک چیخ ضرور بلند ہوئی تھی مگرا
کو سوائے میرے وہاں پر موجود اور کسی شخص نے نہیں سنا تھا۔ اس کی وجہ میری
نہیں آئی تھی کہ ایسا کیوں ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کامنی نرتکی کے طلسمی منترو
ہو۔ لیکن اس چیخ سے ایک بات واضح ہو گئی تھی کہ کھوپڑی کی بدروح دفع ہو گئی
اس کی آخری بھیانک چیخ تھی۔

طلسمی دوائی پینے کے دو گھنٹے بعد عاصمہ نے مجھ سے کہا:

"بھائی! اس دوائی سے مجھے اپنے اندر ایک قسم کی توانائی کا احساس ہو رہا ہے۔"

مَیں نے کہا۔ "عاصمہ بہن! اللہ کا بڑا کرم ہوا ہے' اب یہ بیماری آئندہ تمہار
بھی نہیں پھٹکے گی۔"

مَیں رات کو خالد کے گھر اس سے ملنے چلا گیا اور اسے بھی یہی بتایا کہ مَیں پ
والے ڈاکٹر سے مل کر لاہور واپس آ گیا تھا' لیکن اس ڈاکٹر کے دوسرے بھائی سے
کر ملاقات کرنی بہت ضروری تھی کیونکہ دوائی پنڈی والے ڈاکٹر نے ہی دینی تھ

خالد نے پوچھا:

"کیا دوائی مل گئی تھی؟"

مَیں نے کہا۔ "مل بھی گئی تھی اور عاصمہ بہن کو اس کی خوراک بھی پلا دی ہے اور
یہ سن کر خوشی ہو گی کہ عاصمہ کی حالت دوائی کی ایک ہی خوراک سے پہلے سے کافی
ہو گئی ہے۔ اس نے خود کہا ہے کہ اس دوائی سے مَیں اپنے اندر ایک طاقت محسوس
ہی ہوں۔"

"اللہ کا شکر ہے سلیم۔ ہماری بہن نے بڑی اذیت برداشت کی ہے' اس بیماری کی وجہ
"

مَیں نے خالد کو کچھ نہ بتایا کہ مَیں دوبئی کی بجائے کھنڈوہ گیا ہوا تھا اور مجھے آکاش کی
کامنی نے یہ دوائی دی تھی۔ مَیں خالد کو سب کچھ ضرور بتا دیتا مگر سب سے پہلے
ی والی قبر کے مردے نے خبردار کیا تھا کہ مَیں یہ بات کسی کو نہ بتاؤں اور دوسری
کامنی نرتکی نے مجھے خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ اس راز کو اپنے سینے میں دفن کر
اور کسی کے آگے اس کا ذکر نہ کروں۔ مَیں چھتری والی قبر کے مردے اور پُراسرار
نرتکی کی ہدایت پر پورا پورا عمل کر رہا تھا۔ صرف اس لئے کہ مجھے اپنی بہن کی
ی بڑی عزیز تھی اور اس سلسلے میں' مَیں کسی قسم کا خطرہ مول لینے کے لئے تیار نہیں

زندگی ایک بار پھر معمول پر آ گئی۔

مَیں نے والد صاحب کے ساتھ اکبری منڈی والی دکان پر بیٹھنا شروع کر دیا۔ عاصمہ
کی حالت روز بروز اچھی ہو رہی تھی۔ اس کا رنگ جو پہلے زرد ہوتا تھا اب سرخی
ہو رہا تھا۔ اس کی سر دردی بھی جاتی رہی تھی۔ اسے بھوک بھی خوب لگتی تھی۔
ہفتہ گزر گیا۔ دوسرا ہفتہ بھی گزر گیا۔ ایک مہینہ گزر گیا۔ پھر دوسرا مہینہ بھی گزر گیا
عاصمہ پر دوبارہ دورہ نہ پڑا۔ وہ پوری طرح صحت مند اور ہشاش بشاش ہو گئی تھی۔ اس
آنکھوں کے گرد جو سیاہ حلقے پڑے تھے' وہ بھی غائب ہو گئے تھے۔ اسی نے لڑکیوں کے

ایک پرائیویٹ کالج میں داخلہ بھی لے لیا' تاکہ وہ مزید آگے تعلیم حاصل کرسکے۔ ہا
بہن کے صحت مند ہو جانے سے ہمارے گھر کی فضا ہی بدل گئی تھی۔ والد صاحب
والدہ تو بہت ہی خوش اور مطمئن تھیں کہ عاصمہ کو ایک لاعلاج بیماری سے نجات مل
ہے' جو بڑی تیزی سے اسے موت کی وادیوں میں لئے جا رہی تھی۔ جیسا کہ میں پہلے
کرچکا ہوں' میری عبرت انگیز داستانِ حیات کا تعلق اس زمانے سے ہے جب ابھی پا
نہیں بنا تھا۔ پاکستان کی تحریک شروع ہو چکی تھی اور ہندوستان کے مسلمانوں
قائداعظمؒ کی قیادت میں پاکستان کے قیام کے لئے جوش و خروش سے قیامِ پاکستا
جدوجہد شروع کردی تھی۔

جو علاقہ اب پاکستان کہلاتا ہے وہاں ہندو سکھ بھی آباد تھے۔ ان کے مندروں میں
کی پوجا پاٹھ ہی ہوتی تھی۔ اس طرح تین برس گزر گئے۔ عاصمہ کو پھر کبھی دورہ نہی
تھا۔ وہ پوری طرح صحت مند ہو گئی تھی۔ اسی دوران اس کی شادی ہو گئی۔ اس کی
کے بعد والد صاحب اور والدہ صاحبہ حج کے لئے مکہ مکرمہ چلی گئیں۔ قدرت کو یہی
تھا۔ والدہ مکہ مکرمہ میں شدید علیل ہو گئیں اور انتقال کر گئیں۔ انہیں وہیں حجاز
میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ والدہ کے انتقال کے بعد والد بھی بیمار رہنے لگے۔ اب وہ د
کم جاتے۔ میں نے ہی کاروبار سنبھال لیا تھا۔ ایک روز والد صاحب کو اچانک دل
پڑا اور وہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ آڑھت کا سارا کاروبار میرے اکیلے کے بس
نہیں تھی۔ میرا دوست خالد ان دنوں بیکار تھا۔ میں نے اسے اپنی دکان کا منیجر بنا د
ہم دونوں دوست ایک دوسرے کے اور قریب آ گئے۔ عاصمہ بہن کو اللہ نے چان
عطا کیا۔ وہ اپنے گھر میں بڑی خوش و خرم رہ رہی تھی۔ میں اپنے آبائی گھر میں ا
تھا۔

ایک روز بہن عاصمہ اپنے خاوند کے ساتھ آبائی گھر میں آئی۔ انہوں نے مجھ س
میں شادی کر کے اپنا گھر آباد کرلوں۔ مجھے کوئی اعتراض تو نہیں تھا لیکن میں ن

ایک سال کے بعد شادی کروں گا۔ عاصمہ بہن اور میرے دوست خالد نے میرے لئے رشتہ
تلاش کرنا شروع کر دیا۔ یہ میں ۱۹۴۶ء کے اواخر کی بات کر رہا ہوں۔ اس وقت پاکستان کی
تحریک اپنے پورے عروج پر تھی۔ انگریزوں نے پاکستان کا مطالبہ تسلیم کر لیا تھا اور اب
صرف انگریز حکومت کی طرف سے ایک اعلان کی ضرورت تھی۔ ہندو اور سکھ جماعتیں
پاکستان کی سخت مخالفت کر رہی تھیں' لیکن انگریز حکومت پاکستان کا جائز مطالبہ تسلیم کر
چکی تھی۔ ابھی سکھوں کے مہان لیڈر ماسٹر تارا سنگھ نے پاکستان کی مخالفت میں پنجاب
اسمبلی کے باہر تلوار نہیں لہرائی تھی۔ لیکن ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کے قتلِ عام
کی اندر ہی اندر منصوبے بنانے شروع کر دیئے تھے۔ عاصمہ کی پُراسرار بیماری والے
واقعات کو اڑھائی پونے تین سال گزر چکے تھے۔ اس کے بعد عاصمہ پر کبھی دورہ نہیں پڑا
تھا اور میرے ساتھ بھی کسی قسم کا کوئی آسیبی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ میں کھنڈوہ کے مرن
گھاٹ والی کامنی نرتکی کو تقریباً بھول چکا تھا۔ کبھی کبھی اس کا خیال آ جاتا تھا۔

اپنے دوست خالد کو میں نے ابھی تک یہ بات نہیں بتائی تھی کہ عاصمہ بہن کو
راولپنڈی والے ڈاکٹر کی دوائی سے آرام نہیں آیا تھا بلکہ کھنڈوہ کے مرن گھاٹ کھنڈر میں
رہنے والی آسیبی عورت کامنی نرتکی کی مدد سے اسے پاتالی چڑیل کے ہلاکت خیز آسیب سے
نجات ملی تھی۔ مجھے چونکہ سارا دن اپنی اکبری منڈی والی دکان پر بیٹھے رہنا پڑتا تھا اور چلنے
پھرنے کا موقع بہت کم ملتا تھا' اس لئے والد صاحب کے بعد میں نے بھی اپنی یہ عادت بنالی
تھی کہ صبح منہ اندھیرے دریائے راوی کی طرف سیر کرنے نکل جاتا تھا۔ ہمارا آبائی مکان بھی
اکبری منڈی میں ہی تھا۔ میں منہ اندھیرے اذان کے وقت سیر کرنے دریا پر چلا جاتا۔
موسم گرمیوں کا ہوتا تو وہیں دریا پر نہاتا اور سورج نکلنے کے ساتھ ہی گھر واپس آ جاتا۔ یہ
میرا معمول بن چکا تھا۔

اب تو راوی روڈ اور دریا کا نقشہ ہی بدل چکا ہے قیامِ پاکستان سے پہلے دریا پر ہندو مرد
اور ہندو سکھ عورتیں بھی نہانے کے لئے آیا کرتی تھیں۔ دریائے راوی کے اس طرف

والے کنارے پر اس زمانے میں ایک چھوٹا سا مندر ہوا کرتا تھا۔ دریا کے کٹاؤ کی وجہ سے وہ دریا برد ہو گیا اور اب اس کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا۔ یہ چھوٹا سا مندر دریائے راوی کا ذخیرہ گزرنے کے بعد دریا کنارے ہوا کرتا تھا۔ صبح صبح میں سیر کرنے وہاں سے گزرتا تو مندر میں سے عورتوں مردوں کے بھجن کرنے اور چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں بجنے کی آواز آیا کرتی تھی۔ ہمارے لئے یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ لاہور میں پاکستان بننے سے پہلے مندروں میں ہندو لوگ پوجا پاٹھ کیا ہی کرتے تھے، گھنٹیاں بھی بجا ہی کرتی تھیں۔ میرا دوست خالد مصری شاہ کے علاقے میں رہتا تھا۔ صبح وہی اکبری منڈی آ کر دکان کھو
تھا۔ میں بعد میں دکان پر آتا تھا۔ اس زمانے میں انارکلی اور اکبری منڈی کی دکانیں صبح ص
ہی کھل جایا کرتی تھیں۔

آج کامران کی تاریخی بارہ دری بھی دریا کے کافی اندر چلی گئی ہے۔ جس زمانے کی م
بات کر رہا ہوں، اس زمانے میں یہ بارہ دری دریا کے اس کنارے پر ہوا کرتی تھی اور ا
بارہ دری کے قریب ہی ٹاہلی کے درختوں کے ذخیرے میں کسی تاریخی عمارت کا ویران ا
شکستہ کھنڈر ہوا کرتا تھا۔ لوگ اس کھنڈر کی اینٹ پتھر اٹھا اٹھا کر لے گئے تھے۔ اب صر
کھنڈر کی ایک ڈیوڑھی اور ایک کوٹھڑی ہی باقی رہ گئی تھی۔

مجھے صبح کے وقت ہلکی ورزش کرنے کی عادت تھی۔ دریا کنارے والے مندر کے
ہی ایک اکھاڑہ تھا جہاں پہلوانی کے شوقین نوجوان کسرت کیا کرتے تھے۔ میں بھی
اکھاڑے کے باہر تھوڑی بہت ورزش کر لیتا تھا۔ ایک روز صبح کی سیر اور ورزش
فارغ ہو کر میں اپنے گھر اکبری دروازے جانے کے لئے مندر کے قریب سے گزرا تو ساڑھی والی لڑکی نے جو مندر کے باہر کھڑی تھی، مجھے اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ میں سمجھا کہ وہ میرے پیچھے کھڑے کسی اپنے واقف کار کو بلا رہی ہے۔ میں نے گردن
کر دیکھا۔ پیچھے کوئی نہیں تھا۔ اتنے میں لڑکی چل کر میرے پاس آ گئی۔ اس کے ہاتھ
کاغذ کا ایک پرچہ سا تھا۔ کہنے لگی:

"بابو! کیا تم انگریزی پڑھ لیتے ہو؟"

میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں نے اتنی حسین عورت اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ گورا رنگ تھا، سیاہ گھٹاؤں ایسے بال تھے، جن کا آس نے جوڑا کر رکھا تھا۔ جوڑے میں موتیے کے پھول سجے ہوئے تھے۔ بڑی بڑی شربتی آنکھیں تھیں۔ آواز ایسی تھی جیسے دور گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ اس کے حسن و جمال نے مجھ پر ایک طلسم سا کر دیا۔ میں نے کہا:

"ہاں۔ میں انگریزی پڑھ لیتا ہوں۔"

اس کی عمر اٹھارہ انیس سال کے درمیان ہو گی۔ اس نے ہاتھ میں تھاما ہوا پرچہ میری طرف بڑھایا اور کہا:

"یہ ذرا پڑھنا۔ اس پر کیا لکھا ہوا ہے؟"

میں نے کاغذ کو غور سے دیکھا۔ انگریزی زبان میں کاغذ پر ایک عورت کا نام شیاما دیوی اور نیچے اس کے گھر کا پتہ لکھا تھا۔ یہ منگلا قصبے کا پتہ تھا جو جہلم کے قریب واقع ہے۔ میں نے پتہ پڑھ کر لڑکی کو سنا دیا۔ لڑکی نے کاغذ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ میری طرف مسکرا کر دیکھا اور بولی:

"تمہارا شکریہ بابو! میرا نام رام پیاری ہے۔ میں بنارس سے لاہور میں مندروں کی یاترا کرنے آئی ہوں۔ منگلا میں میری ایک سہیلی رہتی ہے، یہ اس کے گھر کا پتہ ہے۔ میں انگریزی نہیں پڑھ سکتی۔ اس لئے تم کو تکلیف دی۔"

میں نے کہا۔ "اس میں تکلیف کی کونسی بات ہے۔"

رام پیاری میری طرف تجسس آمیز نگاہوں سے دیکھ رہی تھی اور اس کا بے پناہ حسن و جمال مجھے اپنے طلسم کے حصار میں لے رہا تھا۔ کہنے لگی:

"میں کبھی منگلا نہیں گئی۔ وہاں میں منگلا دیوی کے مندر کی یاترا بھی کرنا چاہتی ہوں۔ میری سہیلی نے کہا تھا کہ لاہور سے تمہیں منگلا جانے والی لاری مل جائے گی۔ یہ لاری کہاں سے جاتی ہے؟"

رام پیاری کے حسن نے میرے خیالات کو منتشر کر دیا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو نارمل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "لاہور میں کراؤن بس کا اڈہ ہے۔ وہاں سے تمہیں

جہلم جانے والی بس مل جائے گی، جہلم اتر جانا۔ وہاں سے منگلا کو لاریاں جاتی رہتی ہیں۔"

رام پیاری نے ایک بار گہرا سانس لیا اور بولی:

"مجھے اکیلی بس میں سفر کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے' یہ بات مجھے کہنے کا کوئی حق تو نہیں ہے لیکن اگر تم مجھے صرف جہلم شہر تک چھوڑ آؤ تو تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔ آگے میں منگلا جانے والی بس میں خود ہی بیٹھ جاؤں گی۔"

اس لڑکی کے حسن و جمال نے مجھ پر ایک جادو سا کر دیا تھا۔ میرے خیالات میں ایک انقلاب برپا ہو چکا تھا۔ عقل نے میرا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اس وقت میرے دل میں صرف ایک ہی خواہش تھی کہ یہ لڑکی مجھ سے کبھی جدا نہ ہو۔ میں نے فوراً حامی بھر لی اور کہا "اس میں مہربانی کی کیا بات ہے۔ میں بڑی خوشی سے تمہیں جہلم تک چھوڑ آتا ہوں۔"

لڑکی نے مسکراتے ہوئے اپنے بالوں کو جھٹک کر ماتھے سے پیچھے کیا اور بولی۔ "کیا اس وقت ہمیں جہلم جانے والی لاری مل جائے گی؟"

میں نے کہا۔ "اڈے سے لاریاں چلتی ہی رہتی ہیں۔ مجھے صرف اتنی اجازت دو کہ میں گھر جا کر کپڑے بدل لوں۔"

وہ مسلسل مسکرا رہی تھی اور مجھ پر اپنے حسن کی بجلیاں گرا رہی تھی۔ کہنے لگی "ٹھیک ہے بابو! تم کپڑے بدل کر یہاں آ جانا، میں اسی جگہ تمہیں ملوں گی۔"

اس نے بڑی محبت سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ذرا سا دبایا۔ میرے اندر تھوڑی بہت عقل باقی رہ گئی تھی وہ بھی بھاپ بن کر اڑ گئی۔ میں لڑکی کو مندر میں چھوڑ کر راوی روڈ پر آ گیا۔ وہاں سے ایک تانگہ لے کر اکبری منڈی اپنے گھر پہنچ گیا۔ عاصمہ کی شادی اور والدین کی وفات کے بعد میں گھر میں اکیلا ہی رہتا تھا۔ مجھے کوئی پوچھنے والا نہ تھا کہ کہاں جا رہا ہوں؟ کیوں جا رہا ہو؟ جلدی جلدی کپڑے بدلے۔ کچھ روپے اور کچھ نوٹ جیب میں ڈالے اور تانگے میں بیٹھ کر راوی روڈ کی طرف چل پڑا۔

رام پیاری مندر کی ڈیوڑھی کے باہر ایک جگہ بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور بڑے ہمدردانہ انداز میں بولی: "بابو! میں نے تمہیں بڑی تکلیف دی ہے۔ سوچ رہی ہوں کہ تم مجھے صرف لاری میں چڑھا دو۔ آگے میں اکیلی چلی جاؤں گی۔"

لیکن میری عقل اس وقت مجھے جواب دے چکی تھی۔ عورت کے حسن نے بڑے بڑے فرہادوں' رانجھوں اور مجنوؤں کو دیوانہ بنا دیا تھا۔ میں تو ان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ اگر میں اس عورت سے جدا ہو گیا تو میری زندگی میں ایک ایسا خلا پیدا ہو جائے گا جو کبھی پر نہیں ہو سکے گا۔ میں نے فوراً کہا:

"نہیں نہیں رام پیاری جی! میں تمہیں اب منگلا تک چھوڑ کر آؤں گا۔ زمانہ بڑا خراب ہے، تمہیں اکیلی سفر نہیں کرنا چاہیے۔ آؤ میرے ساتھ۔"

ہم کراؤن بس کے اڈے پر آ گئے' جو اس زمانے میں گڑھی شاہو کے چوک میں ہوا کرتا تھا۔ دن کافی نکل آیا تھا۔ تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد ہمیں جہلم جانے والی لاری مل گئی۔ رام پیاری کو میں نے کھڑکی کے پاس بٹھایا اور خود اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ جب سے یہ لڑکی مجھے ملی تھی' اس کے جسم سے مسلسل ایک بڑی دھیمی اور خوابوں کی دنیا میں لے جانے والی خوشبو آ رہی تھی۔ اب جب وہ لاری میں میرے بالکل ساتھ لگ کر بیٹھی تو

مجھے اس کے جسم سے اس طرح کا سینک یعنی حرارت سی نکل کر میرے جسم سے ٹکرا
محسوس ہوئی جیسے اسے بخار چڑھا ہوا ہو۔ اس کے بدن کی حرارت برابر خارج ہو کر میر
جسم میں داخل ہو رہی تھی۔ مَیں نے اس سے پوچھ ہی لیا:

"تمہارا بدن بڑا گرم ہے۔ تمہیں بخار تو نہیں ہے؟"

رام پیاری نے مسکراتی ہوئی طلسمی نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور میرے ہاتھ
اپنا گرم ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

"مَیں بالکل ٹھیک ہوں بابو۔"

لاری جہلم کی طرف چل پڑی۔ رام پیاری کا گرم جسم میرے جسم کے بالکل سا
ہوا تھا۔ راستے میں دو ایک بار مجھے محسوس ہوا کہ رام پیاری اپنے جسم کا بوجھ مجھ پر
رہی ہے۔ بجائے اس کے کہ مَیں عقل سے کام لیتے ہوئے یہ سوچتا کہ یہ کوئی غلط
والی عورت نہ ہو' مَیں الٹا اس کے جسم کے دباؤ اور حرارت سے لطف اندوز ہو
اس میں میرا بھی کوئی قصور نہیں تھا۔ مَیں نوجوان تھا' صحت مند تھا' خوش شکل بھی
رگوں میں جوانی کا خون بڑے زوروں سے گردش کر رہا تھا۔ میرے ساتھ ایک خوبصورت
لڑکی میرے جسم کے ساتھ جسم لگا کر بیٹھی ہوئی تھی۔

میری مت نہ ماری جاتی تو اور کیا ہوتا۔

دوپہر سے ذرا پہلے لاری جہلم پہنچ گئی۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ بسوں کے اڈ
ہی ایک چھوٹا سا ریستوران تھا۔ میں نے رام پیاری سے کہا۔

"میرا خیال ہے یہاں کچھ کھا پی لیتے ہیں۔"

لڑکی نے مسکراتی آنکھوں کے ساتھ مجھے دیکھا اور بولی۔ "جیسے تمہاری مرضی با
یہ لڑکی اتنی خوبصورت تھی کہ جو کوئی قریب سے گزرتا اسے نگاہ بھر کر ضر
تھا۔ کاسنی رنگ کی ساڑھی میں اس کا حسن اور زیادہ نکھر آیا تھا۔ ہم ریستوران
بیٹھ گئے۔ مجھے معلوم تھا کہ بعض ہندو لوگ گوشت سے پرہیز کرتے ہیں اور صرف

کاری ہی کھاتے ہیں۔ ایسے لوگ ہندوؤں کے ویشنو فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں
نے لڑکی سے پوچھا:

"تمہارے لئے کونسی سبزی منگواؤں؟"

وہ ہنس دی۔ مترنم آواز میں بولی:

"میں گوشت بڑے شوق سے کھاتی ہوں۔ میں ماڈرن زمانے کی لڑکی ہوں۔"

میں نے بھنی ہوئی مرغ کی دو پلیٹیں منگوا لیں' ساتھ تنور کی روٹیاں تھیں' سلاد بھی
لوا لیا۔ ہم کھانا کھانے لگے۔ میں نے محسوس کیا کہ اس لڑکی کو واقعی گوشت کھانے کا
ت شوق تھا۔ وہ اس طرح مرغی کا گوشت کھا رہی تھی' جیسے اسے بڑے عرصے بعد
وشت کھانا نصیب ہوا ہو۔ کھانے کے بعد ہم چائے منگوا کر پینے لگے۔ میں نے لڑکی سے
پوچھا:

"میں حیران ہوں۔ تم بنارس سے اکیلی کیسے لاہور آ گئیں؟"

اس نے کہا:

"لاہور تک میرے ساتھ ایک عورت بھی آئی تھی۔ مگر اسے آگے سندھ جانا تھا۔"

"تمہارے ماتا پتا بنارس ہی میں رہتے ہیں کیا؟"

"میرے ماتا پتا سورگباش ہو چکے ہیں۔" اس نے کہا۔

یعنی اس کے ماں باپ وفات پا چکے تھے۔ کہنے لگی:

"میں لڑکیوں کے ہوسٹل میں رہتی ہوں۔ میری ایک ماسی بھی بنارس میں رہتی ہے۔
مگر میں اکیلی رہنا چاہتی تھی۔"

میں نے کہا۔ "تم نے مجھ سے نہیں پوچھا کہ میں کون ہوں۔ ہندو ہوں یا مسلمان
ہوں۔ شادی شدہ ہوں یا شادی شدہ نہیں ہوں۔ تم نے تو مجھ سے میرا نام بھی نہیں
پوچھا؟"

رام پیاری نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے بابو؟ میں مندر کے باہر اس لئے کھڑی تھی کہ جو آدمی مجھے اچھا لگے گا اس سے انگریزی میں لکھا ہوا پتہ پڑھوا لوں گی؟"

میں نے کہا۔ "تم اتنی ماڈرن لڑکی ہو لیکن تعجب ہے کہ تم انگریزی نہیں پڑھ سکتیں؟"

لڑکی کہنے لگی۔ "میرا گھرانہ برہمنوں کی اونچی ذات کا گھرانا ہے۔ ہمیں صرف ہند اور سنسکرت پڑھائی جاتی ہے وہ بھی گھر پر ہی پڑھائی جاتی ہے۔"

میں خاموشی سے چائے پینے لگا۔ لڑکی نے پوچھا۔ "میں نے تمہیں اپنا نام بتا دیا ہے۔ نے مجھے اپنا نام نہیں بتایا۔"

میں نے کہا۔ "میرا نام سلیم ہے۔ ظاہر ہے میں مسلمان ہوں۔ اکبری منڈی میں غلـ کاروبار کرتا ہوں۔"

لڑکی نے چائے کی پیالی میز پر رکھ دی اور میرے ہاتھ پر اپنا گرم ہاتھ رکھتے ہو بڑے جذباتی انداز میں کہا:

"سلیم بابو! تم مجھے بڑے اچھے لگتے ہو۔ مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ہم پہلے جنم ہی ایک دوسرے سے مل چکے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "مَیں مرنے کے بعد دوبارہ جنم لے کر دنیا میں آنے کا قائل ہوں۔"

لڑکی نے آہ بھر کر کہا:

"کوئی بھی مسلمان پتر جنم کا قائل نہیں ہے، لیکن میں اسے مانتی ہوں۔ آواگون پتر جنم ہمارے ہندو مذہب کا اٹوٹ انگ ہے۔"

میرے دماغ میں اس لڑکی رام پیاری کا ایک ہی جملہ بار بار گونج رہا تھا۔ "سلیم با مجھے بڑے اچھے لگتے ہو۔" سلیم بابو تم مجھے بڑے اچھے لگتے ہو۔ یہ وہ جملہ تھا، جس سـ تک میرے کان ناآشنا تھے اور جسے سننے کے لئے میرے کان ترس گئے تھے۔ میں نـ

پیاری کی طرف ذرا سا جھکتے ہوئے کہا:

"تم بھی مجھے بڑی اچھی لگتی ہو رام پیاری!"

رام پیاری نے اپنا ایک ہاتھ ابھی تک میرے ہاتھ کے اوپر رکھا ہوا تھا۔ مجھے اس کے جسم کی حرارت اپنے جسم میں داخل ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے میرے ہاتھ کو ذرا سا دبایا اور بولی:

"کہیں اس کا نام پریم تو نہیں ہے سلیم بابو؟"

"ہاں۔" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"ہاں رام پیاری! اسے پریم ہی کہتے ہیں۔ یہ پہلی نظر کا پریم ہے۔"

رام پیاری مجھ سے زیادہ جذباتی ہو رہی تھی۔ اس نے سرد آہ بھر کر پوچھا۔ "تم مجھ سے پریم کرتے ہو ناں؟"

میں اس سے زیادہ جذباتی ہو رہا تھا۔ عقل کا تھوڑا سا دامن جو میرے ہاتھ میں رہ گیا تھا۔ اب وہ بھی ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ رام پیاری کے ہاتھ کے نیچے سے کھینچ کر اس کے ہاتھ کو تھام لیا اور کہا:

"مجھے تو تم سے اسی وقت پریم ہو گیا تھا جب میں نے تمہیں مندر کے باہر پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔"

ایک بات کی وضاحت میں یہاں ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ انگریزوں کی حکومت کا زمانہ تھا اور بڑی آزادی ہوا کرتی تھی۔ عورت مرد ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر بازاروں میں چلتے تھے اور اسے بالکل معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ جب میں نے رام پیاری کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا تو ریسٹوران میں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کسی نے ہماری طرف حیرانی سے نہیں دیکھا تھا۔

رام پیاری نے اپنا ہاتھ آہستہ سے کھینچ لیا اور اداس لہجے میں بولی۔ "اس پریم کا کوئی فائدہ نہیں سلیم بابو! تم مجھے منگلا میں چھوڑ کر لاہور چلے جاؤ گے۔ میں منگلا دیوی کے مندر

کی یاترا کر کے بنارس واپس چلی جاؤں گی۔ پھر نہ جانے ہماری دوبارہ ملاقات ہو یا نہ ہو۔"

اس وقت محبت بھرے جذبات کا سیلاب مجھے بہائے لئے جا رہا تھا۔ میں نے محبت کے سمندر میں چھلانگ لگا دی تھی اور میری عقل دور کھڑی میرا تماشہ دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا:

"رام پیاری! یہ محبتوں کے ملاپ ہیں۔ تم کہاں پر پیدا ہوئیں' میں کہاں پیدا ہوا' کتنے فاصلے تھے ہمارے درمیان' کتنے فاصلے اب بھی ہمارے درمیان ہیں۔ لیکن تقدیر ہمیں کھینچ کر ایک دوسرے کے قریب لے آئی ہے۔"

رام پیاری ٹھنڈا سانس بھر کر بولی:

"سلیم بابو! کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم آج کے بعد دوبارہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔"

میں تو محبت کے اندھے جذباتی کنوئیں میں اتر چکا تھا۔ میں رام پیاری سے زیادہ جذباتی ہو رہا تھا۔ میں نے کہا:

"ایسا نہیں ہو گا رام پیاری! دنیا خواہ کچھ کہے۔ ہم اب کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے۔"

رام پیاری کا حسین چہرہ محبت بھرے جذبات سے کنول پھول کی طرح کھل اٹھا تھا۔ کہنے لگی:

"تو پھر مجھ سے وعدہ کرو کہ تم میرے ساتھ بنارس جاؤ گے۔ وہاں میری ایک کرسچین سہیلی کا گھر ہے۔ وہ بڑے آزاد خیال لوگ ہیں۔ میں اپنے ہوسٹل سے تمہیں وہاں ملنے آیا کروں گی۔ ہم جتنی دیر چاہیں وہاں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ میں وہاں تمہیں ہندو ظاہر کروں گی اور اپنی سہیلی کو بتا دوں گی کہ ہم بہت جلد ایک دوسرے سے شادی کرنے والے ہیں۔ کیا تم میرے ساتھ بنارس چلو گے۔ بے شک دس پندرہ دن کے لیے ہی چلے چلو۔ سلیم بابو! یہ دس پندرہ دن میرے جیون کے' میری زندگی کے بڑے یادگار دن ہوں

ے۔ میں اپنی ساری زندگی ان خوبصورت دنوں کی یاد میں گزار لوں گی۔"

میں خود رام پیاری سے الگ نہیں ہونا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔ "یہ تو بنارس شہر ہے۔ اگر اپنے ساتھ مجھے دوزخ میں بھی لے جاؤ گی تو میں انکار نہیں کروں گا۔"

اس لڑکی کی محبت بھی اب کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ اس نے محبت سے چھلکتے ہوئے لہجے میں کہا:

"سلیم بابو! اب مجھے منگلا دیوی کے مندر کی یاترا کی ضرورت نہیں رہی۔ میری پریم ترا پوری ہو گئی ہے۔ ہم یہیں سے واپس لاہور جائیں گے اور لاہور سے بنارس چلے ائیں گے۔ کیا تم میرے ساتھ جا سکو گے؟ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟"

میں نے اس سے بڑھ کر جذبات ہو کر کہا۔

"محبت مجھے آواز دے اور میں اس کی طرف نہ بڑھوں؟ میں ایسی بیوقوفی کبھی نہیں کر سکتا۔ اب جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ میں تمہارا ہوں' تم میری ہو۔ میں تمہارے ساتھ بنارس ضرور جاؤں گا۔"

میں نے کھانے وغیرہ کا بل ادا کیا۔ تھوڑی دیر بعد ہمیں لاہور جانے والی لاری مل گئی۔ ہم اس میں سوار ہو کر لاہور کی طرف روانہ ہو گئے۔ لاہور پہنچتے پہنچتے ہمیں شام ہو گئی۔ میں رام پیاری کو اپنے گھر نہیں لے جا سکتا تھا۔ رام پیاری اپنے ساتھ ایک اٹیچی کیس لائی تھی جو اس نے دریائے راوی کے ذخیرے والے مندر میں رکھا ہوا تھا۔ ہم تانگے میں بیٹھ کر مندر میں گئے اور اٹیچی کیس وہاں سے اٹھا لائے۔ روپے پیسے کی میرے پاس کوئی کمی نہیں تھی۔ میں نے رام پیاری سے کہا:

"یہاں لاہور میں ایک بڑا پرسکون اور اچھا ہوٹل ہے۔ اس ہوٹل کا مالک انگریز ہے۔ میں تمہیں وہاں ایک کمرہ لئے دیتا ہوں۔ تم آج کی رات وہاں قیام کرو۔ اس دوران میں بھی دکان کا کام کسی کے سپرد کر دوں گا۔ ہم کل بنارس روانہ ہو جائیں گے۔"

رام پیاری تانگے میں بالکل میرے ساتھ لگ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے بدن سے

نکلتی ہوئی حرارت اب مجھے ایک نئی قوت اور توانائی عطا کر رہی تھی۔ کہنے لگی:

"اب تم میرے سوامی ہو۔ تم جیسا کہو گے ویسا ہی کروں گی۔ جس حال میں رکھو گے اس حال میں ہی رہوں گی۔"

ان جملوں نے مجھ پر ایک نشہ سا طاری کر دیا۔ میں تانگہ لے کر نیڈوز ہوٹل میں گیا۔

قیام پاکستان سے پہلے نیڈوز ہوٹل لاہور میں اس جگہ پر ہوا کرتا تھا' جہاں اب آوار ہوٹل ہے۔ یہ لاہور سٹیشن کے سامنے والے برگنزا ہوٹل کے بعد لاہور کا اس زما میں سب سے مہنگا ہوٹل تھا۔ لیکن ان دنوں ہوٹلوں کی ساکھ بڑی اچھی تھی۔ کچھ روپے میرے پاس ہی تھے۔ میں نے نیڈوز ہوٹل کا ایک کمرہ کرائے پر لے لیا۔ رام پیاری کو ہوٹل میں بٹھایا۔ خود اکبری منڈی اپنی دکان پر آ گیا۔ دکان ابھی کھلی تھی۔ میرا دوست خالد اور دونوں ملازم دکان پر ہی تھے۔ میں نے خالد سے کہا:

"مجھے ایک ضروری کام کے سلسلے میں کراچی جانا پڑ گیا ہے۔ ہو سکتا ہے مجھے وہاں کچھ دن لگ جائیں۔ تم پیچھے کاروبار کی دیکھ بھال کرتے رہنا۔"

خالد کہنے لگا:

"اصل بات کیا ہے؟ مجھے بتاؤ! تم آج بھی دکان پر نہیں آئے۔ دن بھر غائب ر ہو۔"

میں نے کہا۔ "ایسی پریشان ہونے والی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے بتا دیا ناں کاروباری سلسلے میں جا رہا ہوں۔"

خالد نے اس کے بعد کوئی سوال نہ کیا۔ خاموش رہا۔ وہاں سے میں سیدھا اپنے گھر گیا جو دکان سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے نہا دھو کر کپڑے تبدیل کیے۔ ایک اٹ کیس میں کچھ کپڑے اور دوسرا ضروری سامان رکھا۔ مکان کو تالا لگا دیا اور تانگے میں ب کر نیڈوز ہوٹل آ گیا۔

اس وقت رات ہو چکی تھی۔ رام پیاری نے کمرے کو اندر سے کنڈی لگا رکھی تھی۔ ں نے آہستہ سے دستک دی۔ اس نے پوچھا۔

"کون ہے؟"

میں نے کہا۔ "میں ہوں۔ سلیم۔"

اس نے دروازہ کھول دیا۔ میں اندر داخل ہوا تو وہ بے اختیار مجھ سے لپٹ گئی اور ی ہوئی آواز میں بولی:

"میرے سوامی! مجھے اس طرح اکیلی چھوڑ کر نہ جایا کرو۔ تمہارے بغیر مجھے بڑا ڈر لگتا ہے۔"

رام پیاری کا جسم گرم ہو رہا تھا۔ اس کے جسم سے نکلتی اس حرارت کو میں نے اسی ت محسوس کر لیا تھا جب وہ پہلی بار میرے قریب ہوئی تھی۔ میں نے اسے پیار کر کے ہا:

"میں تو تم سے تھوڑی دیر کے لئے الگ ہوا تھا۔ یہ دیکھو' میں اٹیچی کیس لینے گیا تھا۔ ب تمہارے ساتھ ہی رہوں گا۔"

رام پیاری نے میرے گلے میں بانہیں ڈال رکھی تھیں۔ کہنے لگی۔ "وچن دو کہ تم ھے چھوڑ کر کبھی نہیں جاؤ گے۔"

اس وقت میرے دماغ پر محبت کا جن سوار تھا اور پھر وچن دینے یعنی وعدہ کرنے میں کوئی قباحت بھی نہیں تھی۔ میں نے کہہ دیا۔ "میں وچن دیتا ہوں رام پیاری کہ تم سے کبھی الگ نہیں ہوں گا۔"

وہ دیوانہ وار مجھ سے چمٹ گئی۔ نوجوان لڑکی تھی۔ ایسا متناسب جسم اور جسم کے دلکش خطوط جو رام پیاری کے تھے' میں نے کبھی کسی عورت کے نہیں دیکھے تھے۔ ایسے لگتا تھا کہ بنانے والے نے اسے بڑی محنت اور محبت سے بنایا ہے۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے جلدی سے رام پیاری کو الگ کر دیا۔ وہ اپنی

ساڑھی ٹھیک کرتی ہوئی صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ ہوٹل کے بیرے
نے اندر آکر پوچھا۔

"صاحب! کھانا کس وقت کھائیں گے؟"

میں نے کہا۔ "ایک گھنٹے تک لے آنا۔"

"اوکے سر!"

بیرا چلا گیا۔ میں رام پیاری کے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔ میں دکان کی تجوری میں
سے پانچ ہزار کے قریب کرنسی نوٹ نکال کر لے آیا تھا۔ جن میں سے آدھے میری جیکٹ
کی جیب میں تھے۔ باقی میں نے اٹیچی کیس میں رکھے ہوئے تھے۔

میں نے رام پیاری سے کہا:

"اگر تم نے اپنے لئے کوئی ساڑھی وغیرہ یا کوئی دوسری چیز خریدنی ہو تو میرے ساتھ
انار کلی چلو۔ دکانیں ابھی کھلی ہیں۔"

رام پیاری نے میری کمر کے گرد بازو حمائل کر کے اپنا سر میرے کندھے کے ساتھ
دیا اور بولی:

"مجھے تمہارے سوا کچھ نہیں چاہیے میرے سوامی۔"

ایامِ شباب میں ہی نہیں، کسی بھی عمر میں کوئی عورت اگر کسی مرد سے یہ کہہ دے
میں تم پر جان دیتی ہوں اور تمہارے سوا مجھے دنیا کی کسی چیز کی حاجت نہیں ہے تو ایک
اس کا دماغ بھی ضرور خراب ہو جاتا ہے اور وہ خیالی جنت کی فضاؤں میں پرواز کرنے
ہے۔ جوانی میں تو وہ کسی خوبصورت لڑکی سے اس قسم کا اظہارِ محبت سن کر اتنی بلند
اڑنے لگتا ہے کہ کسی کے ہاتھ نہیں آتا۔

میں نے کمرہ مسٹر اینڈ مسز سلیم بٹ کے نام پر لیا تھا اور ایڈریس ملتان کا لکھوا دیا تھا
فرضی ایڈریس تھا۔ کھانا آگیا۔ رام پیاری نے خاص طور پر بھنا ہوا گوشت اور کباب
رغبت سے کھائے۔ میں نے جہلم کے ریستوران میں بھی اسے اتنی رغبت اور شوق

گوشت کھاتا دیکھ کر حیران ضرور ہوا تھا کہ یہ لڑکی ہندو ہوتے ہوئے اتنے شوق سے
گوشت کھا رہی ہے کہ اتنے شوق سے کوئی مسلمان مرد بھی نہیں کھاتا۔ محبت نے میری
سوچنے سمجھنے کی قوت کو ایک ایسا انجکشن لگا دیا ہوا تھا کہ میں رام پیاری کے خلاف کچھ
سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہی خیال آیا کہ ہو سکتا ہے رام پیاری کے فرقے
کے لوگ گوشت شوق سے کھاتے ہوں۔ کھانا کھانے کے بعد ہم نے کافی منگوا کر پی۔ کچھ
دیر پیار و محبت کی باتیں کرتے رہے۔

جب رات گہری ہونے لگی تو رام پیاری نے میرے پہلو سے اٹھتے ہوئے کہا:

"میں رات کو اشنان کر کے سوتی ہوں۔ تم بھی اشنان کر لینا۔"

اشنان کا مطلب غسل کرنا ہوتا ہے۔ میں کبھی رات کو نہا کر نہیں سویا تھا۔ لیکن رام
پیاری نے کہا تو میں نے کہا:

"میں بھی اشنان کر لوں گا۔"

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ پھر اپنے اٹیچی کیس میں سے اس نے شب خوابی کا
ریشمی پاجامہ اور ریشمی قمیض نکالی اور مسکراتی ہوئی باتھ روم میں چلی گئی۔ میں صوفے پر
بیٹھا لاہور سے شائع ہونے والا انگریزی کا اخبار "ٹریبیون" پڑھتا رہا۔ وہ نہا کر غسل خانے
سے نکلی تو اس نے شب خوابی کا ریشمی لباس پہن رکھا تھا۔ بال کھلے تھے جنہیں وہ تولیے
سے خشک کر رہی تھی۔ کہنے لگی:

"جاؤ سوامی جی! اب تم اشنان کر لو۔"

میں نے بھی اپنے اٹیچی کیس میں سے رات کو پہننے والا کرتہ پاجامہ نکالا اور باتھ روم
میں گھس گیا۔ اس زمانے میں آدمیوں میں شلوار پہننے کا ابھی اتنا رواج نہیں ہوا تھا۔ لوگ
زیادہ تر گرمیوں میں کرتہ اور ذرا چوڑی مہری والا لٹھے کا پاجامہ ہی پہنتے تھے۔ کرتہ بغیر کالر
کے ہوتا تھا۔ میں نہانے کے بعد باہر نکلا تو رام پیاری شب خوابی کے ریشمی لباس میں
ملبوس اپنے بالوں میں کنگھی پھیر رہی تھی۔ اس نے کوئی بڑا ہی طلسمی پرفیوم لگا رکھا تھا۔

کمرہ اس پرفیوم کی دھیمی دھیمی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ مَیں اس کے پاس بیٹھ گیا۔
نے اس سے پوچھا:

"یہ کونسی خوشبو تم نے لگائی ہے۔ یہ ایوننگ اِن پیرس نہیں لگتی۔"

اس زمانے میں سب سے مشہور پرفیوم ایوننگ ان پیرس ہی ہُوا کرتی تھی۔ رام پیا
نے کہا:

"یہ میری ایک سہیلی نے امریکہ سے مجھے بھیجی تھی۔ سنگھار میز پر اس کی شیشی
ہے۔ تم بھی جا کر لگا لو۔"

مَیں اٹھ کر سنگھار میز کے پاس گیا۔ وہاں کریم اور پاؤڈر کی شیشیوں کے علاوہ گہ
سبز رنگ کی چھوٹی سی گول شیشی پڑی تھی‘ جس کے باہر ہوا میں اڑتی ہوئی کسی پر
تصویر بنی ہوئی تھی۔ مَیں نے اس کا ڈھکن کھول کر سونگھا۔ بڑی گہری اور پُراسرا
خوشبو تھی۔ مَیں نے تھوڑی خوشبو لگالی اور واپس آ کر صوفے پر رام پیاری کے ساتھ
گیا۔ میز پر ایک پلیٹ میں سنگترے اور دو چار سیب پڑے تھے۔ چھری بھی ساتھ ہی
ہوئی تھی۔ مَیں نے کہا۔

"سیب کھانے کو جی چاہتا ہے۔"

اور مَیں نے چھری سے سیب چھیل کر اسے کاٹا تو چھری میری انگلی پر لگ گئی۔ ایک
سا کٹ لگ گیا اور وہاں سے خون نکلنے لگا۔ رام پیاری نے "ہے بھگوان" کہہ کر
انگلی پکڑ کر منہ میں ڈال لی اور خون چوس لیا۔ مَیں نے کہا:

"کوئی بات نہیں میری جان! ذرا سا زخم ہُوا ہے‘ اپنے آپ ٹھیک ہو جائے گا۔"

مگر رام پیاری برابر میری انگلی منہ میں ڈالے خون چوس رہی تھی۔ آخر مَیں
باہر کھینچ لی۔ رام پیاری نے کہا۔

"میرے سوامی! تمہاری جگہ مجھے زخم لگ جاتا۔ مَیں تمہارا خون بہتے نہیں
سکتی۔"

اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے جلدی سے اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور
کہا:

"اس میں رونے کی بھلا کیا بات ہے؟"

"نہیں نہیں میرے سوامی! تمہاری ذرا سی بھی تکلیف نہیں دیکھ سکتی۔"

میری انگلی پر جہاں چھری لگی تھی‘ پھر تھوڑا سا خون اُبھر آیا تھا۔ رام پیاری نے جلدی
سے میری انگلی دوبارہ منہ میں ڈالی اور خون چوس لیا۔ اس دفعہ میں نے اپنا سفید رومال
تھوڑا سا پھاڑ کر انگلی پر پٹی بنا کر باندھ لیا۔ رام پیاری نے اپنی بانہیں میرے گلے میں ڈال
دیں اور آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آواز میں کہا:

"سوامی! اب مَیں تمہیں کبھی سیب نہیں کاٹنے دوں گی۔"

مَیں نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا:

"اچھا! اب مَیں کبھی سیب نہیں کاٹوں گا۔ پھر اس نے میری طرف بڑی عقیدت مند
نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"سوامی! تمہیں پہلی بار دیکھ کر مجھے یہی خیال آیا تھا کہ تم آکاش کی کوئی مخلوق ہو۔
جانتے ہو‘ تمہارے خون کا ذائقہ میٹھا ہے۔ ہمارے ویدوں میں لکھا ہے کہ میٹھا خون
صرف دیوتاؤں کا ہوتا ہے۔ تم بھی دیوتا ہو جو انسانوں کی بھلائی کی خاطر انسانی روپ میں
دنیا میں ظاہر ہو گیا ہے۔"

وہ دیر تک اِسی قسم کی محبت اور عقیدت بھری بارش کرتی رہی۔ جب کمرے میں لگے
ہوئے کلاک نے رات کا ایک بجایا تو مَیں نے کہا:

"رام پیاری! جاؤ تم پلنگ پر سو جاؤ۔ مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔ میں یہاں صوفے پر سو
جاؤں گا۔"

رام پیاری تو کانوں کو ہاتھ لگانے لگی:

"تم دیوتا سمان ہو سوامی! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مَیں پلنگ پر سوؤں اور تم یہاں صوفے

پر لیٹ کر رات گزارو، نہیں نہیں مجھ سے یہ مہاپاپ نہیں ہو گا۔ تم پلنگ پر سوؤ گے ا مَیں تمہارے قدموں میں بیٹھ کر ساری رات تمہارے پاؤں دباؤں گی۔"

اور اس نے ایسا ہی کیا۔ مجھے اٹھا کر زبردستی پلنگ پر لٹا کر میرے اوپر پتلا سا ریشمی ک ڈال دیا۔ خود پلنگ کی پائنتی کی طرف بیٹھ گئی اور میرے پاؤں دبانے لگی۔ میں نے ا بہترا منع کیا، پاؤں بھی پیچھے کھینچے۔ اسے سمجھایا بھی کہ اگر تم میرے پاؤں دباتی رہو مجھے نیند نہیں آئے گی مگر اس نے میری ایک نہ سنی اور میرے پاؤں دباتی رہی۔ میں ا سے جہلم اور جہلم سے لاہور کے سفر کا تھکا ہوا تھا۔ مجھ پر غنودگی طاری ہو رہی تھی۔

رام پیاری جس محبت اور نرمی سے میرے پیر دبا رہی تھی' اس سے مجھے بڑا سکوا رہا تھا۔ میں واقعی سو گیا۔ مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ مَیں خوبصورت محل کے باغیچے میں سے گزر رہا ہوں۔ رنگ برنگ کے پھول کھل رہے مَیں ایک سرخ پھول توڑنے کے لئے ہاتھ آگے کرتا ہوں کہ اچانک جھاڑیوں میر ایک کالی سیاہ موٹی تازی بلی اچھل کر میری انگلی اپنے منہ میں دبوچ کر چبانے لگتی مَیں چیخ مار کر ہاتھ پیچھے کھینچتا ہوں اور میری جاگ کھل جاتی ہے۔

آنکھیں کھولتے ہی میں نے دیکھا کہ کمرے کی بتی جل رہی تھی اور رام پیاری ساتھ لیٹی تھی اور اس نے میری زخم والی انگلی منہ میں ڈال رکھی تھی۔ مَیں نے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

"یہ کیا کر رہی ہو رام پیاری؟"

رام پیاری میری انگلی پر صاف کپڑے کی پٹی لپیٹتے ہوئے کہنے لگی:

"سوامی! تمہیں تو پتہ نہیں تھا تمہاری انگلی سے پھر خون بہنے لگا تھا۔ مَیں نے . دی ہے۔ کل تک آرام آ جائے گا۔"

میرے دل میں کوئی دوسرا خیال نہ آیا۔ مَیں یہی سوچنے لگا کہ یہ لڑکی مجھ سے پیار کرتی ہے۔ کاش یہ مسلمان ہوتی تو مَیں اس سے شادی کر لیتا۔ اس کے بعد ر

میرے ساتھ ہی لیٹ گئی۔

صبح اٹھا تو رام پیاری پہلے سے نئی ساڑھی پہن کر صوفے پر بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے اخبار پرے رکھ دیا اور جلدی سے پلنگ پر آ کر میرے آگے دونوں ہاتھ باندھ کر سر جھکا کر پرنام کیا اور میرا ماتھا چوم لیا۔ کہنے لگی:

"سوامی! منہ ہاتھ دھو لو۔"

مَیں اٹھ کر باتھ روم میں چلا گیا۔ منہ دھونے کے لئے' مَیں نے انگلی پر سے پٹی کھولی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میری انگلی پر زخم کا معمولی سا نشان بھی باقی نہیں تھا۔ مَیں دیر تک انگلی کو الٹ پلٹ کر غور سے دیکھتا رہا۔ انگلی اس طرح صاف تھی' جیسے اس پر کبھی زخم لگا ہی نہیں تھا۔ مَیں نے باہر آ کر رام پیاری کو اپنی انگلی دکھائی اور کہا:

"دیکھو رام پیاری! تمہارے سامنے میری انگلی چھری سے کٹ گئی تھی۔ تم نے خون بھی چوس لیا تھا اور پٹی بھی باندھی تھی۔ مگر انگلی پر زخم کا کوئی نشان نہیں ہے۔"

رام پیاری نے بڑی محبت سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر انگلی کو دیکھا اور ہاتھ باندھ کر سر جھکا دیا اور بولی:

"مہاراج! آپ واقعی اندر لوک کے دیوتا ہیں۔ ویدوں میں صاف لکھا ہے کہ دیوتاؤں کو اگر کوئی زخم لگ جائے تو جسم پر اس کا نشان نہیں پڑتا۔"

میرا اس قسم کی باتوں پر بالکل یقین نہیں تھا۔ مَیں کسی دیوتا وغیرہ کو نہیں مانتا تھا۔ لیکن اس بات پر حیران ضرور تھا کہ انگلی پر زخم کا نشان کیسے غائب ہو گیا۔ پھر یہ سوچ کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیا کہ معمولی سا کٹ لگا تھا، ہو سکتا ہے راتوں رات نشان غائب ہو گیا ہو۔

ناشتہ کرنے کے بعد مَیں نے ریلوے انکوائری آفس میں فون کیا اور پوچھا کہ بنارس کس وقت اور کونسی گاڑی جاتی ہے۔ معلوم ہوا کہ شام کے سات بج کر پندرہ منٹ پر ہوڑہ ایکسپریس جاتی ہے۔ وہ بنارس سے ہو کر گزرتی ہے۔ مَیں نے ٹیلی فون پر ہی ریلوے

بکنگ آفس فون کر کے لاہور سے بنارس تک کی دو سیکنڈ کلاس کی سیٹیں بک کروالیں۔ دن بھر میں رام پیاری کو لاہور کی سیر کرواتا رہا۔ چڑیا گھر تو ہمارے ہوٹل کے سامنے ہی تھا۔ اس کے علاوہ اسے شاہی قلعہ دکھایا، جہانگیر کا مقبرہ بھی دکھایا اور عجائب گھر کی بھی سیر کروائی۔ دوپہر کا کھانا ہم نے باہر ہی کھایا۔ تیسرے پہر ہم ہوٹل واپس آئے' ہوٹل کا بل وغیرہ ادا کرنے کے بعد چھ بج کر بیس پچیس منٹ پر ہم ریلوے سٹیشن کی طرف چل پڑے۔ ہوڑہ ایکسپریس کلکتہ سے پشاور اور پشاور سے کلکتہ تک چلا کرتی تھی۔ بڑی تیز رفتار ٹرین تھی اور اس کے ڈبے سبز اور سرخ رنگ کے ہوتے تھے۔

ٹرین ٹھیک وقت پر آگئی۔ ہماری سیٹیں بک تھیں۔ اس ٹرین میں بھی تھرڈ کلاس نہیں ہوتی تھی۔ ہمارے پاس کوئی سامان وغیرہ نہیں تھا۔ ایک چھوٹا اٹیچی کیس میرے ہاتھ میں تھا۔ ایک چھوٹا اٹیچی کیس رام پیاری نے اٹھا رکھا تھا۔ ہم سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں گئے۔ چار آدمیوں والا ڈبہ تھا۔ پہلے سے ایک سکھ میاں بیوی ڈبے میں بیٹھے ہوئے تھے ٹرین کچھ دیر لاہور کے سٹیشن پر رکنے کے بعد چل پڑی۔ جن لوگوں نے اس زمانے ہوڑہ ایکسپریس اور فرنٹیئر مَیل میں سفر کیا ہوا ہے وہ جانتے ہوں گے کہ یہ دونوں گاڑیاں بڑی تیز رفتار گاڑیاں تھیں اور بڑے سٹیشن سے نکلتے ہی سپیڈ پکڑ لیتی تھیں اور جب سٹیشن پر رکے بغیر رن تھرو نکل جاتی تھیں اور پوری رفتار کے ساتھ ریلوے لائن بدلے ہوئے کانٹوں پر سے گزرتی تھیں تو زبردست شور اٹھتا تھا اور ٹرین دائیں بائیں زور سے ہلنے لگتی تھی۔

بہرحال ہم لاہور سے بنارس پہنچ گئے۔

رام پیاری مجھے سٹیشن سے سیدھی اپنی سہیلی کے گھر لے گئی۔ اس کی سہیلی راج کماری تھا۔ درمیانے قد کی صحت مند جسم والی سانولی سی عورت تھی۔ ناک میں نے نتھنی ڈالی ہوئی تھی۔ دیر دیر بعد آنکھیں جھپکتی تھی۔ جب تک رام پیاری اس میرا تعارف کرواتی رہی یہ عورت راج کماری مجھے پوری آنکھیں کھولے مسلسل

رہی۔ رام پیاری نے اپنی سہیلی کے آگے مجھے ہندو ظاہر کیا تھا اور میرا نام کاشی ناتھ بتایا تھا۔ کہنے لگی:

"کاشی ناتھ جی کا لاہور میں بہت بڑا کاروبار ہے۔ مجھ سے دریائے راوی والے مندر میں ملاقات ہوئی تھی۔ کہنے لگے مَیں بنارس کے مندروں کی یاترا کرنا چاہتا ہوں۔ مَیں نے کہا پھر میرے ساتھ ہی چلیں۔ اب یہ کچھ روز یہیں رہیں گے۔"

راج کماری نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا۔ اس کا ہاتھ بھی گرم تھا۔ مجھے اس کے جسم سے بھی حرارت کی لہریں سی نکلتی محسوس ہوئیں، لیکن میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ رام پیاری نے مجھ سے کہا۔

"کاشی ناتھ جی! آپ یہاں آرام کریں۔ اتنی دیر میں' مَیں بھی ذرا اپنے ہوسٹل تک ہو آؤں۔" پھر اس نے اپنی سہیلی راج کماری سے کہا۔

"کماری! کاشی ناتھ جی کا خیال رکھنا۔ مَیں شام ہونے سے پہلے پہلے آجاؤں گی۔ پھر انہیں لے کر مندروں کی یاترا کراؤں گی۔"

رام پیاری نے مسکراتے ہوئے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور اپنا اٹیچی کیس اٹھا کر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد راج کماری مجھے چند لمحوں تک آنکھیں جھپکے بغیر دیکھتی رہی۔ پھر بولی:

"چلیں! مَیں آپ کو آپ کا کمرہ دکھاتی ہوں۔"

یہ مکان نہیں تھا۔ چھوٹی سی پرانے ٹائپ کی کوٹھی تھی۔ جس کے چاروں طرف برآمدہ تھا۔ درمیان میں چار پانچ کمرے بنے ہوئے تھے۔ یہ نیچی چھتوں والے چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ جس کمرے میں راج کماری مجھے لے کر گئی اس میں پلنگ پر بستر لگا ہوا تھا۔ دیوار کے ساتھ دو پرانی کرسیاں اور ایک چھوٹی میز لگی تھی۔ فرش بوسیدہ سی دری سے ڈھکا ہوا تھا۔ چھت کے ساتھ پنکھا لٹک رہا تھا۔ کمرے میں صرف ایک کھڑکی تھی' جس کے باہر دریا اور کھیت نظر آ رہے تھے۔ کوئی روشندان وغیرہ نہیں تھا۔

راج کماری یہ کہہ کر چلی گئی کہ مَیں نوکرانی کے ہاتھ کھانا بھجوا رہی ہوں۔ آپ آرام کریں۔ کمرے کے ساتھ ہی ایک تنگ سا غسل خانہ تھا۔ مَیں نے منہ ہاتھ دھویا اور پلنگ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک سیاہ فام نوکرانی میرے لئے کھانا لے کر آ گئی۔

خدا جانے کس چیز کا بدذائقہ ساگ تھا اور کچھ چپاتیاں تھیں۔ مجھے بھوک لگی ہوئی تھی۔ وہی کھا کر خدا کا شکر ادا کیا۔ رام پیاری نے شام کو آنے کا کہا تھا۔ میں پلنگ پر لیٹ گیا۔ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ پھر میری آنکھ لگ گئی۔ میں بڑی گہری نیند سو رہا تھا کہ اچانک مجھے اپنے چہرے پر کسی کا گرم سانس محسوس ہوا ، پھر میری گردن پر کوئی گیلی شے لگی۔ میں نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ صرف دریا والی کھڑکی میں سے ہلکی ہلکی روشنی آ رہی تھی۔ میں نے دو آنکھوں کو اپنے چہرے پر جھکے ہوئے دیکھا۔ یہ راج کماری تھی۔ مجھے بیدار ہوتا دیکھ کر وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔ مَیں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کیا بات ہے راج کماری؟" میں نے تجسس کے ساتھ پوچھا۔ راج کماری بغیر آنکھیں جھپکے مسلسل مجھے دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی:

"کچھ نہیں! کوئی بات نہیں۔ میں یہ پوچھنے آئی تھی کہ بھوجن ٹھیک تھا؟"

"ہاں! ٹھیک تھا۔"

مَیں نے رسمی طور پر کھانے کی تعریف کی۔ لیکن مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ یہ پُراسرار عورت کوئی اور مقصد لے کر میرے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ میری گردن پر جہاں مجھے نرم نرم گیلی شے لگی تھی' وہاں ہلکی ہلکی جلن ہو رہی تھی۔ راج کماری چلی گئی۔ میں کھڑکی کے پاس آ کر باہر دیکھنے لگا۔ دور کچھ فاصلے پر دریا کے دونوں کناروں پر سادھو سنتوں کی زرد رنگ کی چھتریاں چبوتروں پر لگی ہوئی تھیں۔ کچھ لوگ دریا میں اشنان بھی کر رہے تھے۔ یہ ہندوؤں کا مقدس دریا گنگا تھا۔ شہر بنارس گنگا دریا کے دونوں طرف آباد ہے۔ بڑا قدیم شہر ہے۔ اسے مندروں کا شہر بھی کہتے ہیں۔ دریا کی دونوں جانب پتھریلے چبوتروں

پر بٹے کٹے نیم عریاں سادھو پھولے ہوئے پیٹ لٹکائے چھتریوں کے نیچے گھسا ہوا صندل' گیندے اور رتن جوت کے پھول لے کر بیٹھے رہتے ہیں۔ ہندو عورتیں اور مرد اِن کو روپے پیسوں اور مٹھائیوں کے نذرانے پیش کرتے ہیں۔ سادھو اِن کے ماتھوں پر صندل کا ٹیکا لگاتے ہیں اور تھوڑا سا پرشاد دے کر آگے چلتا کرتے ہیں۔ ہر سادھو نے بدن پر راکھ ملی ہوتی ہے۔ سر میں بھی راکھ پڑی ہوتی ہے۔ ماتھے پر سرخ اور زرد رنگ کی لکیریں ڈالی ہوتی ہیں۔ ان میں سے بعض سادھو بالکل ننگے ہوتے ہیں۔ ہندو عورتیں ان سادھوؤں کے آگے ماتھا ٹیکتی ہیں اور اولاد کے لئے پرارتھنا کرنے کو کہتی ہیں۔ دریا کی دونوں جانب کتنے ہی گھاٹ ہیں۔ بنارس شہر بلندی پر آباد ہے۔ دریا تک سیڑھیاں اتر کر جانا پڑتا ہے۔ لوگ اپنے مُردوں کا انتم سنسکار یعنی آخری رسوم دریا کے کنارے کرتے ہیں۔

وہاں قطار میں مُردوں کے بھوپان یعنی بانس کے سٹریچر رکھے ہوتے ہیں۔ اس گھاٹ کو شمشان گھاٹ کہتے ہیں۔ یہاں مُردوں کو جلانے والوں کو شمشان گھاٹ کے باوے کہتے ہیں۔ یہ ایک ایک چتا پر چار چار مردے اوپر تلے رکھ کر انہیں آگ لگا دیتے ہیں۔ جب تک مردے کے لواحقین وہاں کھڑے رہتے ہیں' باوے مُردوں کو آگ میں جلاتے رہتے ہیں۔ جیسے ہی لواحقین دھوئیں اور جلنے والے مُردہ جسموں کی بدبو سے گھبرا کر چلے جاتے ہیں' باوے ، اَدھ جلے مردے چتا میں سے گھسیٹ کر نکالتے ہیں اور انہیں گنگا دریا میں بہا دیتے ہیں۔ یہاں ہندوؤں کے مُردوں کی جتنی بے حرمتی ہوتی ہے شاید ہی کہیں ہوتی ہو۔ دریا پر دھوپ کا رنگ قرمزی ہونے لگا تھا۔ شام اپنے سرمئی دھندلکوں کے ساتھ بنارس شہر کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لئے بڑھی چلی آ رہی تھی۔

اس پُراسرار کوٹھڑی میں میرا دل گھبرانے لگا تھا۔ مَیں باہر نکل کر کھیتوں کی کھلی فضا میں ٹہلنا چاہتا تھا۔ مَیں کوٹھڑی نما کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں آ گیا۔ اس بھول بھلیوں والے عجیب سے مکان میں باہر جانے والا راستہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں ہو کر جاتا تھا۔ دوسرا کمرہ خالی پڑا تھا۔ باہر برآمدہ بھی خالی تھا۔ مَیں مکان کے عقب کی

جانب آ گیا۔ سامنے دریا کنارے تک کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ کھلی فضا میں آتے ہی میری
طبیعت ٹھیک ہو گئی۔ سورج بنارس شہر پر اپنی قرمزی روشنی چھوڑ کر غروب ہو چکا تھا۔ میں
راج کماری کے مکان میں واپس آ گیا۔ راج کماری برآمدے کے ایک ستون کے سامنے
بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے سانپ کی مورتی تھی۔ سانپ نے پھن اٹھایا ہوا تھا۔
راج کماری ہاتھ باندھے، آنکھیں بند کئے اشلوک پڑھ رہی تھی۔ انڈیا میں ہندو لوگ
سانپوں کی بھی پوجا کرتے ہیں۔ ناگ کو سانپوں کا دیوتا کہا جاتا ہے۔ ناگ دیوتا کے جنوبی ہند
میں کئی مندر ہیں، جہاں سانپوں کی مورتیوں کی اور زندہ سانپوں کی بھی پوجا کی جاتی ہے
جنوبی ہندوستان کے بعض ناگ پوجا کرنے والوں کے گھروں میں سانپ اس طرح کے
پھرتے رہتے ہیں جیسے پالتو بلیاں پھرا کرتی ہیں۔ میں نے راج کماری کو بالکل نہ بلایا ا
اپنے کمرے میں آ کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔

کچھ وقت گزر گیا۔ پھر رام پیاری بھی آ گئی۔ اس نے گیروے رنگ کی چادر اپنے جسم
کے گرد جوگنوں کی طرح لپیٹ رکھی تھی۔ بال کھلے تھے۔ آتے ہی مجھ سے لپٹ گئی۔ مجھے
اس کے جسم سے آگ سی نکلتی محسوس ہوئی۔ کہنے لگی:

"کاشی ناتھ جی چلیئے جم راج جی کے مندر کی یاترا کرنے چلتے ہیں۔"

میرا دل کسی مندر میں جانے کو نہیں کرتا تھا۔ لیکن رام پیاری کہنے لگی:

"رات کو اس مندر میں جم راج جی کی دیوداسیاں ڈانس کرتی ہیں۔ یہ سین دیکھنے وا
ہوتا ہے، وہاں کسی غیر آدمی کو آنے کی اجازت نہیں ہے لیکن میں نے بڑے پجاری جی
سے بڑی مشکل سے تمہاری اجازت لے لی۔"

میں رام پیاری کے ساتھ جم راج کے مندر میں جاتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ اس کی و
یہ تھی کہ میرا دل یا میری چھٹی حس مجھے رام پیاری کے ساتھ مندر جانے سے روک ر
تھی۔ لیکن رام پیاری نے مجھ پر کچھ ایسا جادو کر رکھا تھا اور اس قدر محبت کے ساتھ
بار بار مجھ سے بغل گیر ہو رہی تھی کہ میں انکار نہ کر سکا اور اس کے ساتھ جانے پر آ

ہو گیا۔

رام پیاری نے خوش ہو کر میرا ہاتھ چوم کر اپنے ماتھے سے لگایا اور بولی۔ "کاشی ناتھ
جی! آج کی رات بڑی انمول رات ہے۔ یہ رات آپ کو زندگی بھر نہیں بھول سکے گی۔"

راج کماری بھی ہمارے پاس ہی کھڑی تھی اور مجھے ٹکٹکی باندھے تک رہی تھی۔ میں
نے رام پیاری سے کہا:

"میرا خیال ہے ہمیں کھانا کھانے کے بعد مندر جانا چاہیے۔"

رام پیاری بولی:

"کھانا ہم جم راج جی کے مندر میں کھائیں گے، وہاں بھوجن کا بڑا اچھا انتظام ہے۔"

ہم یعنی میں، رام پیاری اور راج کماری جم راج کے مندر کی طرف چل پڑے۔ گھاٹ
کی سیڑھیاں اتر کر ایک کشتی میں سوار ہو گئے، جس نے ہمیں کافی آگے جا کر دریا کے
دوسرے کنارے پر اتار دیا۔ شام کا دھندلکا گہرا ہو رہا تھا۔ رام پیاری جوگن کے لباس میں
میرے ساتھ چل رہی تھی۔ راج کماری ہمارے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ درختوں کے گنجان
جھنڈ شروع ہو گئے۔ یہاں اندھیرا اور گہرا تھا۔ رام پیاری میرے بالکل ساتھ لگ کر چل
رہی تھی۔ اس کے بدن سے نکلتی حرارت کی گرم لہریں جیسے میرے جسم میں جذب ہوتی
رہی تھیں۔ میں کسی بہانے ذرا الگ ہو جاتا تو رام پیاری بھی کسی بہانے دوبارہ میرے
ساتھ لگ جاتی۔

ایک اونچا ٹیلہ آ گیا۔ اندھیرے میں ٹیلہ آگے کی طرف جھکا ہوا لگتا تھا۔ میں نے رام
پیاری سے پوچھا:

"کیا جم راج کا مندر اس ٹیلے کے اوپر ہے؟"

اس نے کہا۔ "جم راج جی کا مندر ٹیلے کے اوپر نہیں، ٹیلے کے اندر ہے۔ تمہیں ڈر تو
نہیں لگ رہا ہے؟"

میں نے کہا۔ "بالکل نہیں۔"

کہنے لگی۔ "جب تک میں تمہارے ساتھ ہوں' تمہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

نہ جانے کیوں مجھے کچھ اس قسم کا احساس ہونے لگا تھا جیسے یہ عورتیں مجھے گھیر کر کسی خطرناک جگہ پر لے جا رہی ہیں۔ لیکن کچھ اپنی وضع داری کے اور کچھ اپنے مرد ہونے کے خیال سے میں ان پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ مَیں کچھ خوف محسوس کرنے لگا ہوں۔ رام پیاری نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اس کا ہاتھ مجھے پہلے سے زیادہ گرم محسوس ہو رہا تھا۔ مَیں نے اسے کہا:

"تمہیں شاید بخار ہے رام پیاری؟"

اس نے میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا:

"یہ تمہارے پریم کی گرمی ہے بخار نہیں ہے۔"

اور وہ ہنس دی۔ ٹیلے کے دامن میں ایک جگہ دیوار کے طاق میں رکھا ہوا مٹی کا دیا جل رہا تھا۔ رام پیاری بولی:

"بس ہم جم راج جی کے مندر میں آ گئے ہیں۔"

جہاں مٹی کا دیا جل رہا تھا' وہاں ایک دروازہ سا بنا ہوا تھا' جو مجھے کسی غار کا دہانہ لگ رہا تھا۔ رام پیاری مجھے لے کر اندر داخل ہو گئی۔ ہم ایک تنگ و تاریک غار میں سے گزرنے لگے۔ مَیں نے رام پیاری سے کہا:

"یہاں اتنا اندھیرا کیوں ہے؟"

اس نے اپنا بازو میری کمر میں ڈال دیا اور بولی:

"ابھی روشنی آ جائے گی۔"

کچھ دور غار میں چلنے کے بعد روشنی نظر آنے لگی۔ یہ روشنی غار کے اندر ایک دالان میں ہو رہی تھی۔ دالان کے درمیان زمین سے دو فٹ اونچا پتھر کا چبوترہ تھا۔ چبوترے کے اوپر آگ جل رہی تھی۔ رام پیاری کہنے لگی:

"یہاں میں اگنی دیوی کی کچھ دیر پوجا کروں گی' اس کے بعد ہم دوسرے دالان میں جائیں گے' جہاں جم راج جی کی مورتی کے آگے رقص کرنے والی دیو داسیاں آئیں گی۔ تم یہاں بیٹھ جاؤ۔"

چبوترے کے وسط میں جو آگ تھی' اس میں سے پتلے پتلے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ رام پیاری نے راج کماری سے کہا:

"کماری جی! اشلوک کیرتن شروع کرو۔"

میں چبوترے سے ذرا دور ہو کر پتھر پر بیٹھ گیا۔ راج کماری نے اشلوک پڑھنے شروع کر دیئے۔ رام پیاری چبوترے پر چڑھ کر آگ کے گرد چکر لگانے لگی۔ پھر وہ بھی اشلوک پڑھنے لگی۔ یہ اشلوک منتر لگ رہے تھے۔ آگ کے گرد ایک چکر پورا کرنے کے بعد رام پیاری دونوں بازو اوپر اٹھا کر "جے جم راج جی کی جے" کا نعرہ بلند کرتی تھی۔ آگ میں لوبان وغیرہ بھی جل رہا تھا' جس کی بُو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ راج کماری میرے قریب ہی دوزانو ہو کر بیٹھی اشلوک گا رہی تھی۔ وہ اپنے سر کو دائیں بائیں ہلاتی جاتی تھی۔ جیسے اس پر حال کی کیفیت طاری ہو گئی ہو۔ دوسری جانب رام پیاری منتر پڑھتے ہوئے آگ کے گرد برابر چکر لگا رہی تھی۔ کسی وقت وہ اپنے جسم کے گرد لپٹی ہوئی گیروی چادر میں سے کچھ سفوف سا نکال کر آگ پر چھڑکتی تو آگ کے شعلے ایک دم بلند ہو جاتے۔ رام پیاری آگ کے پاس آ کر اس طرح کھڑی ہو گئی کہ آگ کے شعلے اس کے پیچھے بلند ہو رہے تھے۔ راج کماری بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے اشلوک پڑھنے کی آواز بلند ہو گئی۔ رام پیاری نے دونوں بازو بلند کئے اور چیخ سے ملتی جلتی آواز میں کہا:

"ناگ دیوتا! ہے ناگ دیوتا! تنکل تمہاری! ناگ منی! ہے ناگ منی!"

اچانک رام پیاری نے ایک دہشت ناک چیخ ماری اور چادر اتار کر دور پھینک دی۔ اب وہ بالکل عریاں کھڑی تھیں' نہ جانے کیوں خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرے جسم میں اتنی سکت بھی نہیں رہی کہ میں اپنا ہاتھ ہلا سکوں۔

میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ یہاں سے بھاگ جاؤ' بھاگ جاؤ۔ مَیں نے دو تین بار
اٹھنے کی کوشش بھی کی لیکن جس پتھر پر میں بیٹھا تھا' جیسے اس نے اپنے ساتھ میرے جسم
کو بھی پتھر کر دیا تھا۔ راج کماری کے اشلوک پڑھنے کی آواز بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی
تھی۔ رام پیاری اس طرح عریاں حالت میں آگ کے شعلے کے آگے کھڑی تھی۔ اس کا
جسم تانبے کی طرح چمک رہا تھا۔ اس کے دونوں بازو اوپر کو اٹھے ہوئے تھے۔ اس کے بال
بکھرے ہوئے تھے۔ وہ بار بار اپنے سر کو دائیں بائیں جھٹک رہی تھی۔

میرے دیکھتے دیکھتے رام پیاری کا تانبے ایسا عریاں جسم سیاہ پڑنے لگا۔ پھر اس کے جسم
میں سے ہلکا ہلکا دھواں اٹھنا شروع ہو گیا۔ اس کی خوبصورت شکل بگڑنے لگی۔ اس کے
اوپر والے دو دانت باہر نکل آئے۔ اس کے سارے جسم پر سیاہ بال نمودار ہو گئے۔ مَیں
دہشت کے مارے کانپنے لگا۔ مَیں نے پوری طاقت سے اپنے آپ کو اٹھانے کی کوشش کی
مگر میرا جسم پتھر ہو چکا تھا۔ نہ مَیں اپنے بازو ہلا سکتا تھا' نہ میری ٹانگیں اپنی جگہ سے حرکت
کر رہی تھیں۔ رام پیاری کا جسم سیاہ ہو گیا تھا۔ اس کے جسم میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔
اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ وہ اسی حالت میں چبوترے سے اتر کر
میری طرف بڑھی۔ مجھ پر لرزہ سا طاری ہونے لگا۔ میں نے اٹھ بھاگنے کی آخری کوشش
کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ مَیں پتھر کے ساتھ پتھر ہو گیا ہُوا تھا۔ رام پیاری اپنے بھیانک
روپ میں بازو پھیلائے اپنا دھواں چھوڑتا ہُوا سیاہ جسم لئے میری طرف بڑھتی چلی آ رہی
تھی۔ میرے حلق سے ایسی آوازیں نکل رہی تھیں' جیسے میرے اندر کوئی بین کر رہا ہے
رو رہا ہے۔ رام پیاری نے میرے سامنے آ کر میرے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ اس کے ہاتھ
سخت گرم تھے۔ اس نے ایک جھٹکے سے مجھے اٹھایا اور اپنے سیاہ فام دھواں اگلتے سینے سے
لگا کر بھینچ لیا۔

میرے حلق سے ایک بھیانک آواز بلند ہوئی۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا'
مَیں زندہ ہوں یا مردہ۔ جب مجھے ہوش آیا تو مَیں نے دیکھا کہ میں شیشے کی ایک بوتل میں

ہو۔ مگر مجھے اپنا جسم دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس بوتل میں ایک چھوٹا سا کالا سانپ
تھا جو بوتل کے اندر بے چینی سے بوتل کے اوپر جانے کی کوشش کر رہا تھا اور ہر بار
کر نیچے گر پڑتا تھا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ میں اس سانپ کے اندر حلول کر
ہوں اور میرا انسانی جسم باقی نہیں رہا۔ میری عقل' میری یادداشت اور میرے انسانی
حواس بدستور موجود تھے۔ میں سانپ کی شکل میں جس بوتل کے اندر بند تھا' وہ
کوٹھڑی کے طاق میں پڑی تھی۔ کوٹھڑی میں آمنے سامنے دو دیئے جل رہے تھے۔
سانپ کی نظر سے دیکھ رہا تھا' لیکن انسانی ذہن کے ساتھ سوچ رہا تھا۔
مجھے ایک دم سے کامنی نرتکی کا خیال آ گیا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ میری بہن عاصمہ پر
چڑیل کا سایہ ہے۔ پاتالی چڑیل منگل جادوگر کی خاص چڑیل ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا
پاتالی چڑیل کا جسم گرم رہتا ہے اور اس کے بدن سے ہر وقت دھواں نکلتا رہتا ہے۔
پیاری کا عریاں بدن جب سیاہ پڑ گیا تھا تو اس کے جسم سے بھی دھواں نکلنا شروع ہو گیا
گویا پاتالی چڑیل ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت مجھے لاہور سے یہاں جم راج کے مندر
لائی تھی اور اب میں اس کے قبضے میں تھا۔ مَیں نے کامنی نرتکی کی مدد سے پاتالی چڑیل
شکست دی تھی اور اس کے ہلاکت خیز آسیب سے اپنی بہن کو نجات دلائی تھی۔ اب
پاتالی کے قبضے میں ہوں' وہ مجھ سے ضرور انتقام لے گی۔
اور اس کا انتقام انتہائی ہولناک ہو گا۔
مَیں سانپ کی شکل میں ضرور تبدیل کر دیا گیا تھا مگر میرا ذہن انسان کے ذہن کی طرح
کر رہا تھا۔ میری یادداشت بھی قائم تھی اور مَیں ایک ایک چیز کا مشاہدہ سانپ کی آنکھ
نہیں بلکہ اپنی انسانی آنکھوں سے کر رہا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ مجھے اپنا جسم دکھائی
دے رہا تھا۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ مجھ پر قدرت کی طرف سے ایک ایسا
نازل ہو چکا تھا کہ جس کا مَیں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اپنی انسانی آنکھیں نظر
آ رہی تھیں' مگر مَیں نے محسوس کیا کہ میری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے ہیں۔ میں

شرک کے گناہ کا مرتکب ہوا تھا۔ مجھے اپنی بہن کی صحت یابی کے لئے اللہ تعالیٰ کی ط
رجوع کرنا چاہیے تھا اور اس وقت تک اس کا ڈاکٹری علاج جاری رکھنا چاہیے تھا ج
تک کہ خدا اسے اپنی رحمت کے صدقے شفا عطا نہیں کرتا۔ لیکن میں توہمات کا شکا
گیا۔ میں نے شرک کیا اور اب مجھ پر قدرت کا عذاب نازل ہو گیا ہے۔ مَیں نے ا
ذہن کے اندر توبہ استغفار کا ورد شروع کر دیا اور اللہ کے حضور اپنی بخشش کی دع
مانگنے لگا۔

کوٹھڑی میں آمنے سامنے دیواروں کے طاق میں جو دو دیئے جل رہے تھے' اچانک
کی لو تھر تھر کانپنے لگی۔ ان میں سے ایک دیا بجھ گیا۔ دوسرے دیئے کی لو شاید دہشت
مارے اتنی مدہم ہو گئی کہ کوٹھڑی میں اندھیرا چھا گیا۔ جس بوتل میں' مَیں بند تھا اس
کاک سے بند تھا۔ میں کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرتا، میں بوتل سے باہر نہیں نکل سکا
ایک دم سے ایک عورت کی دل دوز چیخ بلند ہوئی۔ میرے سانپ کے جسم کے
کھڑے ہو گئے۔ چیخ کی آواز اتنی بھیانک اور بجلی کی کڑک ایسی تھی کہ طاق میر
ہوئی میری بوتل اپنی جگہ سے ہل گئی تھی۔ پھر سامنے والی دیوار پر ایک ایسی عو
شکل نمودار ہوئی جس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں لال انگاروں کی طر
رہی تھیں۔ دو نوکیلے دانت ہونٹوں سے باہر نکلے ہوئے تھے اور اس کے سیاہ فام ج
دھواں اٹھ رہا تھا۔

یہ پاتال چڑیل کے سوا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

یہ چڑیل دیوار سے باہر نکل آئی۔ وہ طاق کے پاس آ کر بوتل کے بالکل سامنے
گئی۔ پھر اس کی گھسی ہوئی ڈراؤنی آواز سنائی دی۔ اس نے ایک مکروہ قہقہہ لگا کر
"تم سمجھ رہے ہو گے کہ میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔ تمہیں بھلا دیا ہے
ہرگز نہیں۔ میں اس روز سے تمہارے پیچھے لگ گئی تھی اور موقع کی تلاش
جب سے تم نے مرن گھاٹ والی کامنی نرتکی سے مل کر مجھے اپنی بہن کے سر سے

زمین پر پٹخ دیا تھا۔ میں نے اسی روز فیصلہ کر لیا تھا کہ تم سے اپنی شکست کا' اپنی بے عزتی
کا بدلہ ضرور لوں گی۔ تمہارے شہر لاہور میں میرا منتر اس لئے تم پر آسانی سے نہیں چل
سکتا تھا کہ وہاں تم لوگوں کی مسجدوں سے اذان کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔ میں تمہیں
کسی طرح گھیر کر اپنے جال میں پھنسا کر جم راج جی کے غار میں لانا چاہتی تھی مگر تم لاہور
سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ آخر میں نے ایک خوبصورت لڑکی رام پیاری کی شکل بنائی اور
تمہیں ورغلا کر اپنے ساتھ یہاں تک لے آنے میں کامیاب ہو گئی۔ اب میں تمہاری بہن
کے سر پر تو آسیب بن کر کبھی سوار نہیں ہو سکتی، لیکن تمہیں بھی اپنے چنگل سے نہیں
نکلنے دوں گی اور تمہیں بتاؤں گی کہ پاتالی چڑیل سے اگر اس کا شکار چھینا جائے تو وہ اپنی
اس بے عزتی کا کس قدر بھیانک انتقام لیتی ہے۔ تم میرے طلسم کے اور میرے قبضے میں
ہو۔ مَیں تمہیں ہر دفعہ نئے سے نیا عذاب دوں گی، نئی سے نئی اذیت تمہارے لئے ایجاد
کروں گی۔ تمہیں ایک ہی بار مارنے کے بجائے' تمہیں بار بار ماروں گی۔ تمہیں بار بار
موت کی اذیت میں سے گزاروں گی۔ میں جانتی ہوں کہ تم میری ہر ایک بات ہر ایک لفظ
سن رہے ہو اور سمجھ رہے ہو اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تمہارے پاس جواب دینے کی
طاقت نہیں ہے، کیونکہ میں نے تمہیں سانپ بنا کر بوتل میں بند کر دیا ہے۔ تم قیامت
تک میرے قیدی بن کر' میرے طلسمی منتروں کے اسیر بن کر' میرے غلام بن کر رہو
گے۔ میں جیسا کہوں گی تمہیں ویسا کرنا ہو گا۔ تم وہی کرو گے اور وہی کرنے پر مجبور ہو
گے۔"

اس نے ایک اور مکروہ قہقہہ لگایا اور طاق میں سے بوتل اٹھا کر غائب ہو گئی۔ اس کے
ساتھ بوتل بھی غائب ہو گئی تھی اور مجھے نظر تو سب کچھ آ رہا تھا مگر بوتل اور سانپ نظر
نہیں آتا تھا۔ مجھے تیز آندھیوں کی شاں شاں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ
آوازیں کبھی ہلکی ہو کر دور چلی جاتیں اور کبھی بے حد تیز ہو جاتیں' مجھے دکھائی کچھ نہیں
دیتا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اندھیری رات میں تاریک بگولوں کے ساتھ آسمان

کی وسعتوں میں اڑتا چلا جا رہا ہوں۔ پھر میرے کان بند ہونا شروع ہو گئے۔ پہلے مجھے
اندھیرا نظر آتا تھا۔ اب اندھیرا بھی میری نظروں سے غائب ہو گیا۔ میرا دماغ چکر کھانے
اور پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ مَیں جیسے کائنات کے تاریک خلاؤں میں تحلیل ہو گیا۔

کچھ معلوم نہیں کہ یہ حالت کتنی دیر تک مجھ پر قائم رہی تھی۔ ایک جھٹکے کے سا
میری سماعت واپس آ گئی۔ میری بینائی نے بھی کام کرنا شروع کر دیا۔ میرے دماغ کے
ختم ہو گئے اور مَیں نے دیکھا کہ میں کسی جیل خانے کی کوٹھڑی میں آ گیا ہوں۔ مَیں
ایک قیدی کو دیکھا جو سر جھکائے دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر مو
کی زردی چھائی ہوئی تھی۔ کوٹھڑی کی سلاخوں کے پیچھے دو سنتری بندوقیں کندھوں
رکھے پہرہ دے رہے تھے۔ میرا وجود کمرے میں موجود تھا مگر میں اپنے وجود کو اپنے جس
بالکل نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اتنے میں مجھے پاتالی چڑیل کی آواز سنائی دی۔

"جانتے ہو یہ کون بدنصیب قیدی ہے، جس کی کوٹھڑی میں، مَیں تمہیں لے کر
ہوں؟"

مَیں پاتالی چڑیل کی آواز سن رہا تھا اسے انسانی آواز میں کوئی جواب نہیں دے
تھا کیونکہ میرا کوئی جسم ہی نہیں تھا، میری کوئی زبان ہی نہیں تھی۔ صرف ذہن ہی
تھا اور صرف احساس ہی احساس تھا۔ پچھتاوے کا احساس، ملال کا احساس، ذہنی پر
ذہنی کوفت اور روحانی تکلیف اور روحانی عذاب کا احساس ------ یہ ایک قابل
اور عبرت ناک حالت تھی۔ پاتالی چڑیل نے میرے جواب کا انتظار کئے بغیر بات
بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ وہ بدنصیب قاتل ہے جس کو ابھی تھوڑی دیر میں پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔
رہے ہو کہ اِس قیدی کے چہرے پر موت کی دہشت چھائی ہوئی ہے۔ لیکن اسے
نہیں کہ جب اسے پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا تو اسے کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ تکلیف

ہو گی۔ پھانسی پر یہ لٹکے گا اذیت تمہیں ملے گی۔ گردن کا منکا تمہیں ٹوٹتا محسوس ہو گا۔
پھانسی کے کنوئیں میں گردن میں پھنسی ہوئی رسی کے ساتھ تم جھول رہے ہو گے۔ اس
لئے کہ مَیں اس بدنصیب قیدی کے جسم میں اس کی روح کو، اس کے احساسات کو
بے ہوش کر کے اس کے اندر تمہیں، تمہاری روح، تمہارے احساسات کو داخل کرنے
والی ہوں۔"

اس کے بعد پتہ نہیں کیا ہُوا، کیسے ہُوا۔ مجھے ایک جھٹکا لگا اور مَیں نے محسوس کیا کہ
میرا جسم، میرے ہاتھ پاؤں، میرا وجود مجھے واپس مل گیا ہے۔ میری آنکھیں، میری قوت
گویائی بھی واپس آ گئی ہے۔ مَیں نے چونک کر دیکھا مگر یہ میرا جسم نہیں تھا۔ یہ اس
بدنصیب قیدی کا جسم تھا، جس کو بقول پاتالی چڑیل کے تھوڑی دیر میں پھانسی پر لٹکایا جا رہا
تھا۔ یہ میرے بازو نہیں تھے، بدنصیب قیدی کے ہاتھ تھے۔ صرف دماغ میرا اپنا تھا۔ میرا
دماغ قیدی کا دماغ نہیں تھا۔ میری یادداشت اپنی تھی۔ سزائے موت پانے والے قیدی کے
جسم میں داخل کر دیئے جانے کے باوجود مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ جس بدنصیب کے جسم
میں داخل کر دیا گیا ہوں، وہ کون ہے؟ اس نے کس کو قتل کیا تھا، جس کی سزا میں اس کی
گردن میں پھانسی کا پھندا ڈالا جانے والا تھا۔

میں نے بدنصیب قیدی کے روپ میں گردن اٹھا کر پھانسی کی کوٹھڑی کی سلاخوں کی
طرف دیکھا۔ سلاخوں کی دوسری طرف دو سنتری بندوقیں لئے پہرہ دے رہے تھے۔ میں
اٹھ کر سلاخوں کے پاس آ گیا۔ میں نے چیخ کر کہا:

"میں بے گناہ ہوں۔ میں تمہارا اصلی قیدی نہیں ہوں۔ میں نے کوئی خون نہیں کیا،
مجھے پھانسی پر نہ لٹکاؤ۔"

لیکن میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سپاہیوں نے میرا ایک بھی لفظ نہیں سنا تھا، بلکہ وہ
دونوں جلدی سے بندوق تانے سلاخوں کے پاس آ گئے۔ ان میں سے ایک نے مجھے حکم

دیا۔

"سلاخوں سے پیچھے ہٹ کر کھڑے رہو۔ تمہیں یہاں آنے کی اجازت نہیں ہے۔"

میں نے سلاخوں پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا:

"مَیں قاتل نہیں ہوں۔ مَیں نے کوئی قتل نہیں کیا۔ مجھ پر کبھی قتل کا مقدمہ نہیں چلا۔ جسے موت کی سزا ہوئی ہے' جس کو تم لوگ پھانسی پر چڑھانے والے ہو وہ مَیں نہیں ہوں۔ خدا کے واسطے مجھے یہاں سے باہر نکالو۔ جسے موت کی سزا ہوئی ہے' جس نے کوئی قتل کیا ہے وہ خدا جانے کہاں چلا گیا ہے' یہ مَیں ہوں۔ اس کے جسم میں' میری روح بند کر دی گئی ہے۔ مَیں تو لاہور شہر کا ایک شریف مگر بدنصیب شہری ہوں۔ میرا نام سلیم ہے' میری اکبری منڈی میں غلے کی دکان ہے۔ خدا کے لئے مجھے پھانسی پر نہ لٹکاؤ۔"

دونوں سنتری مجھے گھور کر دیکھ رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ جو الفاظ میری زبان سے نکل رہے ہیں وہ ان پہریداروں کے کانوں تک جاتے جاتے بدل جاتے ہیں۔ یہ اس بات سے ثابت ہوا کہ جب میں نے اپنی چیخ و پکار ختم کی تو ایک سنتری نے دوسرے سے کہا:

"یہ کہہ رہا ہے کہ مجھے بھوک لگی ہے اور ہم اسے کھانے کو کچھ نہیں دے رہے کیونکہ دو گھنٹوں کے بعد اسے پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔"

دوسرے سنتری نے کہا:

"مَیں چیف وارڈن کو بلاتا ہوں۔ اس وقت رات کا ایک بجا ہے۔ اسے تین پندرہ منٹ پر پھانسی دی جانے والی ہے۔ وارڈن صاحب دفتر میں آ گئے ہوں گے۔"

مَیں نے چیخ کر کہا۔ "مجھے کھانا نہیں چاہیے۔ خدا کے لئے میری بات غور سے سنو۔ میری زبان کیوں نہیں سمجھتے۔ میں قاتل نہیں ہوں۔ میں قاتل نہیں ہوں۔"

ایک سنتری چلا گیا' دوسرے نے سلاخوں میں سے بندوق کی نالی اندر کرتے ہوئے کہا۔

"آرام سے بیٹھ جاؤ۔ تمہیں ابھی کھانے کو کچھ نہ کچھ مل جائے گا۔ اتنا مت چلاؤ۔"

اتنے میں پہلا سنتری وارڈن کو لے کر آ گیا۔ اس کے ساتھ دو مسلح پولیس والے بھی تھے۔ وارڈن نے سلاخوں کے پاس آ کر مجھے دیکھ کر کہا:

"تم کیا کھانا چاہتے ہو؟ یہ تمہاری زندگی کا آخری کھانا ہوگا۔ تم جو کہو گے ہم وہی تمہارے لئے تیار کروا دیں گے۔"

میں نے روتے ہوئے کہا:

"وارڈن صاحب! مجھے کھانا نہیں چاہیے۔ خدا کے لئے میری بات سنو۔ مَیں قاتل نہیں ہوں۔ جس مجرم' جس قاتل کو تم پھانسی دینا چاہتے ہو' وہ یہاں نہیں ہے۔ یہ میں ہوں۔ اس قیدی کے جسم کے اندر میں بند کر دیا گیا ہوں۔ میں ہاتھ جوڑتا ہوں' مجھے پھانسی نہ دو۔"

میں رونے لگا۔ وارڈن نے کہا:

"ٹھیک ہے دوست! تم نے کہا ہے کہ مجھے بھوک نہیں ہے۔ مجھے کھانا نہیں چاہیے' مَیں صرف شربت کا ایک گلاس پینا چاہتا ہوں' تو فکر نہ کرو' میں ابھی تمہیں شربت بنوا کر بھجوا دیتا ہوں۔"

میں رو رہا تھا۔ اس بات پر رو رہا تھا کہ میری بات الٹی ہو کر ان لوگوں کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ میں کچھ کہہ رہا تھا' وہ کچھ سمجھ رہے تھے۔ میں نے سلاخوں کے ساتھ سر پٹختے ہوئے کہا۔

"یا اللہ پاک! میرے گناہ معاف کر دے۔"

وارڈن نے اشارہ کیا۔ ایک سنتری فوراً سلاخوں والے دروازے کا تالا کھول کر اندر آ گیا۔ دوسرا سنتری بھی اندر آ گیا۔ انہوں نے مجھے سلاخوں سے ہٹا کر کونے میں ایک طرف بٹھا دیا۔ وارڈن بھی پھانسی کی کوٹھڑی میں آ گیا۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ

رکھتے ہوئے کہا:

"اللہ کو یاد کرو۔ یہ وقت رونے کا نہیں ہے۔ بلکہ سجدے میں گر کر خدا سے اپنے گناہوں کے بخشوانے کا وقت ہے۔"

میں نے آنسو بھری آنکھیں اوپر اٹھا کر کہا:

"وارڈن صاحب میں قاتل نہیں ہوں۔"

میرا یہ جملہ بھی وارڈن کے کانوں میں الٹا ہو کر پڑا۔ اس نے میرا کندھا تھپتھپا ہوئے کہا:

"ٹھیک ہے! میں صندل کا شربت ہی بھجوا دوں گا۔ اب تم اللہ کو یاد کرو۔"

میں نے اپنا سر پیٹ لیا اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میرے آنسو بھی خشک ہو چکے تھے۔

4

مَیں بالکل صحیح طور پر محسوس کر رہا تھا کہ پھانسی مجھے ہی دی جا رہی ہے۔ اگرچہ وہ جسم نہیں تھا بلکہ اس قاتل کا تھا' جس کو موت کی سزا سنائی گئی تھی۔ لیکن اس کے جسم میرے احساسات جاری و ساری تھے۔ مَیں نے اپنے پاؤں کے انگوٹھے کو پکڑ کر ہلایا۔ بالکل ایسے ہی لگا جیسے میں اپنے پاؤں کے انگوٹھے کو پکڑ کر ہلا رہا ہوں۔ روتے روتے ایک بار کھانسا تھا تو مجھے بعینا یہی محسوس ہُوا تھا کہ یہ مَیں کھانس رہا ہوں۔ صرف ا کی شکل میری نہیں تھی اور مَیں وہ قاتل نہیں تھا جس کو عدالت نے موت کی سزا کا دیا تھا۔ موت کے خوف سے میرا حلق بار بار خشک ہو رہا تھا۔ ظاہر ہے مَیں اس اجنبی کے ایک ایک احساس کو محسوس کر رہا تھا تو جب میرے پاؤں کے نیچے سے تختہ کھسک ، گا اور اپنے پاؤں کے ساتھ بندھے ہوئے بھاری وزن کے ساتھ مَیں موت کے یں میں گروں گا تو جھٹکا بھی مجھے ہی لگے گا اور میری ہی گردن کا منکا ٹوٹتا محسوس ہو گا۔ ی پھانسی پا جانے کی اذیت سے گزروں گا۔ میرے اندر بار بار ایک اُبال سا اُٹھتا تھا۔ یخ کر کہتا کہ مَیں قاتل نہیں ہوں' مَیں شریف آدمی ہوں۔ میرا گھر اکبری دروازے ہے۔ میرے دوست خالد کو اطلاع کرو۔

سب سے بڑی مصیبت اور اس منحوس پاتالی چڑیل کے منتروں کا اثر یہ ہوا تھا کہ مَیں کہتا تھا، سننے والے کچھ سنتے تھے۔ مجھے اپنے منہ سے نکلے ہوئے جملے ٹھیک سنائی دیتے

تھے، لیکن دوسرے کے کان تک پہنچتے پہنچتے جملے بدل جاتے تھے' الفاظ بدل جاتے تھ
اسی ذہنی ہیجان اور پریشانی میں کافی وقت گزر گیا۔ پھر جیل کے دو ملازم میری کوٹھڑی
داخل ہوئے۔ انہوں نے پانی کی بالٹی اٹھا رکھی تھی۔ ایک نے کہا:

"خدا بخش! غسل کر لو۔"

جس قاتل کو پھانسی دی جانے والی تھی' اس کا نام خدا بخش تھا۔ میں نے اس سے

"خدا کے لئے میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں خدا بخش نہیں ہوں۔ میرا نام
ہے۔ مجھے ایک چڑیل نے یہاں لا کر پھنسا دیا ہے۔"

دوسرے ملازم نے میری بات کا جواب دیا۔

"فکر نہ کرو! تمہارے لئے وارڈن صاحب نے شربت منگوانے کے واسطے آدمی
دیا ہے، وہ آتا ہی ہوگا۔ اٹھو اور غسل کر کے کپڑے بدل لو۔"

مجھ سے کہاں اٹھا جاتا تھا۔ انہوں نے مجھے پکڑ کر کونے میں چوکی پر بٹھا دیا۔ انہو
خود ہی مجھے نہلایا۔ پھر وہ ٹوپی کرتہ اور پاجامہ پہنا دیا جو پھانسی گھاٹ پر لے جانے
موت کے قیدی کو پہنایا جاتا ہے۔ اتنے میں ایک مولوی صاحب آ گئے۔ وہ میرے
کر بیٹھ گئے اور مجھے کہنے لگے۔ اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لو۔ یہ تمہاری
آخری وقت ہے۔ پھر مولوی صاحب نے قرآنِ پاک کی تلاوت شروع کر دی۔
سر جھکا لیا اور میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ مولوی صاحب اپنا فرض ا
چلے گئے۔ اس کے چند لمحوں کے بعد چار آدمی پھانسی کی کوٹھڑی میں آ گئے۔ ان
ایک مجسٹریٹ صاحب تھے۔ ایک ڈاکٹر صاحب تھے' ایک پولیس آفیسر تھا اور چو
تھا۔ وارڈن کے ہاتھ میں شربت کا گلاس تھا۔ وارڈن نے گلاس میری طرف
ہوئے کہا:

"تم نے شربت پینے کی خواہش کی تھی۔ میں تمہارے لئے شربت لے آ

مجسٹریٹ نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا:

"مسمی خدا بخش ولد رحیم بخش سکنہ چک 42 گ ب۔ تم نے کل جو وصیت لکھوائی
اگر تم اس میں کچھ رد و بدل کرنا چاہتے ہو تو کر سکتے ہو؟"

میں نے مجسٹریٹ صاحب کی طرف آنکھیں اٹھا کر کہا:

"مجسٹریٹ صاحب! میرا نام خدا بخش نہیں ہے، میرا نام سلیم احمد ہے۔ میں اصل
نہیں ہوں۔ آپ اس کی جگہ ایک بے گناہ کو پھانسی دے رہے ہیں۔"

شربت کا گلاس میرے قریب ہی رکھا ہوا تھا۔ مجسٹریٹ صاحب کے کانوں تک پہنچتے
میرے جملوں بدل گئے تھے۔ انہوں نے شربت کا گلاس اٹھا لیا اور وارڈن سے کہا:

"خدا بخش نے کہا ہے کہ میں شربت نہیں پیوں گا۔ یہ گلاس باہر بھجوا دیں۔"

وارڈن نے شربت کا گلاس دروازے پر کھڑے سنتری کے حوالے کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب
سٹیتھو سکوپ میرے سینے پر رکھ کر دل کی دھڑکن چیک کی اور کہا:

"سزا یافتہ مجرم نارمل حالت میں ہے۔" انہوں نے ایک فائیل پر دستخط کر دیئے۔ یہ
بل وارڈن نے اٹھا رکھی تھی۔ اس کے بعد جیل کے دو اہلکار اندر داخل ہوئے۔ ان
سے ایک نے وارڈن صاحب سے کہا:

"سر! کیا حکم ہے؟"

وارڈن نے اپنی گھڑی دیکھ کر کہا:

"لے چلو۔"

جیل کے جو دو اہلکار آئے تھے۔ ان میں سے ایک نے میرے ایک بازو کو اور
دوسرے نے دوسرے بازو کو پکڑ کر مجھے اٹھایا اور آہستہ آہستہ چلاتے پھانسی کی کوٹھڑی
سے باہر لے آئے۔ ایک نیم روشن راہ داری تھی جو سیدھی پھانسی گھر کو جاتی تھی۔ اگر
میں کسی نیک مقصد کی خاطر جان دے رہا ہوتا تو مجھے موت کا کوئی خوف نہ ہوتا لیکن میں
کسی دوسرے کی موت مر رہا تھا۔ یہ مجھے قدرت کی طرف سے میرے گناہوں کی سزا مل
رہی تھی اور مجھ پر موت کا خوف طاری تھا۔ میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ دل ڈوب رہا

تھا۔ پھانسی گھر میں ایک اونچی مچان پر دو ستونوں کے درمیان اوپر کر کے سفید رسہ لٹک
تھا۔ رسے کے آگے پھندا بنا ہُوا تھا۔ اس پھندے نے میری گردن جکڑ کر میری گرد
منکا توڑ دینا تھا۔ مَیں نے کچھ بولنا چاہا لیکن آواز نے میرا ساتھ نہ دیا۔ میرا گلا اس ط
خشک تھا' جیسے ریت اُڑ رہی ہو۔ مجھ سے پھانسی گھر کے مچان کی سیڑھیاں نہ چڑھی گئ
جیل کے آدمی مجھے اٹھا کر مچان پر لے گئے۔

مجھے مچان کے اوپر لٹکتے ہوئے رسے کے عین نیچے کھڑا کر دیا گیا۔ میرے دونوں پا
ایک تختے کے اوپر تھے۔ دائیں جانب کانٹا بدلنے والا ایک لیور تھا۔ جلاد سیاہ لباس پہنے
کے پاس خاموش کھڑا تھا۔ مجھ سے کھڑا نہیں ہُوا جاتا تھا۔ جیل کے آدمیوں نے مجھے
دیا ہُوا تھا۔ سامنے کرسیوں پر تین چار آدمی بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک نے مجھ
پوچھا:

”تمہاری کوئی آخری خواہش ہو تو بتا دو۔ ہم اسے پوری کرنے کی کوشش ک
گے۔“

مَیں نے اپنے جسم کی رہی سہی طاقت کو جمع کرتے ہوئے نحیف سی آواز میں

”مَیں بے گناہ ہوں۔ مَیں وہ نہیں ہوں جسے موت کی سزا سنائی گئی ہے۔“

مجسٹریٹ نے جیل کے وارڈن سے کہا:

”اس نے پانی مانگا ہے۔ اسے پانی پلایا جائے۔“

مَیں نے انتہائی مایوسی کے عالم میں آنکھیں بند کر لیں۔ مَیں نے کچھ کہا تھا' انہو
کچھ اور بنا تھا۔ یہ سب پاتالی چڑیل کے طلسمی منتروں کا اثر اور میرے گناہوں کی س
کہ مَیں کچھ کہتا تھا وہ لوگ کچھ اور سمجھتے تھے۔ اسی وقت ایک آدمی دوڑ کر پانی کا
لے آیا۔ مجھے زبردستی پانی پلا دیا گیا۔ اس کے بعد جلاد نے میرے منہ پر سیاہ نقاب
دیا۔ میرا منہ سر گردن تک سیاہ تھیلا نما نقاب میں چھپ گیا تھا۔ مجھے سوائے اندھیر
کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میری گردن میں پھندا ڈالا جانے لگا۔ پھندے میں ایک

گانٹھ لگی ہوئی تھی۔ جلاد کے تجربہ کار ہاتھوں نے اس گانٹھ کو میرے حلق کی ہڈی کے
عین نیچے کر کے پھندا کس دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مَیں اسی وقت مر چکا تھا' صرف پھانسی
دینے کی ایک رسم پوری کرنی باقی تھی۔ مجھے کچھ پتہ نہیں میری آنکھیں کھلی تھیں یا بند۔
اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اچانک میرے پاؤں تلے سے تختہ نکل گیا اور میں اندھے کنوئیں
میں گرا۔ میرے پاؤں کے ساتھ جو دو دو من کے بھاری بورے باندھے ہوئے تھے' وہ بھی
میرے ساتھ ہی نیچے گرے۔ مجھے ایک زور دار جھٹکا لگا اور مجھے ایسے محسوس ہوا کہ تیز
آندھیاں چل رہی ہیں اور میں ایک اندھیری سرنگ میں خشک پتے کی طرح اڑتا چلا جا رہا
ہوں۔ انسانی چیخوں کی طرح کا ایک قیامت خیز شور تھا جو میرے جسم کے پرزے اڑا رہا
تھا۔ نہ تیز آندھیاں رکتی تھیں' نہ چیخوں کا شور ختم ہوتا تھا۔

وقت کا کوئی احساس نہیں تھا۔ وقت کے سب قاعدے اور پیمانے ختم ہو گئے تھے۔
شاید ایک گھنٹہ گزر گیا تھا یا ایک دن گزر گیا تھا کہ اچانک آندھیاں تھم گئیں۔ غیر انسانی
چیخوں کا شور ڈوب گیا اور میرے ہوش و حواس واپس آنا شروع ہو گئے۔ مَیں نے آنکھیں
کھول دیں۔ میرے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ مَیں زمین پر
بالکل سیدھا لیٹا ہوا ہوں۔ میرے نیچے ٹھنڈی زمین تھی۔ میری آنکھیں کھلی تھیں مگر میرا
جسم بے حس تھا۔ مَیں نے ہاتھ پیر ہلانے کی کوشش کی مگر نہ ہلا سکا۔ میرے ذہن نے
پوری طرح کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ مجھے یا اس قاتل کے مردہ جسم کو جس
کی جگہ مجھے پھانسی دی گئی ہے' قبر میں دفن کر دیا گیا ہے۔ مجھے اپنی آنکھوں کے اِرد گرد
چیونٹیاں رینگتی محسوس ہوئیں۔ مَیں نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ چیونٹیاں میرے بند
پپوٹوں کو کاٹنے لگیں۔ درد کی شدت سے میری چیخ نکل گئی۔ مَیں نے ہاتھ سے چیونٹیوں کو
ہٹانا چاہا لیکن وہ میرا ہاتھ نہیں تھا۔ وہ مردے کا ہاتھ تھا' مرا ہُوا ہاتھ تھا۔ اس نے کوئی
حرکت نہ کی۔ مجھے محسوس ہُوا کہ چیونٹیوں نے میری بند آنکھوں پر چھتہ ڈال دیا ہے اور
وہ میرے پپوٹوں کا گوشت نوچ نوچ کر کھا رہی تھیں۔ میرا منہ بند تھا۔ یعنی جس مردے

کے جسم میں مجھے پاتالی چڑیل نے حلول کر دیا تھا اس کا منہ بند تھا مگر مجھے اپنی اذیت ناک چیخوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

پھر مجھے ایسے لگا جیسے کسی نے میری دونوں آنکھوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا ہو۔ ہاتھ گرم تھا۔ چیونٹیاں میرے پپوٹوں سے اتر گئیں۔ گرم ہاتھ اوپر سے ہٹ گیا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے قبر کی دیوار پر اندھیرے میں دو لال انگارہ آنکھیں نظر آئیں، پھر ایک بھیانک جسم ابھرنے لگا۔ اس مکروہ جسم میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ یہ پاتالی چڑیل کا ہیولا تھا۔ میں نے اسے کچھ کہنا چاہا، لیکن نہ میری آواز نکلی، نہ میرے مردے کے ہونٹ اپنی جگہ سے ہلے۔ میری صرف سماعت اور بینائی کام کر رہی تھی۔ پاتالی چڑیل نے ایک ڈراؤنا قہقہہ لگایا اور کھڑکھڑاتی آواز میں کہا:

"ابھی میرے انتقام کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی۔ تم نے ایک بار موت کا مزا چکھا ہے ابھی تمہیں کئی بار موت کا مزا چکھنا ہے۔"

پھر اس نے دیوار میں سے اپنے لمبے نوکیلے ناخنوں والا ہاتھ لمبا کر کے مردے کے سینے میں اتار دیا۔ ایک جھٹکے سے اس نے ہاتھ باہر نکال لیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں ایک اندھیری قبر سے نکل کر دوسری اندھیری قبر میں آ گیا ہوں۔ لیکن اس دوسری قبر میں نہ میری آنکھوں پر چیونٹیاں رینگ رہی تھیں، نہ مجھے اپنے نیچے ٹھنڈی زمین کی نمی محسوس ہو رہی تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں میں بھی جان پڑ گئی تھی۔ مَیں ہاتھ ہلا سکتا تھا، پاؤں ہلا سکتا تھا مگر گھپ اندھیرے کی وجہ سے نہ مجھے اپنے پاؤں نظر آ رہے تھے نہ ہاتھ نظر آ رہے تھے گھپ اندھیری فضا میں بڑی تیز ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔ یہ احساس مجھ پر بجلی بن کر گرا کہ میرے ہاتھ پاؤں بالکل چھوٹے چھوٹے ہو گئے ہیں۔ مَیں نے اپنے جسم پر ہاتھ پھیرا، میرا جسم بھی چھوٹا ہو گیا تھا۔ مَیں انگوٹھے کے برابر چھوٹا ہو گیا تھا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔ جب ہوش آیا تو مَیں نے دیکھا کہ میں شیشے کی بوتل میں ہوں۔ مَیں اپنے پورے انسانی جسم میں ہوں، لیکن میرا جسم انگوٹھے جتنا چھوٹا ہو گیا تھا۔

مجھے بوتل، شیشے کا بہت بڑا کنواں معلوم ہو رہا تھا۔ جس بوتل میں مَیں بند تھا وہ ایک طاق میں رکھی ہوئی تھی۔ سامنے کی دیوار والے طاق میں ایک دیا روشن تھا۔ مَیں نے بوتل کے اندر آنکھیں اٹھا کر اوپر دیکھا۔ بوتل کا منہ کسی چیز سے بند تھا۔ اگر بوتل کا منہ کھلا بھی ہوتا تو شیشے کی گول دیوار چڑھ کر بوتل کے منہ تک پہنچنا میرے لئے ناممکن تھا۔

اتنے میں پاتالی چڑیل نمودار ہوئی۔ اس کے ننگے جسم سے دھوئیں کی لہریں اوپر کو اٹھ رہی تھیں۔ مَیں نے اسے کہنا چاہا کہ مَیں نے اپنی بہن کی محبت میں ایسا کیا تھا۔ مگر میری آواز نہ نکلی۔ پاتالی چڑیل اپنے دھواں آلود جسم کے ساتھ ایک ایک قدم چلتی میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ کہنے لگی:

"مَیں جانتی ہوں تم مجھے کیا کہنا چاہتے ہو۔ لیکن تم نے کامنی نرتکی کے ساتھ مل کر میرا شکار مجھ سے چھینا ہے اور میرے پاتال کے طلسمی منتروں کو بے اثر کیا ہے۔ جب تک مَیں تم سے اس بے عزتی کا پورا پورا بدلہ نہیں لے لوں گی، تمہیں نہیں چھوڑوں گی۔ اور تمہیں اس حالت میں چھوڑوں گی کہ نہ تم زندوں میں شمار ہو گے نہ مُردوں میں۔ اب مَیں تمہیں دوسری موت کا مزا چکھانے لیے جا رہی ہوں۔"

یہ کہہ کر پاتالی چڑیل نے بوتل کا ڈھکنا کھول کر اپنی نوکیلے ناخنوں والی دو انگلیاں بوتل کے اندر ڈالیں اور مجھے بوتل سے نکال کر اپنی مٹھی میں بند کر لیا۔ مَیں ایک بار پھر گھپ اندھیرے میں تھا۔ پاتالی چڑیل کی بند مٹھی کی انگلیوں کے درزوں میں سے تیز ہوائیں اندر آنے لگیں۔ جیسے وہ ہوا میں اڑی چلی جا رہی ہو۔ شاید یہ رات کا وقت تھا۔ کیونکہ اس کی انگلیوں کی درزوں میں سے کوئی روشنی بند مٹھی میں نہیں آ رہی تھی۔ مَیں چڑیل کی ناگوار تیز بو والی بند مٹھی میں گھٹنے اپنے سینے سے لگائے بیٹھا اپنی بدقسمتی پر آنسو بہا رہا تھا۔ کبھی انگریزی کارٹونوں میں مَیں نے جانوروں اور آدمیوں کو جادو کے زور سے چھوٹے چھوٹے ہوتے دیکھا تھا۔ اس وقت میرے تصور میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ ایک دن مَیں بھی کسی منحوس چڑیل کے جادو سے انگوٹھے جتنا چھوٹا کر دیا جاؤں گا۔ کافی دیر بعد چڑیل کی

بند مٹھی کی درزوں میں سے روشنی کی کرنیں اندر آنے لگیں۔ اس کے بعد لوگوں کی
آوازیں اور ٹریفک کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ کچھ دیر بعد طبلے اور ہارمونیم کے
ساتھ گھنگھروؤں کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ مجھے محسوس ہُوا کہ پاتالی چڑیل اب ہوا میں
نہیں اڑ رہی بلکہ کسی جگہ رک گئی ہے۔ اس نے مٹھی کھول دی اور مجھے اپنی دو انگلیوں
میں اس طرح پکڑ لیا' جس طرح آدمی شہید کی مکھی یا بڑے چیونٹے کو زمین سے پکڑ کر اٹھا
لیتا ہے۔

مَیں نے دیکھا کہ میں ایک سجے سجائے کمرے میں ہوں۔ قالین بچھے ہیں' گاؤ تکیے لگے
ہیں' خوشبوئیں اڑ رہی ہیں۔ ایک بھاری بھرکم ریشمی ساڑھی والی عورت گاؤ تکیے کے
سہارے بیٹھی پاندان کھولے پان لگا رہی ہے' ایک خوبصورت لڑکی ڈانس کر رہی ہے۔ اس
کے پاؤں میں بندھے ہوئے گھنگھروں چھنک رہے ہیں۔ ایک آدمی ہارمونیم' دوسرا طبلہ بجا
رہا ہے۔ مَیں سمجھ گیا کہ پاتالی چڑیل مجھے شہر کی کسی طوائف کے کوٹھے پر لے آئی ہے۔
اس نے مجھے انگلیوں میں پکڑ رکھا تھا۔ مَیں اس کے مکروہ چڑیلوں والے سیاہ فام جسم کو دیکھ
رہا تھا۔ اس کے جسم سے دھواں اٹھتے بھی دیکھ رہا تھا۔ مگر ایسا لگتا تھا کہ میرے سوا وہاں
اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ نہ طوائف کی ماں' نہ رقص کرتی طوائف اور نہ تماش بین
جو بڑھ بڑھ کر طوائف پر پیسے لٹا رہے تھے۔ کیونکہ اگر وہ پاتالی چڑیل کو دیکھ لیتے تو ان میں
سے کئی دہشت کے مارے بے ہوش جاتے اور باقی چیخیں مارتے بھاگ اٹھتے۔ مَیں پورا
انسانی جسم میں ایک ٹڈے کی طرح پاتالی کی انگلیوں میں جکڑا ہُوا تھا۔ پاتالی نے اپنی کھ
اور کھڑکھڑاتی آواز میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہا:

"اس تماش بین کو غور سے دیکھو' جس نے سلک کا کرتہ پہن رکھا ہے' اور گلے
سونے کی زنجیر سی ہے۔"

مَیں سب لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے سب انسان اسی طرح نظر آ رہے تھے جس طرح
مَیں اپنے نارمل قد کاٹھ میں دیکھا کرتا تھا۔ مَیں نے سلک کے کرتے والے اس آدمی

دیکھا جس کو دیکھنے کے واسطے مجھے پاتالی نے حکم دیا تھا۔ یہ موٹی توند والا پکی عمر کا تماش بین
تھا۔ کانوں میں مندریاں تھیں' جیسا کہ بعض شوقین ہندو پہنا کرتے ہیں۔ اس نے اپنے
آگے نوٹوں کی گڈیاں رکھی ہوئی تھیں اور مجرا کرتی طوائف پر نوٹ نچھاور کر رہا تھا۔
دوسرے تماش بین بھی روپے نچھاور کر رہے تھے۔ مگر سلکی قمیض والا تماش بین چونکہ
دس دس اور پچاس پچاس روپے کے نوٹ نچھاور کر رہا تھا' اس لئے طوائف زیادہ تر اسی
کے پاس جاتی تھی اور مجرا کرتے ہوئے آگے بڑھ کر اس کا منہ بھی چوم لیتی تھی۔ پاتالی
چڑیل نے کہا:

"ریشمی قمیض والا یہ تماش بین تھوڑی دیر بعد یہاں قتل کر دیا جائے گا۔"

مَیں نے چیخ کر کہا: "مگر تم مجھے یہاں کس لئے لائی ہو؟"

مَیں نے کافی اونچی آواز میں یہ فقرہ بولا تھا۔ مگر وہاں کسی نے میری آواز نہیں سنی تھی
لیکن پاتالی نے سن لی تھی۔ کہنے لگی۔

"مَیں تمہیں یہاں قتل کروانے کے لئے لائی ہوں۔"

خوف سے میرا جسم سن ہو گیا۔ پاتالی نے کہا:

"مَیں تمہیں اس تماش بین کے جسم میں داخل کر دوں گی' جسے تھوڑی دیر بعد یہاں
قتل ہونا ہے۔ اس طرح سے قتل یہ تماش بین ہو گا لیکن قتل ہونے کی تکلیف تم اٹھاؤ
گے۔"

مَیں نے پاتالی سے رحم طلب انداز میں کہا:

"پاتالی! مجھے معاف کر دو۔ مجھ سے غلطی ہو گئی تھی کہ مَیں اپنی بہن کو تمہارے آسیب
سے نجات دلانے کے لئے کامنی نرتکی کے پاس چلا گیا۔"

چڑیل پاتالی نے جیسے میری بات بالکل نہیں سنی تھی۔ اس نے الٹا مجھ سے سوال کیا:

"کیا زندگی میں کبھی تم پر کسی نے گولی چلائی ہے؟ اگر نہیں چلائی گئی تو آج تم اس کا
مزا چکھ لو گے۔ اب مَیں تمہیں قتل ہونے والے تماش بین کے جسم میں داخل کر رہی

ہوں۔"

پاتالی چڑیل کی وہاں نہ تو کوئی آواز سن رہا تھا' نہ وہ وہاں کسی کو نظر آ رہی تھ
طوائف اسی طرح مجرا کر رہی تھی اور تماش بین اسی طرح داد دے اور نوٹ نچھاور
رہے تھے۔ پاتالی چڑیل نے ایک بھیانک قہقہہ لگا کر اپنی چیخ نما ڈراؤنی آواز میں کوئی م
پڑھا اور مجھے اپنی مٹھی میں بند کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ایک ہلکا سا جھٹکا لگا اور م
آنکھیں اپنے آپ بند ہو گئیں۔ جب میں نے آنکھیں کھولیں تو میں طوائف کا مجرا
رہا تھا۔ میرا اپنا جسم قتل ہونے والے تماش بین کے جسم میں تحلیل ہو گیا تھا۔ تماش
طوائف پر نوٹ پھینکتا تو مجھے محسوس ہوتا کہ میں نوٹ پھینک رہا ہوں۔ وہ اپنے آ
رکھے ہوئے گلاس میں سے شراب پیتا تو مجھے محسوس ہوتا کہ میں شراب پی رہا ہو
تماش بین گانا سنتے ہوئے سر ہلا کر جھومتا تو مجھے محسوس ہوتا کہ میں سر ہلا کر جھو
ہوں۔ تماش بین کو ایک لمحے کے لئے بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ اس کے جسم میں
دوسرے کی روح حلول کر گئی ہے' لیکن مجھے پوری شدت سے محسوس ہو رہا تھا ک
تماش بین کے اندر ہوں اور اس کا جسم میرا جسم بن چکا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ ج
تماش بین قتل ہو گا تو قتل ہونے کے عذاب سے میں گزروں گا' یہ نہیں گزرے گا۔
چڑیل کا یہی مقصد تھا اور مجھے اس اذیت کا مزا چکھانے کے لئے اس نے مجھے اس
کے جسم میں داخل کر دیا تھا۔

قتل ہونے کے دردناک عذاب سے بچنے کے لیے بس یہی کر سکتا تھا کہ وہاں سے
کر بھاگ جاؤں۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ اس تماش بین کی مرضی کے بغیر وہاں
بھی نہیں سکتا۔ اس کا جسم ضرور میرا جسم بن چکا تھا مگر اس جسم پر حکم تماش بین ک
تھا' میرا نہیں چلتا تھا۔ میں نے سوچا کہ تماش بین کو کسی طریقے سے بتا دینا چاہیے
تھوڑی دیر بعد قتل ہو جائے گا' اس لئے وہاں سے بھاگ جائے۔ میں نے اپنی آوا
اونچا کر کے کہا۔ "یہاں سے بھاگ جاؤ۔ موت تمہارے سر پر آن کھڑی ہوئی ہے۔

کئے جانے والے ہو۔"

لیکن نہ مجھے اپنی آواز سنائی دی اور نہ اس تماش بین نے میری آواز سنی۔ وہ آگے
بڑھ بڑھ کر طوائف پر نوٹ لٹاتا رہا۔ اتنے میں سامنے بیٹھے ہوئے دوسرے تماش بین نے
اٹھ کر طوائف کو بازو سے پکڑا اور اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا:

"ہم بھی تمہارا مجرا سننے آئے ہوئے ہیں۔ صرف یہی ایک دولتیا نہیں ہے۔"

اس پر ریشمی قمیض والے تماش بین نے غصہ کھا کر کہا:

"ارے جا اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ۔ جس کے پاس مال ہو گا' یہ اسی کے پاس جائے گی۔"

دوسرا تماش بین مشتعل ہو گیا۔ اس نے میرے دیکھتے دیکھتے پستول نکالا اور ریشمی
قمیض والے تماش بین پر فائر کر دیا۔ گولی اس کے سینے پر لگی اور دل سے پار ہو گئی۔ میری
چیخ نکل گئی۔ یہ گولی جیسے میرے سینے پر لگی تھی اور میرے دل کے پار ہو گئی تھی۔ درد کی
ایک شدید ٹیس میرے دل سے اٹھی' جس نے میرے سارے جسم کو' میرے سارے
وجود کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ یہ درد کی ایک مسلسل ٹیس تھی' جو گرم آہنی
سلاخ کی طرح میرے دل میں گھس گئی تھی۔ تماش بین کے ساتھ ہی میں بھی خون میں
لت پت ہو کر گر پڑا تھا۔ انتہائی درد کی شدید لہریں میرے جسم سے کسی سمندری طوفان
کی طرح ٹکرا رہی تھیں۔ میں مسلسل درد کی ٹیس کی گردش میں تھا۔ تماش بین تو شاید مر
گیا تھا لیکن میں زندہ تھا اور جان کنی کی تکلیف اور موت کے عذاب سے گزر رہا تھا۔ میں
اس لئے زندہ تھا کہ مجھے مرنا نہیں تھا، صرف موت کی تکلیف اٹھانی تھی۔ موت کی
اذیت برداشت کرنی تھی۔ اس اعتبار سے میں مسلسل مر رہا تھا۔ میری حالت قابلِ رحم
تھی کہ میں مر کر بھی زندہ تھا۔ میرے حلق سے شدتِ درد سے مسلسل چیخیں نکل رہی
تھیں۔ مگر میری چیخیں کوئی نہیں سن رہا تھا۔ میرے اِرد گرد خون ہی خون تھا۔ طوائف'
طبلچی' سازندے اور تماش بین سب بھاگ گئے تھے۔

بازار میں شور مچ گیا کہ اوپر خون ہو گیا ہے۔ لوگ اوپر آ گئے' میں انہیں چیخ چیخ کر کہنے

لگا کہ مَیں مرا نہیں ہوں' میں زندہ ہوں۔ مجھے ہسپتال لے چلو۔ مگر نہ کوئی شخص وہاں میری آواز سن سکتا تھا' نہ مجھے دیکھ ہی سکتا تھا۔ وہ صرف تماش بین کی لاش کو دیکھ رہے تھے جو ٹھنڈی ہو کر خون میں لت پت پڑی تھی۔ انتہائی شدید درد کی لہریں میرے جسم کو کچوکے لگا رہی تھیں۔ جس تماش بین کے جسم میں پاتالی چڑیل نے مجھے داخل کر دیا تھا' وہ تو موت کی اذیت سے نجات حاصل کر چکا تھا لیکن مَیں اس اذیت سے مسلسل گزر رہا تھا۔ میری کوئی نجات نہیں تھی۔ مَیں مردہ تماش بین کی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا اور میرے حلق سے ایسی تکلیف دہ آوازیں نکل رہی تھیں' جن کو کوئی نہیں سن رہا تھا۔ اتنے میں پولیس آ گئی۔ انہوں نے میری لاش کو یعنی تماش بین کی لاش کو اٹھایا اور گاڑی میں ڈال ہسپتال پہنچا دیا۔

ہسپتال کے مردہ خانے میں تماش بین کی لاش کو سٹریچر پر ڈال دیا گیا۔ میری حالت اس بدنصیب انسان کی تھی' جس کی جان حلق میں آ کر اٹک گئی ہو۔ نہ مَیں مرا تھا نہ مَیں زندہ تھا۔ پاتالی چڑیل اس سے زیادہ بھیانک انتقام اور کیا لے سکتی تھی۔ مجھے میرے گناہوں کی سزا اِس دنیا میں رہتے ہوئے اور کیا مل سکتی تھی۔ ساری رات تماش بین کی لاش مر خانے میں پڑی رہی۔ مَیں بھی اس کے جسم میں نیم مردہ حالت میں پڑا رہا۔ معلوم ہوتا کہ اس تماش بین کا کوئی والی وارث نہیں ہے۔ کوئی لاش لینے نہیں آیا تھا۔ رات گز گئی۔ مَیں اپنے دل کے زخم سے اٹھنے والی درد کی ٹیسوں کو برداشت کرتے کرتے اَدھ مُوا گیا تھا۔ صبح ہو گئی' ہسپتال کے دو آدمی لمبے لمبے سفید کوٹ پہنے مردہ خانے میں داخ ہوئے اور لاش کے سٹریچر کو نکال کر نیچے ایک تہہ خانے کے کمرے میں لے گئے۔ وہا ایک ڈاکٹر اور اس کا اسسٹنٹ پہلے سے موجود تھے۔ لاش کو سٹریچر سے اٹھا کر دوسر سٹریچر پر ڈال دیا گیا۔ ہسپتال کا جو ملازم سٹریچر کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے ڈاکٹر سے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب! ایم ڈی صاحب نے کہا ہے کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ دوپہر تک مل چاہیے۔"

ڈاکٹر نے کہا: "ٹھیک ہے! تم جاؤ۔"

پوسٹ مارٹم کا نام سنتے ہی میرا دل جو پہلے ہی درد کی ٹیسوں سے نڈھال ہو چکا تھا' بنے لگا۔ میرے خدا! اب میرے جسم کا چیر پھاڑ ہو گا۔ مَیں نے میرا جسم اس لئے کہا ہے ۔ اس قتل ہونے والے تماش بین کے مردہ جسم کے اندر میرے تمام احساسات زندہ ے اور وہ ایک طرح سے میرا ہی زندہ جسم تھا' جس کا ڈاکٹر پوسٹ مارٹم کرنے والا تھا۔ رے ہونٹ بند تھے' آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں۔ جسم بے حس و حرکت تھا۔ مگر میرے دہ جسم کے ساتھ کوئی چیز چھو جاتی تھی تو مجھے اس کا لمس محسوس ہوتا تھا۔ مردے کی رائی ہوئی آنکھوں کے پیچھے میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور مَیں وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا میرے ساتھ ہو رہا تھا۔ مَیں اگر چیخ بلند کرتا تھا تو مجھے باقاعدہ اس کی آواز سنائی دیتی ی۔ اگرچہ میرے ہونٹ بند تھے' مگر میری چیخ کی آواز سوائے میرے اور کوئی نہیں سن تھا اور کسی کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

ڈاکٹر کے اسسٹنٹ نے وہ میز سٹریچر کے قریب کر دی' جس پر چھریاں' چھوٹی ڑیاں اور چمکیلی آریاں اور نشتر رکھے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر مردے کا پوسٹ مارٹم بڑی بے ی سے کرتے ہیں' اس لئے کہ انہیں پتہ ہوتا ہے کہ مردے کو تکلیف کا ذرا سا بھی اس نہیں ہو گا۔ لیکن انہیں کون بتاتا کہ اس مردے کے جسم میں میری روح زندہ ، میرا احساس زندہ تھا۔

میرے خدا! پاتالی مجھ سے کس قدر ہولناک انتقام لے رہی تھی۔ میرے جسم پر سے ہٹا دی گئی تھی۔ ڈاکٹر کے اسسٹنٹ نے میرے سارے جسم پر لال رنگ کی کوئی دوائی ی۔ ڈاکٹر نے آری ہاتھ میں پکڑی اور ایک ہاتھ سے لاش کے پیٹ کو دبانے لگا۔ مجھے ا ایسے ہی محسوس ہُوا کہ جیسے وہ میرے پیٹ کو دبا رہا ہے۔ مَیں نے چیخ مار کر کہا۔

"ڈاکٹر! میں مرا ہوا نہیں ہوں۔ مَیں زندہ ہوں' مَیں زندہ ہوں۔"

اس جملے کو دہرا دہرا کر میرا حلق خشک ہو گیا۔ لیکن ڈاکٹر پر کوئی اثر نہ ہُوا۔ وہ میری

آواز سنتا تو اِس پر اثر بھی ہوتا۔ وہ میری آواز سن ہی نہیں رہا تھا' نہ میرے ہونٹ ہل رہے تھے کہ وہ یہ دیکھتا کہ مردہ تو ابھی زندہ ہے۔ جو آری ڈاکٹر نے دوسرے ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی' اس کے ساتھ بجلی کی تار لٹک رہی تھی۔ یہ بجلی سے چلنے والی آری تھی۔ اس نے ایک بٹن دبایا۔ زوں کی آواز سے آری کے گول چکر نے تیزی سے گھومنا شروع دیا۔ ڈاکٹر نے سب سے پہلے لاش کے پیٹ پر آری رکھ کر اسے دائیں سے بائیں کو ڈالا۔ میرے حلق سے ایسی چیخ نکلی کہ اگر کوئی انسان سن لیتا تو اس کے کان کے پرد پھٹ جاتے۔ ڈاکٹر یوں اپنے کام میں لگا تھا' جیسے قصائی بکرے کا گوشت کاٹتا ہے۔ اس آری چلا کر جہاں دونوں طرف سے پسلیاں آکر ملتی تھیں' وہاں سے لاش کو اوپر حلق تک کاٹ ڈالا۔ درد کی شدت میری برداشت کی حد سے گزر گئی تھی' لیکن میں بے ہوش نہ ہو رہا تھا۔ اگر میں عام حالت میں ہوتا تو جب پہلی بار میرے پیٹ پر آری چلی تھی تو بے ہوش ہو گیا ہوتا لیکن یہ میری عام حالت نہیں تھی۔ مجھے زندگی اور موت درمیان لٹکا دیا گیا تھا۔

ڈاکٹر نے لاش کی پسلیوں کے نیچے ہاتھ ڈال کر ایک جھٹکے سے دل جسم سے الگ کر باہر نکال لیا۔ ڈاکٹر کے دستانے خون میں لت پت تھے۔ اس نے دل اپنے اِسسٹنٹ دکھاتے ہوئے کہا۔

"گولی سامنے کی طرف سے فائر ہوئی تھی۔ یہ دیکھو دل پر سامنے کی جانب سوراخ ہے لیکن پیچھے کی جانب سے دل کی بوٹیاں اڑ گئی ہیں۔"

اس کے بعد آری سے ڈاکٹر نے لاش کی کھوپڑی کو ایک طرف سے چیر ڈالا اور ک کا اوپر کا حصہ الگ کر دیا۔ میرا جسم مردہ تھا مگر میری روح شدت درد سے' شدت د سے لرز رہی تھی۔ ڈاکٹر نے دماغ کا کچھ حصہ نکال کر سپرٹ سے بھرے ہوئے ش مرتبان میں ڈال دیا۔ اسی طرح میرا دل بھی ایک مرتبان میں ڈال دیا گیا۔ پھر میرا گردے کاٹ کر علیحدہ کر دیئے گئے۔ انہیں بھی سپرٹ سے بھری ہوئی بوتلوں میں

گیا۔ اسسٹنٹ تختی پر لگے ہوئے کاغذ پر کچھ لکھتا جا رہا تھا۔

ڈاکٹر نے پوسٹ مارٹم کی کارروائی ختم کر دی تھی۔ میرے جسم کا ایک ایک ذرہ جیسے زخم بن کر دکھ رہا تھا۔ میں سر سے پاؤں تک درد کی ایک لہر بن گیا تھا' جو میرے جسم سے' میری روح سے بار بار ٹکرا رہی تھی اور میری چیخیں نکل رہی تھیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر اور اس کے اسسٹنٹ نے مل کر میرے پیٹ کو لمبے لمبے ٹانکے لگا کر سی دیا۔ اسی طرح میرے سر کے اوپر کاٹ کر الگ رکھی ہوئی کھوپڑی کو دوبارہ رکھ کر ٹانکے لگا کر جوڑ دیا گیا۔ ڈاکٹر نے اپنے دستانے اتار کر ایک طرف رکھ دیئے اور اپنے اسسٹنٹ کو یہ کہہ کر باہر نکل گیا کہ رپورٹ ابھی میرے پاس لے کر آ جاؤ۔ تھوڑی دیر بعد اسسٹنٹ بھی باہر چلا گیا۔ اس کے بعد ہسپتال کے پہلے والے دونوں ملازم اندر آئے اور میری کٹی پھٹی لاش کو میز پر سے اٹھا کر سٹریچر پر ڈالا اور مردہ خانے میں لا کر بند کر دیا۔

میری روح پر درد اور اذیت کے آرے چل رہے تھے۔ میں کراہ رہا تھا۔ میری چیخیں ختم ہو چکی تھیں۔ آنسو خشک ہو چکے تھے۔ صرف ایک لمبی کراہ میری روح کے اندر رہ گئی تھی اور وہی میرے حلق سے نکل رہی تھی۔ یہ اتنی ڈراؤنی کراہ تھی کہ جیسے کوئی چڑیل موت کے پھندے میں پھنس کر کراہ رہی ہو۔ اچانک مجھے دھوئیں کی کڑوی بُو محسوس ہوئی۔ میں لاش کے اندر زندہ تھا مگر لاش کی گردن ہلا کر دائیں بائیں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ پھر ایک دم سے سامنے سٹریچر کی پائنتی کی جانب منحوس پاتالی چڑیل نمودار ہوئی۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ سر کے بالوں اور جسم میں سے دھوئیں کی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ میں نے چلا کر کہا:

"منحوس چڑیل! اب تیرا کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا ہو گا۔ اب میری جان بخش دے۔" پاتالی نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا۔ کہنے لگی:

"نہیں! ابھی نہیں' ابھی میرے دل کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی۔ ابھی تمہیں ایک اور موت کا مزا چکھنا ہے۔"

اس نے ایک اور قہقہہ لگایا اور ہاتھ مُردے کے سینے کی طرف بڑھا کر اپنا ہاتھ اس کے سینے کے اندر داخل کر دیا۔ اس وقت میری آنکھیں اپنے آپ بند ہو گئیں اور موت کی درد ناک اذیت سے بھی مجھے چھٹکارا مل گیا۔ مَیں نے محسوس کیا کہ مَیں ایک بار پھر پاتالی چڑیل کی مٹھی میں بند ہوں اور مٹھی کے باہر تیز ہواؤں کا' آندھیوں کا شور مچا ہُوا ہے۔ مَیں اندھیرے میں اپنے آپ کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ مَیں نے اپنے جسم پر ہاتھ پھیرا تو مجھے محسوس ہُوا کہ مَیں اپنے انسانی جسم میں واپس آ گیا ہوں لیکن میرا جسم انگوٹھے کے برابر چھوٹا ہو چکا ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور مَیں گھٹنوں میں سر دے کر سمٹ سمٹا کر بند مٹھی کے اندر بیٹھ گیا۔

اس کے بعد مجھ پر نیم بے ہوشی کی کیفیت طاری ہو گئی اور کچھ دیر بعد مجھے بالکل ہوش نہ رہا کہ مَیں کہاں پر ہوں۔ ہوش آیا تو مَیں پہلے کی طرح شیشے کی بوتل کی تہہ میں بند پڑا تھا۔ وقت کا احساس ہی ختم ہو چکا تھا۔ نہ دن تھا' نہ رات تھی' نہ شام تھی' نہ دوپہر تھی' نہ سورج نکلتا تھا' نہ سورج غروب ہوتا تھا' نہ تارے چمکتے تھے' ہوش اور بے ہوشی کے درمیان کا ایک طویل لمحہ تھا۔ ایک طویل سفر تھا' جو کچھ معلوم نہیں تھا کہ کب شروع ہوا تھا اور کب ختم ہونے والا تھا۔ میری یادداشت ضرور قائم تھی۔ مجھے احساس تھا' مجھے معلوم تھا کہ میرا نام سلیم احمد ہے۔ لاہور کی اکبری منڈی میں میری دکان ہے۔ میرا دوست خالد میرا شریکِ کار ہے۔ میرے ماں باپ فوت ہو چکے ہیں اور عاصمہ میری بہن ہے' جس کو مَیں نے پاتالی چڑیل کے ہلاکت خیز قبضے سے نجات دلائی تھی اور اب پاتالی چڑیل مجھ سے اس کا انتقام لے رہی ہے۔

مَیں اپنا انگوٹھے کے برابر جسم لئے بوتل کی تہہ میں گم سم بیٹھا رہا۔ یہ پاتالی چڑیل کی آسیب زدہ کوٹھڑی تھی۔ اسی طرح کوٹھڑی میں آمنے سامنے دیوار پر دو دیئے جل رہے تھے۔ کبھی لگتا کہ دیئے بجھ رہے ہیں۔ کبھی لگتا اِن کی لَو پہلے سے زیادہ تیز ہو گئی ہے۔ کبھی ایسے محسوس ہوتا کہ کوٹھڑی میں گھپ اندھیرا ہو گیا ہے۔ مَیں کچھ ہوش میں تھا' کچھ

ہوش تھا۔

اس کے بعد مجھے واقعی کوئی ہوش نہ رہا۔

مجھے محسوس ہوا کہ میرے چھوٹے سے جسم سے ہوا کے تھپیڑے بار بار ٹکرا رہے
مجھے ہوش آ گیا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ مَیں بوتل میں نہیں تھا۔ مَیں پاتالی
ی کی مٹھی میں بند تھا۔ مٹھی میں وہی ناگوار تیز بو پھیلی ہوئی تھی۔ پاتالی چڑیل کی بند
وں کی درزوں میں سے کسی وقت روشنی کی چمک اندر آتی اور پھر غائب ہو جاتی۔ مَیں
مٹھی کے اندر گھٹنوں کے بل چل کر چڑیل کی انگلیوں کی درز میں سے جھانک کر
ا۔ مجھے آبادی کی عمارتوں کی روشنیاں جگمگاتی دکھائی دیں۔ مَیں نے نیچے دیکھا۔ نیچے
کشادہ سڑک پر روشنیاں ہو رہی تھیں اور گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ پاتالی چڑیل سڑک
انی بلندی پر اڑتی ہوئی مجھے کسی جگہ لئے جا رہی تھی۔ اسی نے مجھے کہا تھا کہ مَیں تمہیں
ار موت کا مزا چکھاؤں گی اور اس وقت تک تمہیں موت کی اذیت سے گزارتی رہوں
جب تک کہ میرے انتقام کی آگ ٹھنڈی نہیں پڑ جاتی۔

میں اب تیسری موت مرنے جا رہا تھا۔

معلوم نہیں اس بار وہ مجھے کس طریقے سے مارنا چاہتی تھی۔ مَیں پاتالی چڑیل کی بند
ا کی درز میں سے نیچے شہر کی روشنیوں کو پیچھے کی طرف تیزی سے جاتے دیکھ رہا تھا۔
ایسے لگ رہا تھا جیسے میں کسی ہیلی کاپٹر میں بیٹھا شہر کے اوپر سے گزر رہا ہوں۔ جب
کی روشنیاں پیچھے رہ گئیں تو پاتال چڑیل نے اُڑتے اُڑتے اپنی بلندی کم کرنی شروع کر
۔ ایک جگہ کسی آبادی کی اِکا دکا روشنیاں نظر آئیں۔ پاتالی چڑیل اس آبادی کے اوپر آ
۔ اس نے آبادی کے اوپر دو چکر لگائے' پھر وہ ایک مکان کی چھت پر اتر گئی۔

خدا جانے یہ ہندوستان کا کونسا شہر تھا۔ یہ اس شہر کی باہر ہی کی کوئی کالونی تھی۔ ماڈرن
ز کے درمیانے درجے کے کوارٹر ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ بنے ہوئے تھے۔ جس
لنا پر پاتال چڑیل اتری تھی' اس مکان میں سے عورتوں کے رونے اور بین کرنے کی

آوازیں آ رہی تھیں۔ اس مکان میں کوئی مرگیا تھا۔ پاتالی نے مٹھی بند کر رکھی تھی،
مٹھی کی انگلیوں کی درز میں سے باہر دیکھ رہا تھا۔ پاتالی چڑیل نے مکان کی چھت پر سے
صحن میں چھلانگ لگا دی۔ وہ ایک دم نیچے گرنے کی بجائے آہستہ آہستہ نیچے آگئی۔
کے صحن میں روشنی ہو رہی تھی۔ اس روشنی میں مجھے بانس جوڑ کر بنایا ہوا ایک لمبا
سا دکھائی دیا۔ مَیں سمجھ گیا کہ یہ کسی ہندو کا گھر ہے۔ یہاں کسی کی موت واقع ہو گئی
اور صحن میں مردے کو شمشان گھاٹ لے جانے کے واسطے بھوپان تیار کیا جا رہا
مسلمان میت کو لے جاتے ہیں تو اسے ایک مخصوص چارپائی پر ڈال کر اسے اوپر سے
سبز چادر سے ڈھانپ کر لے جاتے ہیں اور اسے جنازہ کہا جاتا ہے۔ ہندو اپنے مر
جلانے کے لئے شمشان گھاٹ بانسوں سے جوڑ کر بنائے ہوئے جس سٹریچر پر ڈال کر
جاتے ہیں' اسے بھوپان کہتے ہیں۔ چنانچہ جب کسی ہندو کا مردہ شمشان کی طرف لے
رہا ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ بھوپان جا رہا ہے۔

پاتالی چڑیل مجھے مکان کے اس کمرے میں لے گئی جہاں سے عورتوں کے بین کر
دبی دبی دردناک آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ مردہ عورت کمرے کے ف
پڑی ہے۔ اس کا صرف منہ ننگا ہے۔ باقی سارا جسم سرخ ریشمی کپڑے سے ڈھکا ہوا
ہندوؤں کے گھر میں جب کوئی مر جاتا ہے تو اسے فوراً چارپائی یا پلنگ پر سے اٹھا کر
ڈال دیتے ہیں۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ اگر مرنے کے بعد ایک منٹ بھی مردہ
چارپائی پر پڑا رہے تو اس کی بدروح اس گھر کو چمٹ جاتی ہے اور گھر والوں کو اس
تک ڈراتی اور تنگ کرتی رہتی ہے جب تک کہ اس گھر میں کوئی اور نہیں مر جاتا
مردہ خواہ کسی امیر کا ہو' غریب کا ہو یا وہاں کے پردھان منتری کا ہو' اس کی جان
اسے پلنگ پر سے اٹھا کر فوراً زمین پر ڈال دیا جاتا ہے۔

اس گھر میں کسی عورت کی موت واقع ہوگئی تھی اور اس کے مردے کو فرش
ہوا تھا۔ اس کے اِردگرد عورتیں بیٹھی بین کر رہی تھیں۔ مَیں نے ایک نظر مردہ ع

ا مردہ عورت نوجوان لڑکی تھی۔ اس کے مردہ جسم پر سرخ ریشمی چادر اس لئے ڈال
ئی تھی کہ اس کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ یہ بھی مجھے معلوم تھا کہ اگر کوئی
اری ہندو لڑکی فوت ہو جائے تو اس کے جسم کو سرخ ریشمی چادر میں لپیٹ کر شمشان
ے لے جایا جاتا ہے۔ چڑیل --- لڑکی کے مردہ جسم کے پاؤں کی طرف کھڑی تھی۔
نے مٹھی کھول دی اور مجھے اس طرح دو انگلیوں کی چٹکی میں پکڑ لیا اور اپنی دہکتی ہوئی
خ آنکھوں کے قریب لا کر بولی:

"اب میں تمہیں ایک تیسری قسم کی موت کا مزا چکھاؤں گی۔ یہ آگ کی موت ہوگی۔"

پاتالی نے ایک قہقہہ لگایا اور مجھے دوبارہ مٹھی میں بند کر کے نو جوان لڑکی کے مردہ جسم
ڈال دیا۔ میں پاتالی چڑیل کے رحم و کرم پر تھا۔ میں سوائے قسم قسم کی موت کی اذیت
شت کرنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ مردہ لڑکی کے جسم میں داخل ہوتے ہی مجھے
ے پہلا جو احساس ہوا وہ یہ تھا کہ میری ٹانگیں' بازو' ہاتھ' پاؤں سب کچھ لڑکی کے
ہ جسم میں حلول کر گئے ہیں۔ صرف میرا دماغ مردہ لڑکی کے دماغ سے الگ تھا۔ لڑکی
مردہ جسم کو تو کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا ہوگا لیکن مجھے سب کچھ محسوس ہو رہا تھا۔
ی ٹانگوں بازوؤں اور سارے جسم میں جان پڑ گئی تھی۔ یہ ٹانگیں' ہاتھ پاؤں اور بازو
ہ لڑکی کے تھے لیکن ان کا احساس میرا تھا۔ یہ ایک انتہائی اذیت ناک احساس تھا۔ مردہ
ا کی آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں۔ لیکن ان پتھرائی ہوئی آنکھوں کے پیچھے بینائی میری
ے میں وہاں سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ مردے کے پاؤں کی جانب جہاں پہلے پاتالی چڑیل
ڑی تھی' اب وہاں سے وہ غائب ہو چکی تھی۔

اب مجھے اس لڑکی کے ساتھ چتا کی آگ میں جلنا تھا اور ایک بہت بڑی المناک موت
، تجربے سے گزرنا تھا۔ یہ آگ میں جلنے والی موت تھی۔ تھوڑی دیر بعد لڑکی کے مردہ
م کو اٹھا کر بانس کے سٹریچر یعنی بھوپان پر ڈال دیا گیا اور اس کے رشتے دار اس کا بھوپان
ا جنازہ اٹھا کر شمشان گھاٹ کی طرف چل پڑے۔ وہ راستے میں یہ بولتے جاتے تھے'

رام نام ست ہے' رام نام ست ہے۔ ست سنسکرت زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی
کسی شے کی اصلیت' کسی شے کی حقیقت اور کسی شے کی سچائی۔ ہم بھی یہ لفظ عام بو
ہیں۔ جیسے اس جڑی بوٹی کو گھونٹ کر اس کا ست نکال کر پی جاؤ یا اب اس شخص
ست باقی نہیں رہا یعنی اس کی اصل طاقت ختم ہو گئی ہے۔ میری بھی اصل طاقت
ہو چکی تھی۔ میرے اختیار میں سوائے اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے کے
کچھ نہیں تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور مردہ لڑکی کی آنکھوں سے دیکھنا بند
تھا۔ خدا جانے یہ لوگ مردے کا بھوپان لے کر کہاں کہاں سے گزرتے رہے۔ آخر
جگہ بھوپان زمین پر رکھ دیا گیا۔ مَیں نے آنکھیں کھول دیں۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک
کے اوپر بجلی کا بلب روشن ہے۔ بلب کی روشنی میں مجھے سامنے ایک چبوترا دکھائی دیا
پر مردے کو جلانے کے لئے بڑی بڑی لکڑیاں رکھ کر چتا بنائی جا رہی تھی۔

جب چتا تیار ہو گئی تو لڑکی کے مردے کو اٹھا کر چتا پر لٹا دیا گیا۔ اس کے بعد مر
کے اوپر بھی لکڑیاں رکھی جانے لگیں۔ اس بات کا پورا انتظام کیا جا رہا تھا کہ مر
چاروں طرف سے جل کر رکھ ہو جائے۔ جسم کا کوئی حصہ اَدھ جلا نہ رہ جائے۔ اس
مجھے خیال آنے لگا کہ جب یہ لڑکی زندہ تھی تو اس کے بہن بھائی' ماں باپ اس
پیار کرتے ہوں گے۔ اگر اس کا کوئی محبوب ہوگا تو وہ اس پر جان نچھاور کرنے کو ت
ہوگا۔ اس کا ذرا سا ہاتھ جل جاتا ہوگا تو سب اس کی بلائیں لینے لگ جاتے ہوں۔
جسم کے جلے ہوئے حصے پر طرح طرح کی مرہم لگاتے ہوں گے' لیکن آج وہی لوگ
دہکتی ہوئی آگ میں جھونک رہے ہیں۔ افسوس! صد افسوس! کس قدر بے حقیق
ناپائیدار ہیں یہ سب دنیاوی رشتے! یہ سب دنیاوی محبتیں۔

مَیں دیکھ رہا تھا کہ شمشان بھومی کے باوے یعنی مردے کو جلانے والے لکڑیاں
کر مردہ لڑکی کے جسم پر لگاتے جا رہے تھے۔ وہ اصل میں لڑکی کے مردہ جسم پر
میرے زندہ جسم پر لکڑیاں چن رہے تھے۔ جب چتا بالکل تیار ہو گئی تو لکڑیوں کے

ڈالا جانے لگا۔ ایک مہنت سنسکرت کے اشلوک برابر پڑھتا جاتا تھا۔ جب ساری چتا کی
لکڑیاں گھی میں تر ہو گئیں تو ایک مہنت یا پجاری جلتی ہوئی مشال لے کر آ گیا۔ اس نے
لڑکی کے بھائی کو بلا کر کہا:

"اگنی دیوی کے سپرد کرو۔"

ایک نوجوان آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں پتلی سی چھڑی تھی۔ اس نے چھڑی مشال
کے شعلے کے ساتھ لگا کر جلائی اور پھر چتا کی لکڑیوں کو آگ دکھاتا ہوا چتا کے چاروں طرف
گھوم گیا۔ گھی میں تر کی ہوئی لکڑیوں نے فوراً آگ پکڑ لی۔ مردہ لڑکی کا جسم چتا کی لکڑیوں
میں چھپا ہوا تھا۔ میں نے پہلے اپنے اِردگرد دھواں اور پھر شعلے اٹھتے محسوس کیے۔ دیکھتے
دیکھتے میرے چاروں جانب آگ کے شعلے دیواریں بن کر لہرانے لگے اور میرا جسم اس
آگ میں جلنے لگا۔ جسم لڑکی کا جل رہا تھا مگر جلنے کی اذیت کا احساس مجھے ہو رہا تھا۔ یہ مجھے
سب سے زیادہ تکلیف دہ موت محسوس ہو رہی تھی۔ میرے اوپر' نیچے' دائیں بائیں آگ
ہی آگ تھی۔ شعلے ہی شعلے تھے۔ ان شعلوں کی قیامت خیز تپش نے مجھے جلانا شروع کر
دیا تھا۔ اچانک ایک ایسی بات ہوئی جس کا مجھے گمان تک نہیں تھا' مجھے ایک زبردست
دھکا لگا اور جیسے کسی نے مجھے نیچے سے اوپر اچھال دیا اور مَیں چتا کے شعلوں میں سے
اچھل کر باہر جا پڑا۔ پہلے تو مجھے یقین نہ آیا کہ میں چتا کے شعلوں سے نکل آیا ہوں۔

میں جہاں گرا تھا وہیں پڑا رہا۔ پھر باہر کی ٹھنڈی ہوا میرے جسم کو چھونے لگی۔ میں
نے آنکھیں کھول کر دیکھا کہ میں چتا کی آگ سے نکل آیا ہوں۔ کسی نے مجھے نیچے سے
اچھال کر چتا کی آگ سے باہر پھینک دیا تھا۔ ایسا کس نے کیا تھا؟ یہ کس کا ہاتھ تھا' جس
نے مجھے شعلوں میں جل کر مرنے سے بچا لیا تھا؟ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کیا مردہ
لڑکی نے مجھے باہر پھینکا تھا؟ مگر لڑکی تو مر چکی تھی۔ اگر وہ مجھے آگ سے باہر پھینک سکتی
تھی تو وہ خود چتا کے شعلوں سے باہر کیوں نہیں آ گئی؟ مَیں نے بہرحال خدا کا شکر ادا کیا کہ
میں آگ میں جلنے کی اذیت سے بچ گیا تھا۔ میں چتا کے چبوترے سے کافی دور ایک جھاڑی

میں گرا تھا۔ سب سے زیادہ خوشی مجھے یہ دیکھ کر ہوئی کہ میرا قد اور میرا جسم انگوٹھے کے برابر نہیں رہا تھا۔ بلکہ میں پورے قد کاٹھ کے ساتھ بڑا ہو چکا تھا۔ یعنی جس طرح میں پہلے اپنے نارمل انسانی جسم میں تھا' میں اسی جسم میں واپس آ گیا تھا۔ میں اس خیال سے وہاں سے ایک طرف کو دوڑ پڑا کہ کہیں پاتالی چڑیل مجھے میرے انسانی جسم میں واپس آتے دیکھ کر مجھے پھر سے چھوٹا نہ کر دے۔

مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں پاتالی چڑیل کے طلسم سے آزاد ہو چکا ہوں۔ ورنہ میں کبھی اپنی اصلی حالت میں واپس نہیں آ سکتا تھا۔ میرا اپنے اصلی جسم میں اپنے پورے لباس کے ساتھ واپس آ جانا اس بات کا ثبوت تھا کہ چڑیل پاتالی نے مجھ پر جو جادو کیا تھا اس کا زور ٹوٹ چکا تھا اور اب میں اس کے قبضے میں نہیں ہوں۔ میں شمشان گھاٹ اور جلتی ہوئی چِتا کے شعلوں سے دور ایک کھیت میں دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ جب مَیں دوڑتے دوڑتے تھک گیا تو کھیت کی مینڈھ پر بیٹھ گیا۔ مَیں نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ دور کچھ فاصلے پر مردہ لڑکی کی چتا سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ ایک خوف میرے دل میں بار بار پیدا ہو رہا تھا کہ چڑیل پاتالی کو ابھی شاید میری کایا پلٹ کا پتہ نہیں چلا۔ کیونکہ وہ چتا کے پاس نہیں ہو گی۔ جیسے ہی اسے معلوم ہو گا کہ میں اس کے طلسمی پنجے سے آزاد ہو گیا ہوں وہ اسی وقت آندھی کی طرح میرے سر پر پہنچ جائے گی اور مجھے پھر سے اپنے قبضے میں کر لے گی۔ میں نے اٹھ کر دوبارہ دوڑنا شروع کر دیا۔ رات گہری ہو چکی تھی۔ میرے اِرد گرد کھیتوں پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مَیں کہیں رکے بغیر دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ میرا سانس پھول گیا۔ میں اتنا تھک گیا کہ میرے لئے مزید دوڑنا ناممکن ہو گیا۔

میں وہیں کھیت میں گر پڑا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ خدا جانے یہ کون سا علاقہ تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور خدا کے حضور تصور ہی تصور میں سجدہ ریز ہو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مَیں نے صدقِ دل سے دعا مانگی کہ یا اللہ پاک! مجھے اس منحوس چڑیل کے طلسم سے

ے لئے آزاد کر دے اور مجھے میرے شہر لاہور پہنچا دے۔ مجھے لاہور میں اپنا گھر' اپنی ن اور اپنی بہن یاد آنے لگی۔ کیا خبر اب میں اپنے شہر لاہور اور اپنے گھر کبھی پہنچ بھی ں گا یا نہیں۔ پاتالی چڑیل مجھے اتنی آسانی سے چھوڑنے والی نہیں تھی۔ جیسے ہی اسے را پتہ چلا کہ میں اس کے طلسم سے نکل آیا ہوں وہ طوفانی بگولے کی طرح میرے پاس آ ئے گی اور مجھے پھر سے اپنے قبضے میں کر لے گی۔ میں کھیت میں سے اٹھا اور دوڑنے ۔ کچھ فاصلے پر مجھے جھلملاتی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ میرا رخ ان روشنیوں کی طرف تھا۔ پتہ نہیں یہ کسی شہر کی روشنیاں تھیں یا کسی قصبے یا ریلوے سٹیشن کی روشنیاں ں۔ میں دوڑتے دوڑتے اب اتنا تھک گیا تھا کہ میری ٹانگوں میں مزید دوڑنے کی سکت ں رہی تھی۔ میں دوڑنا بند کر کے تیز قدموں سے چلنے لگا۔

جھلملاتی روشنیاں قریب ہوتی جا رہی تھیں۔

مجھے ان روشنیوں میں اب ایک جگہ زمین سے بلندی پر سرخ روشنی بھی نظر آنے ا تھی۔ میرے دل نے کہا ضرور یہ کوئی ریلوے سٹیشن ہے' جس کے سگنل کی یہ سرخ ا ہے۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ کھیتوں اور میدانوں میں کچھ دور تک چلنے کے بعد ایک نچا بند آ گیا۔ میں بند کے اوپر چڑھا تو دیکھا کہ یہ ایک ریلوے لائن تھی۔ ریلوے لائن کو یکھ کر مَیں بڑا خوش ہوا۔ مَیں کسی ٹرین میں سوار ہو کر اس منحوس علاقے سے بہت دور ا سکتا تھا۔ بائیں جانب دور بہت سی روشنیاں تھیں۔ یہ یقیناً کسی ریلوے سٹیشن کی وشنیاں تھیں۔ مَیں نے ریلوے لائن کے ساتھ جلدی جلدی چلنا شروع کر دیا۔ رات رد تھی۔ اس سردی سے مَیں نے اندازہ لگا لیا کہ مَیں ملک ہندوستان کے شمالی علاقہ جات ں ہی ہوں۔ کیونکہ ہندوستان میں صرف شمالی علاقوں میں سردیوں میں سردی پڑتی ہے۔ وبی علاقوں میں سردی نہیں ہوتی۔ گرمی بہت زیادہ پڑتی ہے۔ سردیوں کے دنوں میں وسم خوشگوار ہو جاتا ہے اور اس کے فوراً بعد پھر سے گرمی پڑنے لگتی ہے۔

مَیں نے کرتا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ اوپر پرانی جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ دوڑنے اور تیز چلنے

سے ویسے بھی سردی کا احساس ختم ہو گیا تھا۔ میں لائینوں لائن چلتا ریلوے سٹیشن پر
ایک پلیٹ فارم پر آگیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مجھے یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں منحوس
چڑیل پاتالی میرا پیچھا نہ کر رہی ہو۔ میرے پیچھے دور تک خالی ریلوے لائن ہی نظر آ رہی
تھی۔ مجھے کچھ یقین سا ہونے لگا کہ خدا نے میری دعا قبول فرما لی ہے اور میں پاتالی کے
طلسم سے نجات حاصل کر چکا ہوں۔ مَیں نے فوراً فیصلہ کر لیا کہ یہاں سے میں کسی ا
ٹرین میں سوار ہونے کی کوشش کروں گا جو لاہور جا رہی ہو۔ مَیں نے اپنی جیبیں ٹٹول
دیکھا تو معلوم ہوا کہ میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ میری ساری جیبیں خ
تھیں۔ مَیں نے سوچا کہ میں بغیر ٹکٹ ہی لاہور جانے والی گاڑی میں بیٹھ جاؤں گا۔ میں
معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہ کس شہر کا سٹیشن ہے اور کیا یہاں سے کوئی گاڑی لاہور کی طر
جاتی ہے۔ میرے ہونٹ خشک ہو گئے تھے' مگر مجھے پیاس بالکل نہیں لگ رہی تھی
بھوک ہی محسوس ہو رہی تھی۔ مَیں اسی نتیجے پر پہنچا کہ مجھ پر پاتالی چڑیل کے جادو کا
ہے۔ صبح مجھے پیاس بھی لگے گی اور بھوک بھی لگ جائے گی۔ ریلوے سٹیشن پر پو
کے سپاہیوں کو دیکھ کر میرا حوصلہ بڑھ گیا تھا اور مجھ میں خود اعتمادی بھی واپس آ گئی تھ

یہ کوئی اتنا بڑا ریلوے سٹیشن نہیں تھا۔ پلیٹ فارم پر چند ایک مسافر اپنے سامان
پاس بیٹھے تھے۔ ایک جگہ چائے کے سٹال کے پیچھے دیوار پر انگریزی اور اردو میں سٹیشن
نام دھول گھاٹ لکھا ہوا تھا۔ خدا جانے یہ کس علاقے کا سٹیشن تھا۔ ایک ہی پلیٹ فارم
جہاں ایک ہی ریلوے لائن تھی۔ دوسری طرف ریل کی پٹڑیوں پر دو تین بوگیاں
تھیں۔ مَیں نے سوچا کہ کسی سے معلوم کرنا چاہیے کہ یہاں سے لاہور کی طرف کوا
گاڑی جاتی ہے۔ پلیٹ فارم کے گیٹ پر ریلوے کا ٹکٹ چیکر سٹول پر بیٹھا اپنے
کھڑے پولیس کے سنتری سے باتیں کرنے میں مشغول تھا۔ میں نے سوچا کہ اس
سے لاہور جانے والی ٹرین کا پتہ کرنا چاہیے۔ مَیں ٹی ٹی کے پاس آگیا۔ میں نے پوچھا:

"جناب یہاں سے لاہور کی طرف بھی کوئی ٹرین جاتی ہے؟"

ٹی ٹی نے جیسے میری بات بالکل نہ سنی تھی وہ اسی طرح بیٹھا سنتری سے ہنس ہنس کر باتیں کیے جا رہا تھا۔ میں نے دوبارہ پوچھا۔ "کیوں جناب! یہاں سے لاہور کی طرف کوئی گاڑی جاتی ہے؟"

اس دفعہ بھی ٹی ٹی نے میری بات پر کوئی دھیان نہ دیا۔ بلکہ میری طرف دیکھا بھی نہیں۔ مجھے اس ریلوے آفیسر کی بدتمیزی پر سخت غصہ آیا۔ مگر مَیں نے اسے کچھ نہ کہا اور گیٹ سے نکل کر سٹیشن کی ڈیوڑھی میں آگیا کہ بکنگ آفس سے معلوم کرتا ہوں۔ بکنگ آفس کی کھڑکی کے آگے ایک دیہاتی کھڑا ٹکٹ لے رہا تھا۔ وہ ٹکٹ لے کر وہاں سے ہٹا تو مَیں کھڑکی کے پاس آگیا۔ مَیں نے جھک کر اندر دیکھا۔ درمیانی عمر کا بکنگ کلرک کھڑکی کی طرف پشت کئے شیلف کے خانوں میں ٹکٹوں کی گڈیاں جوڑ جوڑ کر رکھ رہا تھا۔ مَیں نے پوچھا:

"کیوں جناب! یہاں سے لاہور کی طرف کونسی گاڑی جائے گی؟"

بکنگ کلرک اپنے کام میں لگا رہا۔ اس نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ مَیں نے ذرا اونچی آواز میں کہا:

"جناب! مَیں آپ سے مخاطب ہوں۔ پلیز مجھے بتایئے کہ کیا یہاں سے کوئی ٹرین لاہور کی طرف جاتی ہے؟"

بکنگ کلرک پر اب بھی کوئی اثر نہ ہُوا۔ میرا جی چاہا کہ مَیں کوئی پتھر اٹھا کر بکنگ کلرک کے سر پر دے ماروں۔ بکنگ آفس کی کھڑکی پر لوہے کا جنگلا چڑھا ہُوا تھا۔ اس کے درمیان میں ہاتھ ڈالنے کے لئے تھوڑی سی جگہ بنی ہوئی تھی۔ جنگلے کے پاس اندر کی جانب ایک پیپرویٹ پڑا تھا۔ مَیں نے اسے اٹھا کر کاؤنٹر پر دو تین بار آہستہ آہستہ مارا۔ اس کی آواز پر بھی بکنگ کلرک نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ مَیں سوچنے لگا کہ یا تو اس ریلوے سٹیشن کے سٹاف کے لوگ بہرے ہیں اور یا پھر بے حد مغرور ہیں اور مسافروں کا انہیں بالکل خیال

نہیں ہے۔ مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن میں غصہ پی گیا۔ عین اس وقت بکنگ کلرک شیلف سے ہٹ کر کھڑکی کے آگے جو اونچی کرسی تھی' اس پر آ کر بیٹھ گیا۔ اب اس کا رخ میری طرف تھا۔ مَیں نے بڑے آرام سے پوچھا۔ "کیوں جناب! یہاں سے لاہور کی طرف کوئی گاڑی جاتی ہے؟"

جب اس بار بھی بکنگ کلرک نے نہ تو میری طرف دیکھا اور نہ میرے سوال کا جواب دیا تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ مجھے ایسا لگا کہ یہ بکنگ کلرک صرف بہرہ ہی نہیں ہے بلکہ نابینا بھی ہے۔ مَیں نے ہاتھ اندر ڈال کر پیپر ویٹ دوبارہ اٹھایا اور اسے کاؤنٹر پر بجاتے ہوئے اونچی آواز میں کہا:

"کیوں جناب آپ بہرے ہیں کیا؟ مَیں بول بول کر تھک گیا ہوں اور آپ میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ رہے؟"

مَیں نے پیپر ویٹ کاؤنٹر پر رکھ دیا تھا۔ مَیں نے دیکھا کہ بکنگ کلرک ٹکٹکی باندھے پیپر ویٹ کو تک رہا تھا۔ مجھے سخت غصہ آ گیا۔ مَیں نے پیپر ویٹ اپنی طرف کھسکا لیا اور تلخ لہجے میں کہا:

"آپ میری بات کا جواب کیوں نہیں دے رہے؟ مَیں آپ کی شکایت کروں گا۔"

بکنگ کلرک پھٹی پھٹی آنکھوں سے پیپر ویٹ کو دیکھ رہا تھا۔ جسے مَیں نے اپنی طرف کھسکا لیا تھا۔ بکنگ کلرک نے ہاتھ آگے کر کے پیپر ویٹ کو دوبارہ وہاں رکھ دیا جہاں وہ پہلے موجود تھا۔ مَیں نے پیپر ویٹ کو دوبارہ اپنی طرف کھسکا لیا۔ بکنگ کلرک بدک کر کرسی سے اترا اور پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ مسلسل پیپر ویٹ کو تک رہا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ پاگلوں کا ریلوے سٹیشن ہے۔ مَیں نے بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ اس شخص سے پوچھ کر رہوں گا۔ بکنگ کلرک نے اپنی پنسل کاؤنٹر پر ایک طرف رکھ دی تھی۔ مَیں نے ہاتھ آگے کر کے پنسل پکڑ لی اور اسے کاؤنٹر پر بجاتے ہوئے کہا:

"مَیں اس وقت تک آپ کو نہیں چھوڑوں گا جب تک آپ مجھے یہ نہیں بتائیں گے کہ یہاں سے لاہور کی طرف کوئی ٹرین جاتی ہے یا نہیں؟"

مَیں نے دیکھا کہ ادھیڑ عمر بکنگ کلرک کا چہرہ خوف زدہ سا ہو گیا ہے۔ اس نے کسی کو آواز دی۔ ایک چپڑاسی دوسری طرف سے نکل کر وہاں آ گیا۔ "کیا بات ہے بابو جی؟"

چپڑاسی نے آتے ہی بکنگ کلرک سے پوچھا۔ بکنگ کلرک کی نظریں اس پنسل پر جمی ہوئی تھیں جو میرے ہاتھ میں تھی۔ اس نے سہمی ہوئی آواز میں چپڑاسی سے کہا: "یہ پنسل دیکھ رہے ہو؟"

چپڑاسی نے پنسل کی طرف دیکھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ لوگ کیا ڈرامہ کر رہے ہیں۔ مَیں نے پنسل کاؤنٹر پر زور سے پٹخ دی اور چپڑاسی سے مخاطب ہو کر کہا۔

"تمہارا افسر تو گونگا بہرہ اور اندھا ہے تم ہی مجھے بتا دو کہ یہاں سے کوئی گاڑی لاہور کی طرف جاتی ہے؟"

چپڑاسی نے بھی جیسے میری آواز بالکل نہیں سنی تھی۔ وہ بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے پنسل کو دیکھ رہا تھا جو میرے ہاتھ سے پٹخے جانے کے بعد پیپر ویٹ کے ساتھ جا کر لگ گئی تھی۔ چپڑاسی نے ہاتھ باندھ کر کہا:

"ہے رام' ہے رام!"

بکنگ کلرک دھیمی اور سہمی ہوئی آواز میں کہنے لگا:

"رامو! پہلے پیپر ویٹ اپنے آپ اوپر کو اٹھ کر نیچے آ گیا تھا۔ اب پنسل اپنے آپ اوپر کو اٹھ کر کاؤنٹر پر گر پڑی ہے۔" چپڑاسی کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا:

"بابو رام ناتھ جی! مَیں سٹیشن ماسٹر صاحب کو بلاتا ہوں۔"

اور چپڑاسی جلدی سے دوسری طرف نکل گیا۔ اس کے جانے کے دو سیکنڈ بعد ہاتھ کانوں کو لگا کر رام رام' رام رام کا جاپ کرتا بکنگ کلرک بھی اس طرف نکل گیا جدھر

چپڑاسی گیا تھا۔

مَیں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ اب اس میں کوئی شک شبہ نہیں رہا تھا کہ یہ پاگلوں کا ریلوے
سٹیشن تھا اور یہاں کا سارا عملہ پاگلوں پر مشتمل تھا۔ مَیں کھڑکی سے ہٹ کر دوبارہ پلیٹ
فارم پر آگیا۔ جب مَیں گیٹ میں سے گزرنے لگا تو ٹی ٹی بابو اسی طرح سنتری سے باتوں میں
مصروف تھا۔ میرے آگے ایک مسافر تھا۔ وہ گزرنے لگا تو ٹی ٹی نے اسے کہا۔ "ٹکٹ
دکھاؤ۔"

مسافر نے صدری کی جیب سے ٹکٹ نکال کر ٹی ٹی کو دیا۔ اس نے ٹکٹ چیک کر
اس پر پنسل سے نشان لگایا اور مسافر کو ٹکٹ واپس کر کے کہا۔ "جاؤ۔"

مسافر دروازے سے نکل گیا۔ اب میری باری تھی۔ مَیں گزرنے لگا تو ٹی ٹی نے
میری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا اور نہ مجھ سے ٹکٹ ہی طلب کیا۔ وہ پولیس کے سنتری
باتیں کرتا رہا۔ مَیں گیٹ سے گزر کر پلیٹ فارم پر آگیا۔ مَیں حیران ضرور ہو رہا تھا
سب کچھ کیا ہو رہا ہے؟

5

ابھی تک مجھے اس بات کا علم نہیں تھا کہ میرے ساتھ کس قدر لرزہ خیز حادثہ گزر چکا
ہے۔ مَیں نے سوچا کہ چائے کے سٹال پر چل کر سٹال والے سے پوچھتا ہوں کہ یہاں سے
ور کی طرف کوئی گاڑی جاتی بھی ہے یا نہیں۔ مَیں ٹی سٹال پر آگیا۔ سٹال پر ایک آدمی
تلی میں سے ایک گلاس میں چائے ڈال رہا تھا۔ ایک گاہک بھی کھڑا تھا۔ مَیں نے جاتے
پوچھا کہ بھائی صاحب! یہاں سے کوئی ٹرین لاہور کی طرف بھی جاتی ہے؟ یہاں بھی
رے ساتھ وہی ہوا کہ سٹال والے نے میری بات جیسے سنی ہی نہیں تھی۔ اس نے چائے
گلاس گاہک کو دیا اور خود سٹول پر بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگا۔ اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو
تھا۔ مَیں نے غصے میں ہاتھ مار کر اس کا اخبار پرے پھینک دیا اور چلا کر کہا:

"کیا یہاں سب لوگ بہرے ہیں؟"

جیسے ہی مَیں نے سٹال والے کے ہاتھ سے اخبار چھین کر پرے پھینکا سٹال والا دہشت
زدہ ہو کر گاہک کی طرف دیکھنے لگا جو میرے ساتھ ہی کھڑا تھا۔ اس نے گاہک سے کہا:

"آپ پاگل تو نہیں ہو گئے۔ میرا اخبار کس خوشی میں پھینکا ہے؟"

گاہک حیران ہو کر بولا:

"مَیں تو چائے پی رہا ہوں بھائی۔ مجھے تمہارا اخبار نوچ کر پھینکنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"تو پھر یہ اخبار میرے ہاتھوں سے کھینچ کر کس نے نیچے پھینکا ہے؟"

گاہک اور زیادہ حیران ہو کر بولا:

"مَیں تو یہی سمجھا تھا کہ تم نے خود نیچے پھینک دیا ہے۔"

اب مجھ سے مزید برداشت نہ ہُوا اور مَیں نے اپنے ساتھ کھڑے گاہک کو بازو سے
کر اپنی طرف کھینچ کر کہا:

"بھائی صاحب! سٹیشن کا سارا عملہ بہرہ ہو گیا ہے۔ آپ ہی مجھے بتائیں کہ یہاں
کوئی گاڑی لاہور کی طرف جاتی ہے؟"

جیسے ہی مَیں نے گاہک کا بازو پکڑ کر اسے اپنی طرف ذرا سا کھینچا اس کی آنکھیں د
سے پھیل گئیں۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا: "یہاں کوئی ہے؟"

مَیں نے کہا: "ارے بھائی صاحب مَیں ہوں' آپ کے سامنے کھڑا ہوں۔ میری
جواب دیجئے۔"

اس کے ساتھ ہی مَیں نے اس کے بازو کو بڑے آرام سے پکڑ لیا۔ بازو کا پکڑ
گاہک کی چیخ نکل گئی۔ وہ بھوت بھوت پکارتا اپنا بازو چھڑا کر گیٹ کی طرف دوڑ
نے سٹال والے کی طرف دیکھا۔ وہ بے حد خوف زدہ تھا۔ مَیں نے ایک پلیٹ اٹھ
سے کاؤنٹر پر ماری اور چیخ کر کہا:

"تم لوگ میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے؟"

پلیٹ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ سٹال والا بھی بھوت بھوت پکارتا دوسری طرف
کر گیٹ کی طرف بھاگ اٹھا۔

اب مجھے اپنے اوپر بھی کچھ شک سا ہونے لگا تھا کہ کہیں مجھ میں تو کوئی تبد
گئی۔ لیکن جس قسم کی تبدیلی مجھ میں پیدا ہو چکی تھی' اس کا تو مجھے وہم و گما
تھا۔ مَیں بھی کچھ گھبرا گیا کہ آخر ان آدمیوں کے منہ سے بھوت بھوت کی آوا
نکلی تھیں۔ سٹال پر شور و غوغا سن کر اِدھر اُدھر سے لوگ جمع ہو گئے۔ ایک پولی
آ گیا۔ اس خیال سے کہ کہیں مَیں کسی نئی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں۔ مَی

ارم کے دوسرے سرے کی طرف بھاگ اٹھا۔ جیسے ہی میں بھاگا ایک طرف سے پھل بیچنے
الے کی ریڑھی اچانک میرے سامنے آ گئی۔ یہ سب کچھ ایک سیکنڈ میں ہو گیا۔ نہ مجھے
یک طرف ہٹنے کا موقع ملا' نہ ریڑھی والے کو اتنی مہلت ملی کہ ریڑھی کو ایک طرف
وڑ لیتا۔ میں ریڑھی سے ٹکرا گیا۔ اچانک مجھے محسوس ہُوا کہ ریڑھی نے مجھے ٹکر نہیں
ری اور ریڑھی والے نے بھی اس قسم کے ردِعمل کا کوئی اظہار نہیں کیا کہ جیسے اس کی
یڑھی سے کوئی آدمی ٹکرا گیا ہے۔

میرے حلق سے ڈراؤنی چیخ نکل گئی۔ کیونکہ میں اپنی جگہ پر کھڑا تھا اور ریڑھی اور
ریڑھی والا میرے جسم کے اندر سے اس طرح گزر کر نکل گیا تھا جیسے میرا کوئی مادی وجود
ی نہ ہو۔ مجھ پر اس قدر خوف طاری ہوا کہ مَیں وہیں بیٹھ گیا اور اپنے جسم کو ہاتھ لگا لگا کر
یکھنے لگا۔ مجھے اپنا جسم باقاعدہ نظر آ رہا تھا۔ مجھے اپنی آواز باقاعدہ سنائی دے رہی تھی۔ پھر
یرے ساتھ ایسی خوفناک بات کیسے ہو گئی تھی کہ ریڑھی پوری کی پوری میرے جسم میں
سے گزر گئی اور مجھے ذرا سا دھکا بھی نہ لگا۔ اچانک ایک خیال نے میرے سارے بدن پر
سنسنی طاری کر دی۔ کہیں مَیں' مَیں دوڑتا ہوا پان سگریٹ والے سٹال پر گیا۔ وہاں سامنے
آئینہ لگا ہوا تھا' جیسا کہ پان سگریٹ والوں کے سٹالوں اور دکانوں پر اکثر لگا ہوتا ہے۔ مَیں
نے سامنے آ کر آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا۔ لیکن مجھے آئینے میں اپنا عکس دکھائی نہ دیا۔
ئیں گھبرا گیا۔ میرے پاس ہی ایک لڑکا کھڑا آئینے میں دیکھ کر اپنے بالوں میں کنگھی کر رہا
تھا۔ آئینے میں مجھے اس کا عکس برابر نظر آ رہا تھا مگر میرا عکس غائب تھا۔ مَیں نے
گھبراہٹ میں ساتھ کھڑے لڑکے کا کنگھی والا ہاتھ پکڑ لیا کہ شاید اس کے ساتھ مجھے اپنا
عکس بھی نظر آ جائے لیکن میرا عکس تب بھی دکھائی نہ دیا۔ جس لڑکے کا مَیں نے ہاتھ
پکڑ لیا تھا' وہ خوف کے مارے کانپنے لگا۔ اس نے زور سے جھٹک کر اپنا ہاتھ چھڑایا اور
بھوت بھوت کہتا وہاں سے بھاگ گیا۔

تب مجھے اس تلخ حقیقت کا احساس ہُوا کہ شمشان گھاٹ میں کنواری مردہ لڑکی کی چتا

سے اچھل کر گرنے کے بعد میرے ساتھ ایک بھیانک حادثہ پیش آگیا ہے اور میں اپنا وجو
رکھتے ہوئے بھی دوسروں کی نظروں سے غائب ہو گیا ہوں۔ میں سب کو دیکھ رہا ہوں
سب کو سن رہا ہوں مگر مجھے نہ کوئی دیکھ رہا ہے اور نہ میری آواز ہی سن رہا ہے۔ یہ ایک
ایسا بھیانک انکشاف تھا کہ جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ اب میں اس بات کا کوئی وا
ثبوت حاصل کرنا چاہتا تھا کہ میں واقعی غائب ہو چکا ہوں اور کسی کو نظر نہیں آ رہا۔

پلیٹ فارم پر شور مچ گیا تھا کہ وہاں کوئی بدروح آ گئی ہے جو لوگوں کو ڈرا رہی ہے
پلیٹ فارم پر جو چند ایک مسافر بیٹھے تھے وہ بھی بھاگ کر سٹیشن کی ڈیوڑھی میں چلے گئے
صرف پولیس کے دو تین سنتری اور سٹیشن ماسٹر پلیٹ فارم پر موجود تھے۔ جو لگتا تھا کہ
بھی ڈرے ہوئے ہیں مگر اپنے خوف کو مسافروں کو یہ کہہ کر چھپا رہے تھے کہ تم لو
پاگل ہو گئے ہو؟ یہاں کوئی بدروح نہیں ہے، واپس آ جاؤ۔ ٹرین آنے والی ہے۔ ا
میں ایک آدمی زور زور سے گھنٹی بجانے لگا۔ یہ گاڑی کے آنے کا اشارہ تھا۔ مسافر گھنٹ
آواز سن کر پلیٹ فارم پر واپس آنا شروع ہو گئے۔

میں ایک خالی بنچ پر سر جھکائے خاموش اور پریشان حال بیٹھا تھا اور بار بار اپنے جسم
ہاتھ لگا لگا کر محسوس کر رہا تھا۔ میں نے دو تین بار اپنا نام لے کر آواز بھی بلند کی۔ مجھے
آواز بڑی صاف سنائی دی۔ میرا جسم بالکل نارمل تھا۔ میری سماعت، میری بینائی،
احساس لمس اور میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت، یہ سب کچھ معمول کے مطابق
نارمل تھا۔ اگر کوئی تبدیلی واقع ہوئی تھی تو صرف اتنی کہ میں دوسروں کی نظروں
اوجھل ہو گیا تھا۔ نہ میں کسی کو نظر آ رہا تھا، نہ کوئی میری آواز سن سکتا تھا۔ میں
دوسرے کو پکڑ کر چھو سکتا تھا، لیکن کوئی دوسری چیز یا کوئی دوسرا شخص اپنے طور پر اگر
چھونا یا مجھے پکڑنا چاہے تو وہ مجھے نہ پکڑ سکتا تھا، نہ چھو سکتا تھا۔ یہ ایک نیا عذاب تھا جو
پر نازل ہو چکا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ کام سوائے پاتالی چڑیل کے اور کسی کا نہیں
سکتا۔ اسی نے ایک دوسری طرح سے مجھ پر اپنا حملہ کیا ہے۔ لیکن اس بات کی مجھے

حیرانی تھی کہ اب تک پاتالی چڑیل میرے سامنے کیوں نہیں آئی، وہ تو جب اور جس وقت
اور جہاں چاہے ظاہر ہو کر مجھے اپنی گرفت میں لے سکتی تھی، اپنے قبضے میں کر سکتی تھی۔
پاتالی کا ابھی تک ظاہر ہو کر مجھے نہ پکڑنا ایک نیا معمہ تھا جو میری عقل سے باہر تھا۔

جب مجھے اس حقیقت کا ثبوت مل گیا کہ میں دوسروں کی نظروں سے غائب ہو چکا
ہوں تو میں سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میرے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ میں
اپنی ہمدرد کامنی نرتکی کے پاس جاؤں اور اس سے کہوں کہ مجھے اس مصیبت سے نجات
دلائے۔ اتنے میں گاڑی پلیٹ فارم میں داخل ہو گئی۔ اب مجھے لاہور کی بجائے کھنڈوہ جانا
تھا جو بمبئی جھانسی ریلوے لائن پر آتا تھا۔ میں کسی سے پوچھ نہیں سکتا تھا کہ یہ گاڑی کس
طرف جاتی ہے۔ ٹرین کی رفتار آہستہ ہو گئی تھی۔ میں ٹرین کے ڈبوں کو دیکھنے لگا۔ بوگیوں
پر کسی کسی جگہ ایک تختی لگی ہوتی ہے جس پر لکھا ہوتا ہے کہ یہ گاڑی کہاں جا رہی ہے۔
آج کل تو بھارت کی ٹرینوں پر ہندی میں سٹیشن کا نام لکھا ہوتا ہے لیکن ان دنوں ابھی
ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت تھی اور بوگیوں پر اردو میں ہی سٹیشن کا نام لکھا ہوتا تھا۔
ایک بوگی میرے سامنے سے گزری۔ اس پر تختی لگی ہوئی تھی۔ میں نے غور سے پڑھا۔
تختی پر دلی ——— بمبئی لکھا تھا۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ مجھے بمبئی جانے والی گاڑی مل گئی تھی۔ کھنڈوہ اسی لائن پر
آتا تھا۔ ٹرین رکی تو میں ایک ڈبے میں داخل ہو گیا۔ یہ سیکنڈ کلاس کا ڈبہ تھا۔ اس سے
مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ میں کس کلاس کے ڈبے میں داخل ہوتا ہوں۔ کیونکہ مجھے
کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا۔ یہ ڈبہ خالی تھا۔ وہاں اور کوئی مسافر نہیں تھا۔ میں کونے میں کھڑکی
کے پاس بیٹھ گیا۔ گاڑی چل پڑی۔ طرح طرح کے پریشان کر دینے والے خیالات میرے
ذہن میں آ رہے تھے۔ میں کیا تھا، کیا بن گیا ہوں، نہ جانے آگے میرے ساتھ کیا ہونے
والا تھا۔ اس قسم کے مافوق الفطرت تجربات مجھے پہلے کبھی پیش نہ آئے تھے۔ میں نے الف
لیلہ کی کہانیوں میں غائب ہونے والے جن بھوتوں کے قصے پڑھے تھے۔ آج وہی کچھ

میرے ساتھ ہو رہا تھا۔ مَیں بار بار اپنے جسم کو ہاتھ لگا کر دیکھتا۔ میرا جسم بالکل ویسے کا
ویسے تھا' جیسے ایک صحت مند نوجوان کا ہوتا ہے۔ پھر یہ کیسے ہو گیا کہ مَیں کسی کو نظر نہیں
آتا تھا۔ مَیں اپنے جسم کو دیکھ رہا تھا' مجھے اپنا جسم باقاعدہ نظر آ رہا تھا۔

یہ جو کچھ میرے ساتھ ہو رہا تھا' میری سمجھ سے باہر تھا۔

ٹرین رات کے اندھیرے کو چیرتی ہوئی اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ مجھے ا
بہن یاد آ رہی تھی۔ اگر مَیں اس حالت میں اس کے پاس چلا گیا تو وہ کیا سوچے گی؟ وہ
رونے لگے گی کہ میرے بھائی کو کیا ہو گیا ہے۔ یہی کچھ سوچتے سوچتے میرا دماغ تھک گ
میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ خدا کے حضور ایک بار پھر اپنے گناہوں کی معافی مانگی اور
کھڑکی کے ساتھ لگا لیا۔ نہ جانے کب مجھے نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ خواب میں
دیکھتا ہوں کہ میری بہن عاصمہ ایک اونچی پہاڑی پر کھڑی ہے۔ اس نے بازو کھول ر
ہیں۔ ایسا لگ رہا ہے کہ وہ پہاڑی سے نیچے چھلانگ لگانے والی ہے۔ نیچے سمندر کی ل
طوفان مچا رہی ہیں۔ میں اس کو آوازیں دیتا ہوا اُس کی طرف جا رہا ہوں۔ عاصمہ
عاصمہ نیچے سمندر ہے' چھلانگ نہ لگانا۔ لیکن وہ میری آواز بالکل نہیں سن رہی۔ جی
اس کے پاس پہنچتا ہوں وہ پہاڑی سے نیچے چھلانگ لگا دیتی ہے۔ مَیں چیخ مار کر اس
پیچھے کود جاتا ہوں۔ مجھے ایسے لگتا ہے جیسے کسی نے مجھے پیچھے سے دھکا دیا ہے۔ میں
آپ کو ایک اندھیری سرنگ میں گرتے محسوس کرتا ہوں۔ پھر اچانک ایک عفری
بھیانک منہ کھولے میری طرف اوپر کو آتا ہے۔ مجھے ایک جھٹکا لگتا ہے اور میری آنکھ
جاتی ہے۔

میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے خالی ڈبے کو دیکھنے لگتا ہوں۔

ٹرین پوری رفتار سے جا رہی تھی۔ ڈبے میں صرف ایک بتی جل رہی تھی۔ کھڑ
باہر اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ مَیں آنکھیں بند کرتے ڈر رہا تھا کہ کہیں پھر وہی بھیانک
میرے سامنے نہ آ جائے۔ میں توبہ استغفار پڑھنے لگا' تھوڑی دیر بعد ٹرین کی رفتار

شروع ہو گئی۔ کوئی سٹیشن آ رہا تھا۔ مَیں نے کھڑکی میں سے باہر سامنے کی طرف دیکھا۔
دور کسی شہر کی روشنیاں قریب آ رہی تھیں۔ یہ کوئی بڑا شہر تھا۔ ٹرین سٹیشن کے یارڈ میں
داخل ہو گئی۔ کافی بڑا یارڈ تھا۔ ریل کی پٹڑیوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ٹرین ایک پلیٹ فارم پر آ
کر رک گئی۔ میں نے سٹیشن کا نام پڑھ لیا تھا۔ یہ بھوپال کا شہر تھا۔ میں نے اطمینان کا
سانس لیا۔ کیونکہ اسی لائن پر آگے کھنڈوہ سٹیشن آتا تھا۔ یہاں ڈبے میں ایک بوڑھے
میاں بیوی سوار ہو گئے۔ میں خالی سیٹ کے کونے میں کھڑکی کے پاس بیٹھا رہا۔ ان میں
سے کسی نے مجھے نہ دیکھا۔ میں ان کی نظروں سے غائب تھا۔ بھوپال سے ٹرین چل پڑی۔
مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہاں سے کھنڈوہ کتنے فاصلے پر ہے۔ میں کسی سے پوچھ بھی نہیں
سکتا تھا۔ بوڑھے میاں بیوی بستر وغیرہ لگا کر لیٹ گئے۔ میں جاگ رہا تھا۔ نیند ویسے بھی
میری آنکھوں سے غائب ہو چکی تھی۔ ٹرین اندھیرے جنگلوں میں سے گزر رہی تھی۔
چھوٹے چھوٹے سٹیشن آئے۔ ٹرین انہیں چھوڑتی ہوئی آگے گزر جاتی۔ بوڑھے میاں
بیوی کی باتوں سے معلوم ہوا کہ رات کے دو بج چکے تھے۔ میں ان سے پوچھنا چاہتا تھا کہ
کھنڈوہ کتنی دور رہ گیا ہے مگر اس ڈر سے پوچھ نہیں رہا تھا کہ وہ میری آواز نہیں سن
سکتے اور میں انہیں نظر تو آؤں گا نہیں۔ اس خیال سے جاگ رہا تھا کہ میری آنکھ لگ گئی
تو کھنڈوہ گزر نہ جائے۔ مجھے قطعی علم نہیں تھا کہ کھنڈوہ اب زیادہ دور نہیں ہے۔ جب
کافی سٹیشن خالی چھوڑنے کے بعد گاڑی کی رفتار کم ہونے لگی تو بوڑھی عورت نے بستر پر
لیٹے لیٹے اپنے خاوند سے پوچھا:

"کون سا سٹیشن آ رہا ہے؟"

بوڑھے خاوند نے جواب دیا: "کھنڈوہ آ رہا ہے۔"

میں نے باہر جھانک کر دیکھا۔ روشنیاں بڑے شہر کی تھیں۔ میں نے دل میں خدا کا شکر
ادا کیا کہ میں اپنی منزل پر پہنچ گیا ہوں۔ مجھے دریائے نربدا کے کنارے مرن گھاٹ کے
کھنڈر میں کامنی نرتکی سے ملنے جانا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ مجھ پر پاتالی چڑیل نے جو منحوس

طلسم کیا ہے اس کا توڑ کامنی کے پاس ہی ہے۔ وہی مجھے اس عذاب سے نجات دلا سکتی
ہے۔ اس نے مجھے کہا بھی تھا کہ اگر کبھی تمہیں میری ضرورت محسوس ہو تو میرے پاس
مرن گھاٹ آ جانا۔

میں کھنڈوہ سٹیشن پر اتر گیا۔ چند ایک اور مسافر بھی اترے۔ میں پلیٹ فارم کے گیٹ
میں سے گزر گیا۔ ٹکٹ چیکر کو میں نظر نہیں آیا تھا۔ اس لئے مجھ سے اس نے ٹکٹ
نہیں پوچھا۔ اس وقت رات کا پچھلا پہر ڈھل رہا تھا۔ مجھے وہاں سے منڈیل کر کے قصبے
میں جانا تھا جو دریائے نربدا کے کنارے پر تھا اور وہاں سے پچاس میل کے فاصلے پر تھا
اس سے پہلے میں ایک لاری میں بیٹھ کر وہاں تک جا چکا تھا۔ میں لاریوں کے اڈے پر
گیا۔ اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ لاریاں ایک طرف خالی کھڑی تھیں۔ میں کسی سے
پوچھ بھی نہیں سکتا تھا کہ منڈیل کر کو لاری کب جائے گی۔ ایک لکڑی کی کھوکھا نما دکان
کے باہر بیٹھ کر صبح ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ دن کی روشنی نمودار ہونا شروع
ہو گئی۔ کچھ مسافر بھی آ گئے۔ ایک آدمی نے لاری شیڈ میں سے نکال کر ایک طرف
دی۔ مسافر لاری میں بیٹھنے لگے۔ بہت جلد معلوم ہو گیا کہ یہ لاری منڈیل کر جا رہی ہے
لاری میں کافی سیٹیں خالی تھیں۔ لاری چل پڑی۔ میں اس میں سوار ہو گیا تھا۔

آسمان پر سیاہ کالے بادل چھا رہے تھے۔ لاری گھنے جنگل میں سے گزر رہی تھی۔
بڑے خطرناک جنگل تھے۔ ڈرائیور خونخوار درندوں کو لاری سے دور رکھنے کے
تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہارن بجانے لگتا تھا۔ لاری منڈیل کر کے قریب پہنچی تو بارش شروع
ہو گئی۔ بارش بھی بڑی موسلا دھار تھی۔ لاری اڈے پر آ کر سائبان کے نیچے کھڑی ہو گئی
مسافر اتر کر وہیں بیٹھ گئے اور بارش کے رکنے کا انتظار کرنے لگے۔ میرا خیال تھا کہ
چونکہ غیبی حالت میں ہوں' اس لئے ہو سکتا ہے کہ میں بارش میں نہ بھیگوں۔ چنانچہ
سوچ کر میں سائبان سے باہر نکل آیا۔ لیکن میں بارش میں بھیگنے لگا۔ جلدی سے واپس
سائبان کے نیچے آ گیا اور ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ اس علاقے کی برسات بڑی زور دار

ہوتی ہے۔ بارش رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ سائبان کے نیچے ایک چائے کی دکان
کھل چکی تھی۔ وہاں مسافر بیٹھے ناشتہ وغیرہ کر رہے تھے۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی۔
سوچنے لگا کہ ناشتہ کیسے کروں گا۔ میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ پھر خیال آیا کہ
مجھے تو کوئی دیکھ ہی نہیں سکتا۔

یہ سوچ کر میں اٹھ کر چائے کی دکان پر آ گیا۔

چھوٹی سی دکان تھی۔ دکاندار چھوٹی سی کڑاہی میں پوڑیاں تل رہا تھا۔ ایک لڑکا چائے
گلاسوں میں ڈال کر گاہکوں کو دے رہا تھا۔ کچھ پوڑیاں تھال میں پڑی تھیں۔ میں پوڑی
اٹھاتے ہوئے ہچکچایا۔ میں اپنے آپ کو دیکھ رہا تھا۔ یہ خیال آ گیا کہ اگر اتفاق سے کسی نے
مجھے پوڑی اٹھاتے دیکھ لیا تو کیا سمجھے گا۔ لیکن میں نے تھال میں سے ایک پوڑی اٹھا لی۔
دکاندار کو بالکل خبر نہ ہوئی۔ میں نے دوسری اور تیسری پوڑی بھی اٹھا لی۔ اب دکاندار نے
جب دیکھا کہ تھال میں سے تین پوڑیاں غائب ہو گئی ہیں تو وہ حیران ہو کر ادھر ادھر تکنے
لگا۔ اس نے لڑکے سے پوچھا:

"ارے بھگت لال! یہ پوڑیاں کہاں چلی گئیں؟"

لڑکے نے کہا۔ "مہاراج گاہکوں کو دی ہوں گی؟"

دکاندار سمجھا کہ شاید وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس نے کڑاہی میں سے اور پوڑیاں نکال کر
تھال میں ڈال دیں۔ میں ایک طرف ہو کر پوڑیاں کھانے لگا۔ پھر میں نے چائے کا ایک
گلاس اٹھا لیا۔ میں نے یہ ایک نئی بات محسوس کی کہ پوڑیاں اور چائے کا گلاس میرے
ہاتھ میں آتے ہی دوسروں کی نظروں سے غائب ہو گئے تھے۔ کیونکہ وہاں کسی کو دکھائی
نہیں دیا تھا کہ میرے ہاتھ میں چائے کا گلاس ہے اور میں چائے پی رہا ہوں۔ ورنہ وہاں
ایک دم شور مچ جاتا کہ یہ چائے کا گلاس اپنے آپ کیسے ہوا میں بلند ہو گیا ہے۔ میں نے
کھڑے کھڑے ناشتہ کیا اور جب خالی گلاس رکھنے لگا تو لڑکے کی نظر پڑ گئی۔ اس نے کچھ
حیران سا ہو کر دیکھا کہ یہ خالی گلاس اپنے آپ کیسے وہاں آ گیا ہے کیونکہ گلاس میرے ہاتھ

سے الگ ہوتے ہی دکھائی دینے لگا تھا۔

میں چائے کی دکان کے باہر ہی ایک اسٹول پر بیٹھ گیا کہ بارش رکے تو گھاٹ پر جا کر دریا پار کروں۔ آخر بارش تھم گئی۔ وہاں دوسرے مسافر بھی تھے جنہیں دریا پار جانا تھا۔ وہ سب گھاٹ کی طرف چل پڑے۔ گھاٹ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں پہلے بھی ایک بار دریا پار کر چکا تھا۔ گھاٹ پر آ کر پتہ چلا کہ دریا چڑھاؤ پر ہے۔ کشتی دریا پار نہیں جائے گی۔ یہ ایک اور مصیبت کھڑی ہو گئی تھی۔ گھاٹ کے پاس ہی ایک گھاس پھونس کی جھونپڑی تھی۔ مسافر وہاں آ کر اس انتظار میں بیٹھ گئے کہ دریا کا زور کم ہو تو وہ کشتی میں بیٹھ کر دریا پار جائیں۔ میں بھی جھونپڑی میں آ کر بیٹھ گیا۔ مجھے سخت بے چینی لگی ہوئی تھی۔ میں جلد سے جلد مرن گھاٹ کامنی نرتکی کے پاس پہنچنا چاہتا تھا مگر میں کشتی کے بغیر دریا پار نہیں کر سکتا تھا۔ سارا دن وہیں گزر گیا۔ اس دوران اور مسافر بھی گھاٹ پر پہنچ گئے تھے۔ شام ہو گئی۔ اندھیرا چھانے لگا۔ پھر خدا جانے کہاں سے ایک پرانا سٹیمر گھاٹ کے ساتھ آ کر لگ گیا۔

معلوم ہوا کہ یہ بار بردار سٹیمر ہے اور منڈیل کر قصبے سے مٹی کا تیل لینے آیا ہے۔ سب مسافر سٹیمر کی طرف دوڑ پڑے۔ سٹیمر کے ڈرائیور نے منہ مانگا کرایہ لے کر مسافروں کو سٹیمر میں سوار کرا لیا۔ میں بھی سٹیمر پر سوار ہو گیا۔ نہ مجھے کسی نے دیکھا اور نہ کرایہ طلب کیا۔ دو منزلہ سٹیمر تھا۔ کچھ مسافر اس کے درمیانے درجے میں اور کچھ اس کے اوپر والے ڈیک پر بیٹھ گئے۔ میں اوپر والے ڈیک پر تھا۔

سٹیمر کے آدمی قصبے میں تیل کے ڈرم لینے گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے دو تین گھنٹے دیئے۔ کوئی دس بجے رات سٹیمر گھاٹ سے روانہ ہوا۔ دریا کی موجیں بپھری ہوئی تھیں دریا میں سیلاب آیا ہوا تھا۔ سٹیمر بڑی سست رفتار کے ساتھ دریا پار کر رہا تھا۔ اس نے دریا کے دوسرے کنارے تک جاتے جاتے ڈیڑھ دو گھنٹے لگا دیئے۔ آدھی رات گزر گئی تھی سٹیمر دریا کے دوسرے کنارے پر جا کر لگا۔ میں سٹیمر سے اتر کر سوچنے لگا کہ کیا کروں

مسافروں کو جہاں جہاں جانا تھا، اس طرف جا چکے تھے۔ سٹیمر بھی واپس چلا گیا تھا۔ میں رات کے اندھیرے میں گھاٹ کی سیڑھیوں میں بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ سیاہ بادلوں میں گھری ہوئی اندھیری رات میں مرن گھاٹ کی طرف جاؤں یا دن نکلنے کا انتظار کروں۔ طبیعت کو کسی طرح چین نہیں تھا۔ جس عذاب میں مجھے ڈال دیا گیا تھا، میں اس سے جلد نجات حاصل کرنا چاہتا تھا اور اس عذاب سے کامنی نرتکی ہی مجھے نکال سکتی تھی۔ وہاں سے مرن گھاٹ پہنچنے کے لئے ایک خطرناک اور گنجان جنگل سے گزرنا پڑتا تھا۔ میں نے سوچا کہ مجھے نہ تو کوئی چڑیل ہی دیکھ سکے گی نہ کوئی جنگلی درندہ دیکھ سکے گا پھر مجھے کس بات کا ڈر ہے۔ میں بڑے آرام سے جنگل میں سے گزر جاؤں گا۔

اس خیال کے ساتھ ہی میں گھاٹ کی سیڑھیوں پر سے اٹھا اور بانس کے اس جھنڈ کی طرف چل پڑا، جو رات کے اندھیرے میں بڑا ڈراؤنا لگ رہا تھا۔ مجھے ڈر ضرور لگا لیکن کامنی نرتکی کے پاس پہنچنا بھی ضروری تھا۔ راستے کا مجھے علم تھا۔ صرف ڈیڑھ دو میل کا ایک جنگل ہی تھا، جس میں سے گزرنا تھا۔ اس جنگل کو جانے والا راستہ بانسوں کے جھنڈ کے قریب سے شروع ہوتا تھا۔ بارش کی وجہ سے اونچی نیچی زمین پر پانی تو کھڑا نہیں ہوا تھا مگر گھاس اور جھاڑیاں گیلی تھیں اور گھنے درختوں کی شاخوں میں سے بارش کا رکا ہوا پانی ٹپک رہا تھا۔ میں جنگل میں داخل ہو گیا۔ عین اس وقت آسمان پر بادلوں کی گرج سنائی دی اور میں وہیں ٹھٹھک گیا۔ دل نے کہا: "اس اندھیری رات میں جنگل میں سے گزرنا ٹھیک نہیں۔ رات گھاٹ کی سیڑھیوں پر ہی گزار دے۔ صبح دن کی روشنی میں مرن گھاٹ جانا۔ لیکن اب میں چل پڑا تھا اور واپس نہیں مڑنا چاہتا تھا۔ میں اندھیری رات میں غور سے دیکھتا ہوا جنگل کے گھنے درختوں میں آگے بڑھتا گیا۔ جیسے جیسے میں آگے بڑھ رہا تھا جنگل گھنا ہوتا جا رہا تھا۔ میں کافی دیر تک جنگل میں چلتا رہا۔ میرے اندازے کے مطابق اب جنگل کو ختم ہو جانا چاہیے تھا اور وہ چٹانیں اور پہاڑیاں دکھائی دینی چاہییں تھیں، جہاں مرن گھاٹ کا کھنڈر تھا مگر جنگل ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔

مجھے شک ہونے لگا کہ میں جنگل میں بھٹک گیا ہوں۔ اب واپس بھی نہیں جا سکتا تھا۔
درختوں کے جھنڈ بھی کچھ اجنبی سے لگ رہے تھے۔ پہلے میں دو بار اس جنگل سے رات
کے وقت گزر چکا تھا۔ تب رات کی خاموشی میں مجھے دور سے درندوں کی آوازیں بھی آئی
تھیں۔ اب ایسی کوئی آواز نہیں آئی تھی۔ ایک ایسا سناٹا چھایا ہوا تھا جیسے جنگل میں کوئی
جانور، کوئی درندہ زندہ نہیں رہا۔ درختوں کی شاخیں جھک کر اتنی نیچے آگئی تھیں کہ مجھے
انہیں بار بار ہٹا کر گزرنا پڑتا تھا۔ اچانک بجلی چمکی۔

اس کے ساتھ ہی بادل اتنے زور سے گرجا کہ میں ڈر کر ایک درخت کے ساتھ لگ
گیا۔ اس کے بعد ایک بار پھر گھپ اندھیرا چھا گیا۔ مجھ پر ایک بدروح کے آسیب کا ضرو
اثر ہو چکا تھا اور میں اس کے اثر سے لوگوں کی نگاہوں سے غائب ہو گیا ہوا تھا مگر میر
جسمانی اور ذہنی حالت عام انسانوں والی ہی تھی اور مجھے ڈر بھی محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں
اس سے زیادہ مصیبت میں نہ پھنس جاؤں۔ سارے کا سارا جنگل آسیبی لگ رہا تھا۔ تار
میں مجھے تھوڑا تھوڑا دکھائی ضرور دے رہا تھا۔ اچانک درختوں کے درمیان ایک جگہ مج
گول دائرے کی شکل میں بڑے بڑے پتھر زمین سے باہر نکلے ہوئے نظر آئے۔ میں
قریب آ کر دیکھا، یہ ہندو دیوی دیوتاؤں کے بت تھے۔ بجلی چمکی تو میں نے دیکھا کہ یہ بڑ
ہی ڈراؤنی شکلوں والے بت تھے۔

پہلے اس راستے میں یہ بت نہیں آتے تھے۔

مجھے یقین ہو گیا کہ میں جنگل میں بھٹک گیا ہوں اور کسی اور ہی طرف نکل آیا ہوا
اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں آگے کی جانب چلتا چلا جاؤں اور اس ج
سے باہر نکلنے کی کوشش کروں۔ بادل ایک بار پھر گرجے اور جنگل کی خاموشی گونج اٹھ
مجھے خوف محسوس ہونے لگا۔ ایک خیال یہ بھی آیا کہ یہیں کسی جگہ بیٹھ کر رات گ
دوں اور دن کی روشنی میں جنگل سے نکلنے کا کوئی راستہ تلاش کروں۔ لیکن جنگل ک
اس قدر ڈراؤنی اور آسیب زدہ تھی کہ میں وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ میں کر بہ ا

درختوں کے قریب سے آگے گزر گیا۔ آگے جنگل اور زیادہ گھنا ہونے لگا۔ اتنے بڑے
ے تنوں والے درخت ستونوں کی طرح کھڑے تھے کہ ان کی جڑیں زمین سے باہر نکلی
ئی تھیں اور قدم اٹھانا مشکل ہو رہا تھا۔ میں ہمت کر کے چلتا گیا۔ ایک درخت کے نیچے
ے گزرتے ہوئے مجھے ایسے لگا جیسے کوئی چیز میرے جسم کو چھو کر گزر گئی ہے۔ اس غیبی
ئے کے تیزی سے گزرنے کی مجھے ایک شوکر سی بھی سنائی دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی
ے ایک جھٹکا لگا اور میں نے گرتے گرتے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا۔

میرا سانس اپنے آپ تیز تیز چلنے لگا اور اندھیرے میں مجھے ایسی بُو محسوس ہوئی جیسے
یں قریب ہی کسی جگہ سے دھواں اٹھ رہا ہو۔ میں کچھ سمجھ نہیں سکا کہ یہ جھٹکا کیوں لگا
اور یہ کیا چیز تھی جو شور مچاتی میرے جسم سے ٹکرا کر گزر گئی تھی۔ دھواں بار بار میرے
نوں میں گھس رہا تھا۔ میں ایک طرف ہٹ کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر یہ دیکھنے کی کوشش
رنے لگا کہ یہ دھواں کہاں سے آ رہا ہے۔ اندھیرا اس قدر تاریک تھا کہ مجھے سوائے
ھیرے اور تاریکی کے اور کوئی شے نظر نہیں آ رہی تھی۔ اچانک بجلی چمکی اور دیر تک
تی اور کڑکتی رہی۔ بجلی کی چمک میں، میں نے جو چیز دیکھی اس نے مجھ پر پھر سے دہشت
ری کر دی۔

میں نے دیکھا کہ میرے سارے بدن میں سے دھوئیں کی پتلی پتلی لہریں اٹھ رہی
یں۔ میرے حلق سے خوف کے مارے چیخ نکل گئی۔ میں پاگلوں کی طرح اپنے جسم پر
ح طرح ہاتھ مارنے لگا جیسے میرے جسم کو آگ لگ گئی ہو۔ مگر مجھے آگ کی تپش محسوس
یں ہو رہی تھی۔ صرف دھواں سارے جسم سے اٹھ رہا تھا۔ بالکل ایسا ہی دھواں میں
ے پاتالی چڑیل کے مکروہ بدن سے اٹھتا ہوا دیکھا تھا۔ میں دہشت کے مارے وہیں بیٹھ گیا۔
رے ہوش و حواس جواب دینے لگے۔ جسم پر لرزہ سا طاری ہو گیا۔ میرے حلق سے
پنے آپ ایسی آوازیں نکلنے لگیں جیسے کوئی آدمی انتہائی خوف زدہ ہو کر رو رہا ہو۔
وئیں کی لہریں میرے جسم سے اٹھ کر اوپر کو جا رہی تھیں جو مجھے نظر آ رہی تھیں۔ یہ

دھواں میرے نتھنوں میں بھی جا رہا تھا لیکن مجھے سانس لینے میں کوئی تکلیف نہیں ہو
تھی۔ میرا دم نہیں گھٹ رہا تھا۔ میری آنکھیں بھی دھوئیں میں چندھیا نہیں رہی تھیں

یا اللہ! میں کس عذاب میں پھنس گیا ہوں۔

میرے مالک! میرے گناہ معاف فرما دے۔

مَیں نے اپنا منہ بازوؤں میں چھپا لیا اور میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ ا
بادل اتنے زور سے گرجا کہ میں اپنی جگہ سے اچھل کر دور جا گرا۔ کچھ دیر مَیں
بے جان سا ہو کر پڑا رہا۔ آہستہ آہستہ مجھے محسوس ہوا کہ میرا بدن جو دھوئیں کی وجہ
گرم ہو رہا تھا' اب نارمل حالت پر واپس آ گیا ہے۔ میں نے اپنے بازو کھول کر انہیں
سے دیکھا۔ میرے جسم سے دھواں نکلنا بند ہو گیا تھا۔ مَیں نے خدا کا شکر ادا کیا اور ا
جلدی جلدی قدم اٹھا کر چلنے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے محسوس ہوا کہ درخت آ
ہٹتے جا رہے ہیں۔ جھاڑیاں بھی جو بہت اونچی اونچی تھیں' کم ہونے لگی تھیں'
راستہ مل گیا تھا۔ مَیں جلدی جلدی گزر رہا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر جا کر ایک مختصر
جگہ آ گئی۔ یہاں درخت دائیں بائیں نصف دائرے کی شکل میں کھڑے تھے۔ درمی
جو کھلی جگہ تھی' وہاں اونچی اونچی جھاڑیوں کے درمیان اندھیرے میں اندر جاتا
دھندلا دھندلا سا نظر آ رہا تھا۔ اچانک ایک قیامت خیز کڑک کے ساتھ بجلی چمکی۔
سب سے پہلے اپنے جسم کو غور سے دیکھا۔ واقعی جسم سے دھواں نکلنا بند ہو گیا تھا
چمک میں مجھے وہ راستہ بھی نظر آ گیا جو جنگلی جھاڑیوں کے درمیان سے گزرتا تھا۔

جیسے میں جھاڑیوں کی طرف بڑھا بارش شروع ہو گئی۔

مَیں جھاڑیوں کے درمیان پہنچتے پہنچتے بارش میں بھیگ گیا۔ مَیں چلتا چلا گیا۔ با
بھیگ رہا تھا۔ مَیں نے بارش سے بچنے کے لئے جھاڑیوں میں کسی جگہ چھپنے کی کوش
جھاڑیاں اس قدر گھنی تھیں کہ مجھے کہیں پناہ کی جگہ نہ ملی۔ مجبور ہو کر تیز تیز
جھاڑیاں ختم ہوئیں تو ایک گھنا درخت سامنے آ گیا۔ مَیں اس کے نیچے کھڑا ہو گ

درخت کی شاخیں بھی ٹپک رہی تھیں مگر جنگل کی موسلا دھار بارش سے بچاؤ ہو گیا تھا۔
بجلی کی تیز چمک میں مجھے اپنا جسم صاف نظر آیا تھا۔ درخت کے نیچے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔
مَیں نے اپنے بازو کو منہ کے قریب لا کر سونگھا۔ بازو میں سے دھواں نہیں نکل رہا تھا۔
دھوئیں کی بو بالکل محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس عجیب و غریب مصیبت سے مجھے نجات
مل چکی تھی۔

بارش چونکہ مسلسل ہو رہی تھی اس وجہ سے درخت کی گھنی شاخوں میں سے بھی پانی
دھاریں بن کر مجھ پر گرنے لگا۔ مَیں درخت کے بالکل ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے اپنی
گردن پر کوئی چیز پھرتی محسوس ہوئی۔ مَیں نے جلدی سے گردن پیچھے کی تو سانپ کی پھنکار
بلند ہوئی۔ میرا جسم سن ہو گیا۔ گھبرا کر درخت چھوڑ کر بھاگا۔ سامنے جھاڑیوں کی دیوار آ
گئی۔ اس میں گھس گیا۔ پھنکار پھر سنائی دی۔ ایسے لگ رہا تھا کہ سانپ میرا پیچھا کر رہا
ہے۔ میں جھاڑیوں کو لتاڑتا دوڑتا چلا گیا۔ ایک جگہ الجھ کر گر پڑا۔ پھنکاریں میرے چاروں
طرف گردش کرنے لگیں۔ میں سہم کر وہیں بیٹھا رہا۔ اٹھنے کی طاقت جسم میں نہیں رہی
تھی۔ پھنکاروں کی شوکر میرے کانوں کے قریب سے بلند ہو رہی تھیں۔ میں سوائے اس
کے کچھ نہیں کر سکتا تھا کہ اپنے آپ کو تقدیر کے حوالے کر دوں۔ پھنکاریں آہستہ آہستہ
دور ہوتے ہوتے غائب ہو گئیں۔ بارش نے الگ شور مچایا ہوا تھا۔ اتنی موسلا دھار اور
شور مچانے والی بارش تھی کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ جب سانپوں کی پھنکاریں
غائب ہو گئیں اور صرف بارش کی تیز آواز ہی باقی رہ گئی اور میں بہت زیادہ بھیگ گیا۔ بلکہ
نڈھال ہو گیا تو اٹھا اور جھاڑیوں میں آگے کی طرف بڑھا۔

جھاڑیوں کا گھنا پن ختم ہو گیا۔ مجھے دور ایک جگہ روشنی سی دکھائی دی۔ جنگل کے
گہرے سیاہ اندھیرے اور بارش میں یہ روشنی ایسے نظر آ رہی تھی جیسے پانی کے اندر کسی
نے لیمپ روشن کر رکھا ہے۔ بجلی ایک بار پھر کڑک کر چمکی تو مجھے اس کی چمک میں کچھ
فاصلے پر ایک عمارت دکھائی دی۔ مجھے کچھ حوصلہ ہوا کہ میں کسی آبادی میں انسانوں کے

درمیان پہنچ گیا ہوں۔ بجلی چمک کر بجھ گئی اور پھر وہی تاریکی چھا گئی۔ بادل زور سے گر
کر بارش کی آواز میں گھل مل گیا۔ مگر وہ روشنی مجھے دکھائی دے رہی تھی' جو اس عمار
میں کسی جگہ ہو رہی تھی۔ میں اس روشنی کی طرف بارش میں دوڑ پڑا۔ راستے میں ایک
نیچی جگہ پر پانی کھڑا تھا۔ میں اس میں سے بھی گزر گیا۔ میں عمارت کے پاس آ گیا۔ دیکھا
یہ ایک پرانی وضع کا مکان سا تھا' جس کی دوسری منزل کی کھڑکی یا روشندان میں سے ہلکی
ہلکی روشنی کی بھیگی ہوئی دھندلی کرنیں باہر نکل رہی تھیں۔ میں مکان کا دروازہ تلا
کرنے لگا۔ اندھیرے میں ایک بوسیدہ سے دروازے کا خاکہ ابھرا۔ میں نے ہاتھ پھیر
دیکھا۔ دروازہ بند تھا۔ میں نے اسے اندر کو دھکیلا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں درو
کھٹکھٹانے لگا تو میرا ہاتھ اپنے آپ رک گیا۔ کہیں یہ بھی کوئی آسیبی گھر نہ ہو۔ یہاں
کوئی چڑیل نہ رہتی ہو۔ پھر خیال آیا کہ چڑیلیں گھروں میں روشنی کر کے نہیں رہتیں
تو اندھیرے اجاڑ گھروں میں رہتی ہیں اور یہاں اوپر والی منزل میں روشنی ہو رہی ہے۔

میں نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

تیسری بار دروازہ کھٹکھٹانے سے اندر سے زنانہ آواز آئی۔

"کون ہے؟"

یہ کسی بوڑھی عورت کی آواز تھی جس نے بڑی صاف اردو زبان کے لہجے میں
تھا۔ میں نے کہا:

"مسافر ہوں بہن جی! جنگل میں راستہ بھول گیا ہوں۔"

"ٹھہر جاؤ۔"

اندر سے عورت نے کہا اور تھوڑی دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ میں نے ایک
چہرے والی بوڑھی عورت کو دیکھا جس کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ لالٹین روشن تھی
نے لالٹین اونچی کر کے مجھے ایک نظر دیکھا اور سوال کیا:

"اتنی بارش میں اس جنگل میں کیا کرنے آ گئے تھے؟"

میں نے کہا۔ "بہن جی! رات کو گھاٹ پر اترا تھا۔ اس وقت بارش نہیں ہو رہی تھی۔
اگلے گاؤں جانا تھا۔ غلطی کی جو اندھیرے میں چل پڑا اور راستہ بھول کر بھٹک گیا۔"

عورت نے کہا۔ "آ جاؤ۔"

میں اندر داخل ہو گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی مجھے ایک ناگوار سی بُو محسوس ہوئی۔ یہ بُو
مَیں نے اس مردہ خانے میں محسوس کی تھی جہاں میں ایک مردہ لاش کے اندر گھسا ساری
رات پڑا رہا تھا۔ بوڑھی عورت نے دروازہ بند کر کے اسے تالا لگایا تو میں نے اپنے اندر
خوف کی ایک لہر سی دوڑتی محسوس کی۔ اسے اندر سے تالا لگانے کی کیا ضرورت تھی۔ پھر
سوچا کہ ہو سکتا ہے بے چاری عورت اس مکان میں اکیلی رہتی ہو اور ہر طرح سے اپنے
آپ کو محفوظ رکھنا چاہتی ہو۔

وہ لالٹین لئے میرے آگے آگے چل پڑی۔ یہ ایک تاریک راہ داری تھی۔ راہ داری
کی دیواریں اور چھت بھی سیاہ رنگ کی تھی۔ وہاں اتنی گہری تاریکی ہو رہی تھی کہ لالٹین
کی روشنی صرف ہمارے آس پاس تک ہی محدود تھی۔ ہم سے ایک گز بھی آگے نہیں
جاتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ عورت لنگڑا کر چل رہی ہے۔ اس کے بدن پر صرف ایک لمبا
سا کرتہ ہی تھا جو اس کے پاؤں تک چلا گیا تھا۔ اس کے راکھ ایسے رنگ کے بال رسیوں کی
طرح بٹے ہوئے تھے۔ مردہ خانے کی بُو مجھے برابر محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے ہمت کر
کے عورت سے پوچھا:

"بہن جی! یہاں آپ اکیلی رہتی ہیں؟"

عورت نے کوئی جواب نہ دیا۔ جب میں نے دوسری بار پوچھا تو وہ راہ داری میں چلتے
چلتے رک گئی۔ اس نے اپنی نیم مردہ سفید آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور سخت لہجے
میں کہا:

"میں نے تمہیں یہاں نہیں بلایا۔ پھر تم مجھ سے اس قسم کے سوال پوچھنے والے کون
ہو؟"

میں نے شرمندہ سا ہو کر کہا:

"معافی چاہتا ہوں بہن جی!"

اس بات پر میں ضرور حیران تھا کہ اس عورت نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ حالانکہ میں اس سے پہلے غیبی حالت میں تھا۔ لیکن میں یہ سوچ کر زیادہ حیران نہیں ہوا تھا کہ ممکن ہے جنگل میں جو میرے ساتھ حادثہ گزرا تھا اور مجھے شدید جھٹکا لگنے کے بعد میرے جسم سے دھواں نکلنے لگا تھا تو اس کے بعد میں اپنی اصلی حالت میں آگیا ہوا ہوں۔ ورنہ یہ عورت جو مجھے ایک عام بوڑھی عورت لگ رہی تھی کوئی مافوق الفطرت مخلوق نہیں لگ رہی تھی مجھے کبھی نہ دیکھ سکتی۔ اس انکشاف سے مجھے مزید خوشی ہوئی کہ مجھ پر سے پاتالی چڑیل کا آسیب اتر چکا ہے۔ عورت ایک کوٹھڑی کے پاس جا کر رک گئی۔

کوٹھڑی کا دروازہ بند تھا اور اسے بھی تالا لگا ہوا تھا۔ بوڑھی عورت نے لالٹین نیچے رکھ دی اور چابیوں کے گچھے میں سے ایک چابی تلاش کر کے کوٹھڑی کا دروازہ کھول دیا اور کہا:

"اندر آجاؤ۔"

کوٹھڑی میں اندھیرا تھا۔ عورت لالٹین اندر لے کر آئی تو تھوڑی سی روشنی ہو گئی۔ اس نے لالٹین ایک بار پھر نیچے فرش پر رکھ دی اور جیب سے ماچس کی ڈبیا نکال کر جلائی اور ایک طاق میں رکھا ہوا مٹی کے تیل کا لیمپ روشن کر دیا۔ لیمپ کی ہلکی روشنی میں سب سے پہلی چیز جو میں نے دیکھی وہ یہ تھی کہ کوٹھڑی کی دیواروں پر سرخ رنگ پھرا ہوا تھا اور یہاں بھی وہی مردہ خانے والی بو پھیلی ہوئی تھی۔ میں عورت سے پوچھنا چاہتا تھا کہ دیواروں پر سرخ روغن کیوں کیا گیا ہے۔ پھر یہ سوچ کر چپ رہا کہ ہو سکتا ہے اس گھر کے مالک کو سرخ رنگ پسند ہو اور مجھے تو صرف تھوڑی سی رات یہاں گزارنی ہے۔ جیسے ہی دن نکلے گا میں یہاں سے چل دوں گا۔ مجھے اتنا زیادہ کریدنے کی کیا ضرورت ہے۔

کوٹھڑی میں دیوار کے ساتھ سرخ رنگ کا پرانا جھلنگا سا پلنگ بچھا ہوا تھا۔ عورت نے کہا:

"تم یہاں آرام کر سکتے ہو؟"

یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازے کے پاس جا کر رکی اور میری طرف مڑ کر بولی:

"صبح ہونے سے پہلے پہلے یہاں سے چلے جانا۔ میں باہر سے دروازے کو تالا نہیں لگاؤں گی۔"

وہ کوٹھڑی کا دروازہ بند کر کے چلی گئی۔ میں سوچنے لگا کہ یہ مکان ضرور علاقے کے کسی پرانے وضع دار قسم کے بوڑھے جاگیردار کا ہے اور اس نے یہاں مکان کی حفاظت کے لئے اس بوڑھی نوکرانی کو رکھ چھوڑا ہے۔ میں پلنگ پر بیٹھ گیا۔ میں نے کوٹھڑی کا جائزہ لیا۔ چھوٹی سی کوٹھڑی تھی جس میں ایک پلنگ بچھا تھا۔ سامنے دیوار کے پاس دو پرانی وضع کی آرام دہ کرسیاں پڑی تھیں جن پر گرد جم رہی تھی۔ چھت کے ساتھ ایک طرف جالے لٹک رہے تھے۔ کوٹھڑی میں کوئی کھڑکی اور روشندان نہیں تھا۔ فضا میں حبس تھا اور مردہ خون کی بو رچی ہوئی تھی۔ پہلے تو میرا جی چاہا کہ اس مردہ خانے سے نکل ہی جاؤں تو بہتر ہے۔ لیکن پھر جنگل کی تاریکی، سانپوں کی پھنکاروں اور موسلا دھار بارش کا خیال آیا تو یہی سوچا کہ جیسے بھی ہو اس کوٹھڑی میں بیٹھ کر جتنی رات باقی رہ گئی ہے گزار دوں۔ دن کی روشنی میں چاہے بارش بھی ہو رہی ہو تو نکل جاؤں گا۔ میں پلنگ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

باہر سے بارش کی آواز مسلسل آرہی تھی۔

مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہو رہی تھی کہ میں اب غیبی حالت میں نہیں تھا اور نارمل حالت میں واپس آگیا تھا۔ میں نے لیمپ کی روشنی میں اپنے بازوؤں کو قمیض ہٹا کر غور سے دیکھا۔ کسی جگہ سے نہ تو دھواں نکل رہا تھا اور نہ دھوئیں کا کوئی نشان ہی تھا۔ یہ بات

میرے لئے بڑی تسلی کا باعث تھی۔ مجھے یہ بھی خیال آنے لگا کہ اب چونکہ میں اپنی اصلی نارمل حالت میں واپس آ گیا ہوں تو مرن گھاٹ پر جا کر کامنی نرتکی سے ملنے کی بھی کیا ضرورت ہے۔ صبح ہو گئی تو میں یہیں سے واپس دریائے نربدا والی گھاٹ کی طرف چل دوں گا اور دریا پار کر کے منڈیل کر قصبے سے لاری پکڑ کر کھنڈوہ اور وہاں سے دلی کی طرف جانے والی ٹرین میں سوار ہو کر دلی اور پھر وہاں سے لاہور اپنے گھر روانہ ہو جاؤں گا اور پھر کبھی اس طرف کا رخ نہیں کروں گا۔

میرے دل سے جیسے کسی نے بہت بڑا بوجھ اٹھا لیا۔ اب میں بے تابی سے صبح ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ طاق میں لیمپ اپنی پُراسرار دھندلی دھندلی روشنی سرخ دیواروں پر ڈال رہا تھا۔ دیواروں کے پیچھے سے موسلادھار بارش کی دبی دبی آواز آ رہی تھی۔ میرے دیکھنے کے لئے سامنے لال لال دیواریں ہی تھیں۔ لیمپ کی دھیمی روشنی میں مجھے کسی وقت لگتا کہ سرخ خون کے رنگ کی دیواریں آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہی ہیں۔ کسی وقت لگتا کہ وہ سرخ رنگ کی ایک بہت بڑی لہر بن کر میرے اوپر سے گزر گئی ہیں اور میں ان میں ڈوب گیا ہوں۔ میں جلدی سے سر کو جھٹک کر پہلو بدل کر بیٹھ جاتا۔ اسی حالت میں نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ میں بیٹھا بیٹھا تھک گیا تو پلنگ پر تھوڑا سا لیٹ گیا۔ مجھے لیٹے ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ کوٹھڑی کے بند دروازے پر باہر سے کسی نے آہستہ سے دستک دی۔

میں حیران ہو کر اٹھ بیٹھا' یہ کون ہو سکتا ہے۔ بوڑھی عورت کو دستک دینے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے پوچھا:

"کون ہے؟"

باہر سے ایک بڑی مترنم نسوانی آواز آئی۔

"میں اندر آ جاؤں؟"

مجھے خیال آیا کہ یہ ضرور اس مکان کی مالک ہو گی اور مجھ سے ملنے یا میرے بارے

پوچھنے آئی ہو گی کہ میں کون ہوں اور اس طرف کیسے آ گیا تھا۔ میں نے کہا:

"آ جائیں۔"

دروازہ کھلا اور ایک لمبے کھلے بالوں والی بڑی حسین عورت اندر داخل ہوئی۔ اس کے لباس میں سے اس کا نیم عریاں جسم چاندنی کی طرح چمک رہا تھا۔ میں سنبھل کر بیٹھ وہ کرسی کھینچ کر میرے پلنگ کے پاس بیٹھ گئی۔ لیمپ کی روشنی میں وہ آکاش کی کوئی ای لگ رہی تھی۔ گل مہر کے سرخ پھول اس کے بالوں میں ایک طرف سجے ہوئے اس کا رنگ چمپئی تھا اور سیاہ آنکھوں میں ہیروں ایسی چمک تھی۔ اس نے بڑی لی سے کہا:

"مجھے نوکرانی لالیکا نے ابھی بتایا کہ ایک مسافر جو جنگل میں بھٹک گیا تھا ہمارے مکان پر وا ہے۔ میں نے سوچا کہ آپ سے چل کر پوچھوں آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں "

اس عورت کی شائستہ اور مہذب گفتگو سے مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ مجھے لگا کہ میں ں کی آسیبی دنیا سے نکل کر تہذیب یافتہ انسانوں کے معاشرے میں واپس آ گیا ہوں۔ نے کہا:

"جی نہیں! مجھے یہاں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہے۔ میں آپ لوگوں کا شکر گزار کہ آپ نے مجھے یہاں پناہ دی ورنہ اتنے گھنے جنگل کی تاریکی اور بارش میں' میں نہ نے کہاں سے کہاں نکل گیا ہوتا۔"

عورت کی عمر پچیس تیس سال کے درمیان ہو گی۔ کہنے لگی:

"یہ بڑے خطرناک جنگل ہیں۔ میں خود یہاں سال میں کبھی کبھار ہی جب شہر کے شور سے جی گھبراتا ہے تو آ جاتی ہوں۔ دراصل یہ پرانی حویلی میرے سورگباشی خاوند ن بکرم چند جی کی جاگیر میں ہے۔ میرا نام درگاوتی ہے۔ آپ کا نام کیا ہے؟"

یہ عورت مجھے ایک پڑھی لکھی اور ماڈرن زمانے کی خاتون لگ رہی تھی جو ایک

مرحوم جاگیردار کی بیوہ تھی۔ مَیں نے اسے اپنا اصلی نام بتانے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی اور اسے بتایا کہ مَیں مسلمان ہوں اور میرا نام سلیم احمد ہے، لاہور کا رہنے والا ہوں۔ باقی باتیں مَیں نے اسے نہ بتائیں کہ مَیں کیسی کیسی مصیبتوں میں سے گزر چکا ہوں۔ مَیں نے اسے کامنی نرتکی کے بارے میں بھی کچھ نہ بتایا اور یہی کہا کہ یہاں منڈیل کے قصبے میں میرا ایک دوست رہتا ہے اس کے ہاں چھٹیاں گزارنے آیا تھا کہ جنگل میں راستہ بھول کر اس طرف آ نکلا۔ درگاوتی میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ کہنے لگی:

"کوئی بات نہیں۔ صبح میرا نوکر آپ کو منڈیل کر چھوڑ آئے گا۔"

اتنے میں بوڑھی نوکرانی جس کا نام اس عورت نے لالیکا بتایا تھا اور جو مجھے اس کوٹھڑی میں لے کر آئی تھی۔ ایک ٹرے لے کر آ گئی جس میں چائے کے دو کپ اور کچھ بسکٹ رکھے تھے۔ اس نے ٹرے پلنگ پر رکھ دی۔ درگاوتی کہنے لگی:

"چائے اور بسکٹ ہم بمبئی شہر سے منگواتے ہیں۔ آپ کو شاید پسند آئیں۔"

مَیں نے محسوس کیا کہ اس دوران بوڑھی نوکرانی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ جیسے اس نے سر تھوڑا سا ہلا کر مجھے چائے پینے سے منع کیا ہو مگر مَیں نے کوئی خیال نہ کیا۔ درگاوتی بھی میرے ساتھ چائے پینے لگی۔ چائے کا ذائقہ بڑا اچھا تھا۔ چائے کے دو تین گھونٹ پینے کے بعد درگاوتی اچانک اٹھ کھڑی ہوئی۔ کہنے لگی:

"آپ آرام کریں، صبح ملاقات ہو گی؟"

اس نے ایک دل نواز مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا اور کوٹھڑی سے نکل گئی۔ اس خاتون کے اخلاق اور مہمان نوازی سے بڑا متاثر ہوا۔ اس کے جانے کے بعد چائے پینے لگا تو ایک دم ٹھٹھک سا گیا۔ پیالی میں چائے کا رنگ سرخ ہو رہا تھا۔ جیسے پیالی میں چائے کی جگہ خون بھرا ہُوا ہو۔ مَیں نے اسے سونگھا' اس میں سے خون کی بو آ رہی تھی۔ مَیں نے جلدی سے پیالی نیچے رکھ دی۔

مجھ پر گھبراہٹ سی طاری ہو چکی تھی۔ اتنے میں بوڑھی نوکرانی کوٹھڑی میں

داخل ہوئی۔ اس نے چائے کا ٹرے اٹھا لیا۔ وہ پیالی بھی اٹھا لی جس میں چائے کی جگہ خون بھر گیا تھا۔ میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ پیالی میں چائے کا رنگ لہو جیسا سرخ کیوں ہو گیا ہے کہ اس نے میری پیالی پر ایک نظر ڈال کر مجھے دیکھا اور آہستہ سے بولی:

"میں نے تمہیں خبردار کیا تھا کہ یہاں سے نکل جاؤ مگر تم نہیں نکلے۔ اب دیر ہو گئی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ ٹرے لے کر کوٹھڑی سے باہر چلی گئی۔ جاتے ہوئے وہ دروازہ بند کر گئی تھی مگر اس نے باہر تالا نہیں لگایا تھا۔ پیالی میں خون دیکھ کر اور اس نوکرانی کی بات سننے کے بعد مَیں وہاں ایک سیکنڈ بھی نہیں ٹھہرنا چاہتا تھا۔ مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ میرے اردگرد کوئی جال پھیلا دیا گیا ہے جو آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہا ہے۔ مَیں جلدی سے پلنگ سے اٹھا اور کوٹھڑی کے دروازے کی طرف بڑھا۔ بمشکل چند قدم چلنے کے بعد مجھے ایک چکر سا آیا اور مَیں گر پڑا۔ اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔

جس وقت مجھے ہوش آیا تو مَیں نے دیکھا کہ میرے اوپر سرخ رنگ کی چھت ہے' جس میں جالے لٹک رہے ہیں۔ میں پتھر کے ایک چبوترے پر بالکل سیدھا لیٹا ہوا ہوں۔ میرے کانوں میں دبی دبی سی ایسی آوازیں آ رہی تھیں جیسے بہت سی عورتیں بین کرتے ہوئے رو رہی ہوں۔ خوف کے مارے میرا حلق خشک ہو گیا۔ میں نے اٹھنا چاہا لیکن میں اپنے جسم کو نہ ہلا سکا' جیسے میرا جسم مردہ ہو چکا تھا۔ نہ بازو ہلتا تھا' نہ ٹانگیں اور پاؤں ہلتے تھے۔ نہ ہونٹ ہلتے تھے' نہ گردن گھما سکتا تھا۔ صرف آنکھیں اور دماغ زندہ تھا۔ جسم میں خون کی گرمی محسوس ہو رہی تھی مگر جسم پتھر ہو گیا تھا۔ میں نے لیٹے لیٹے آنکھیں گھما کر دائیں بائیں اور سامنے نظر ڈالی۔ یہ ایک اونچی چھت والا بڑا کمرہ تھا۔ سامنے کی سرخ دیوار میں ایک سیاہ شگاف بنا ہُوا تھا۔ دائیں بائیں دیواروں پر انسانی ہڈیوں کے تین چار پنجر لٹکتے نظر آئے تو میرا دل دہشت سے ڈوبنے لگا۔

مَیں شائد پہلے سے زیادہ کسی بڑی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ مَیں نے بولنا چاہا، کر
آواز دینی چاہی، الفاظ میرے حلق تک آ کر خشک ہوگئے۔ میرے حلق سے مز
غرغراہٹ کی آواز ہی نکل سکی۔ یہ آواز اتنی ڈراؤنی تھی کہ مَیں اپنی آواز سے بھی ڈر گیا
میرا ذہن پوری طرح سے کام کر رہا تھا۔ مجھے سب کچھ یاد تھا کہ مَیں کون ہوں اور کہ
سے آیا تھا اور کیسے جنگل کے ایک پُراسرار مکان میں میری ملاقات ایک حسین عورت
ہوئی تھی جس نے مجھے چائے پلائی تھی اور چائے پینے کے بعد مَیں بے ہوش ہوگیا تو
عورتوں کے بین کرنے کی آوازیں جو پہلے دور سے آ رہی تھیں اب میرے قریب ہو
گئیں۔ مجھے ایسے محسوس ہُوا جیسے مَیں مرگیا ہوں اور میرے عزیز و اقارب میرے ارد گ
بیٹھے میری میت پر رو رہے ہیں' بَین کر رہے ہیں۔ خوف کے مارے میرے حلق سے
بَین کی آوازیں نکلنے لگیں۔ پھر یہ آوازیں آہستہ آہستہ دور ہونے لگیں اور اتنی دور
گئیں کہ مجھے اِن کی بازگشت سی سنائی دینے لگی۔

میری آنکھیں سامنے والی دیوار کے شگاف پر جمی ہوئی تھیں۔

میرے دیکھتے دیکھتے شگاف میں سے دھواں سا اٹھنا شروع ہوگیا۔ پھر اس دھوئیں
سے ایک شکل ابھرنے لگی۔ اس شکل نے پہلے رام پیاری کی شکل اختیار کرلی جو
لاہور کے ایک مندر کے باہر ملی تھی اور جس نے مجھے اس عذاب میں ڈالا تھا۔ اس
بعد رام پیاری کی شکل درگاوتی کی شکل بن گئی۔ اس کے بال کھلے تھے اور بالوں میں
مہر کے سرخ پھول تھے۔ مگر اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ کی بجائے غیض و غضب
چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ دہشت کے مارے میرے حلق سے ایسی دبی دبی آواز
رہی تھی' جیسے کوئی انتہائی بے بسی کے عالم میں کراہ رہا ہو۔ درگاوتی کی شکل بھی تبد
گئی اور اب اس کی جگہ ایک ایسی بھیانک شکل شگاف میں نمودار ہوئی جس کو د
میری روح لرز اٹھی۔ یہ پاتالی چڑیل کی شکل تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے
آنکھیں لال انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ سرخ زبان باہر لٹک رہی تھی۔ ؟

میں سے دو نوکیلے دانت چھریوں کی طرح باہر کو نکلے ہوئے تھے۔ اس کے سر میں سے
دھواں اٹھ رہا تھا۔ پاتالی چڑیل ایک بھیانک چیخ کے ساتھ شگاف میں سے باہر آگئی۔ اس کا
عریاں جسم بن مانس کی طرح بالوں سے بھرا ہُوا تھا اور اس مکروہ جسم میں سے دھوئیں کی
لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اس نے دونوں بازو کھول رکھے تھے۔ اس کے ایک ہاتھ میں سیاہ
رنگ کا سانپ تھا اور دوسرے ہاتھ میں ایک چمگادڑ تھی جس نے اپنے پَر پھیلائے ہوئے
تھے اور اپنی ڈراؤنی خون آلود تھوتھنی میں سے عجیب آوازیں نکال رہی تھی۔ پاتالی چڑیل
شگاف سے نکل کر میرے اوپر آ کر جھک گئی۔

مَیں نے آنکھیں بند کرنی چاہیں لیکن مَیں اپنی آنکھیں بند نہ کرسکا۔ پاتالی چڑیل نے
سانپ مجھ پر چھوڑ دیا اور چمگادڑ کو اڑا دیا۔ سانپ میرے جسم پر رینگنے لگا۔ چمگادڑ نے
کمرے کا ایک چکر لگایا اور پھڑپھڑاتی ہوئی سیدھی غوطہ لگا کر میری گردن سے چمٹ گئی۔
اس نے پنجے میری گردن میں گاڑ دیئے اور اپنا منہ میری گردن کے دائیں جانب لگا دیا۔
مجھے اپنی گردن میں اس کے باریک دانت چبھتے محسوس ہوئے۔ وہ میرا خون پی رہی تھی۔
میں ایک ایسے مردے کی طرح چبوترے پر پڑا تھا جس کی رگوں میں خون گردش کر رہا تھا
مگر جس کا جسم بے حس و حرکت تھا۔ پاتالی چڑیل میرے اوپر جھکی اپنی انگارہ آنکھوں سے
مجھے دیکھ رہی تھی۔ چمگادڑ جب میرا خون جی بھر کر پی چکی تو پاتالی نے اسے میری گردن
سے کھینچ کر الگ کیا۔ چمگادڑ کے منہ کے ساتھ میرا خون لگا ہوا تھا۔ پاتالی نے چمگادڑ کو اپنے
منہ کے ساتھ لگا لیا اور وہ اس کا خون پینے لگی۔ پھر پاتالی نے اپنا خون آلود منہ میرے منہ
کے ساتھ لگا دیا۔ مجھے خون کا ذائقہ محسوس ہُوا۔ یہ انتہائی کڑوا خون تھا۔ میرے حلق سے
اذیت ناک ڈراؤنی آوازیں نکل رہی تھیں۔ دہشت نے مجھے سن کر دیا تھا۔

پھر سانپ میری گردن سے لپٹ گیا۔ جہاں سے چمگادڑ نے میرا خون پیا تھا۔ سانپ نے
وہاں اپنا منہ لگا دیا۔ شاید اب وہ میرا خون پینے لگا تھا۔ پاتالی نے سانپ کو بھی ایک جھٹکے
سے میری گردن سے الگ کر دیا۔ اب وہ میرے پاؤں کی طرف پورے قد سے کھڑی

تھی۔ اس کے جسم سے دھواں اٹھنے لگا تھا۔ اس کے ہونٹ میرے خون سے سرخ ہو رہے تھے۔ باہر کو نکلے ہوئے نوکیلے دانتوں پر بھی میرا خون تھا۔ مجھ پر بے ہوشی کی کیفیت طاری ہونے لگی اور کچھ دیر کے بعد میری آنکھوں کے پپوٹے اپنے آپ بند ہو گئے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میری یہ حالت کب تک رہی۔ صرف اتنا احساس ہُوا کہ کچھ ہاتھوں نے اٹھا کر کسی دوسری چیز پر ڈال دیا ہے۔ پھر میرے ہوش و حواس نے جواب دے دیا۔

جب مجھے کچھ ہوش آیا تو مَیں نے آنکھیں کھول کر دیکھا کہ مَیں اسی لال خون رنگ دیواروں والی منحوس کوٹھڑی کے بوسیدہ پلنگ پر پڑا ہوں۔ میں نے ہاتھ پاؤں ہلائے میرے جسم کی حرکت واپس آگئی تھی۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے چکر سا آگیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ طاق میں اسی طرح مٹی کے تیل کا لیمپ جل رہا تھا۔ ذرا میری طبیعت سنبھلی تو میں نے لیمپ کی پھیکی روشنی میں کوٹھڑی کے دروازے کی طرف دیکھا، دروازہ بند تھا۔ میں پلنگ سے اٹھ کر دروازے تک گیا۔ اسے باہر کو دھکیلا' دروازہ کھل گیا۔ باہر راہ داری میں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ میں اس آسیب زدہ مکان سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ میں نے لیمپ کے پاس آکر اپنے جسم کا جائزہ لیا۔ گردن پر ہاتھ پھیرا۔ گردن پر چمگادڑ کے دانتوں کا کوئی نشان یا زخم وغیرہ نہیں تھا۔ میرے کپڑے بھی وہی تھے جو میں نے پہن رکھے تھے۔ میں سوچنے لگا: کیا میں نے کوئی خواب دیکھا تھا؟ ڈراؤنا خواب ——— جو کچھ بھی تھا مجھے اب اس آسیبی گھر سے خوف آنے لگا تھا۔ میں راہ داری میں سے گزرتا ہُوا مکان کے دروازے تک آگیا۔ دروازہ بند تھا۔ میں نے ٹٹول کر دیکھا۔ دروازے کی نہ کنڈی لگی ہوئی تھی نہ تالا لگا ہُوا تھا۔ مَیں نے جلدی سے دروازہ کھول کر باہر دیکھا۔ رات کا وقت تھا۔ جنگل اندھیرے اور خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ بارش ختم ہو چکی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی رات ہے جب میں بارش سے بچنے کے لئے اس مکان میں آیا تھا یا دوسرے دن کی رات ہے؟ بوڑھی نوکرانی کا بھی کچھ پتہ نہیں تھا۔ میں جلدی سے مکان سے نکلا اور اندھیرے میں

درختوں کے نیچے اس طرف دوڑ پڑا جس طرف سے میں رات کو اس مکان کی طرف آیا تھا۔

میں نے تھوڑی دور جا کر مڑ کر آسیب زدہ مکان کی طرف دیکھا۔ اس کی دوسری منزل کے روشندان میں جو روشنی پہلے نظر آ رہی تھی اب بجھ چکی تھی۔ میں اندھیرے میں جتنی تیز چل سکتا تھا چلنے لگا۔ کبھی خیال آتا کہ یہ سب کچھ میرا وہم تھا کہ میں مکان میں داخل ہوا اور مجھے ایک بوڑھی نوکرانی کوٹھڑی میں لے گئی اور پھر ایک عورت درگا وتی سے ملاقات ہوئی جس نے مجھے چائے میں کچھ پلا کر بے ہوش کیا اور اس کے بعد وہ ڈراؤنا ڈرامہ رچایا گیا جس کے تصور ہی سے میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ کبھی خیال آتا کہ نہیں یہ سب کچھ میرے ساتھ حقیقت میں ہو چکا ہے۔ لیکن میری گردن پر خون چوسنے والی مکروہ چمگادڑ کے دانتوں کا ایک بھی نشان نہیں تھا۔ جنگل میں وہی کھلی جگہ آگئی جہاں درخت نصف دائرے کی شکل میں کھڑے تھے۔ یہاں سے ایک دھندلا سا راستہ بائیں جانب جھاڑیوں میں جاتا نظر آیا۔ میں اس پر چل پڑا۔ کچھ دور چلنے کے بعد ایک تالاب سا آگیا۔ میں تالاب کے قریب سے ہو کر گزر گیا۔ یہاں جنگل کا گھنا پن ختم ہو رہا تھا۔ درخت دور دور چلے گئے تھے۔ میں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی۔ آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ ان تاروں کی دھندلی روشنی میں' مَیں ایک جانب چلتا گیا۔

جنگل کی تازہ فضا میں سانس لینے سے میری طبیعت پہلے سے بہتر ہو گئی تھی اور میں صحت مند انداز میں سوچنے لگا تھا۔ چلتے چلتے میں ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں سامنے کچھ ٹیلے اور چٹانیں دکھائی دے رہی تھیں۔ مجھے یاد آگیا کہ میں کامنی نرتکی کے کھنڈر کے قریب پہنچ گیا ہوں۔ اس نے یہی نشانی بتائی تھی اور میں یہاں ایک مرتبہ آ بھی چکا تھا۔ میں چٹانوں میں سے گزرتا ہوا پہاڑی ٹیلے کی طرف بڑھا۔ آخر مجھے ستاروں کی پھیکی روشنی میں ایک عمارت نظر آئی۔ مجھے یاد آگیا کہ یہی وہ کھنڈر ہے جہاں کامنی نرتکی رہتی ہے اور جسے لوگ مرن گھاٹ کے نام سے پکارتے ہیں اور جس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس طرف

جو کوئی جاتا ہے پھر زندہ واپس نہیں آتا۔ کھنڈر سنسان پڑا تھا۔ اس کے اندر کامنی ز
کی ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی' جہاں اس نے شولنگ کا بت رکھا ہوا تھا جس کی وہ پو
کرتی تھی۔

میں کھنڈر میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا کوٹھڑی کے دروازے تک آ گیا۔ کوٹھڑی
دروازہ چوپٹ کھلا تھا اور اندر گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ میں نے آہستہ سے کامنی کو آو
دی۔

"کامنی! کامنی!"

دو تین بار آواز دینے پر کوٹھڑی میں پہلے گہرا سانس لینے او پھر کسی کے لباس
سرسراہٹ سنائی دی۔ میں نے کہا:

"کامنی! کیا یہ تم ہو؟"

اچانک طاق میں رکھا ہوا دیا روشن ہو گیا۔

میں نے دیکھا کہ کامنی طاق کے پاس کھڑی تھی۔ گیروے رنگ کی ریشمی چادر نے ا
کے بدن کو ڈھانپ رکھا تھا۔ دیئے کی روشنی میں اس کا چہرہ پتھر کی طرح ساکت محسوس
رہا تھا۔ میں اپنی جگہ پر ہی کھڑا رہا۔ وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں اس کی طرف د
رہا تھا' پھر اس نے دھیمی آواز میں کہا:

"آخر تمہارے ساتھ وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا' اس کا منہ تکتا رہا۔ اس خیال سے میرا دل جیسے ڈوب
کہ جو کچھ میرے ساتھ گزر چکا ہے اور جسے میں ایک ڈراؤنا خواب سمجھ رہا تھا کہیں
حقیقت نہ ہو۔ کامنی طاق سے ہٹ گئی' کوٹھڑی کے درمیان شولنگ کا لمبوترا پتھر
مورت کی طرح زمین سے باہر نکلا ہوا تھا۔ اس کے اوپر پھولوں کا ہار پڑا ہوا تھا۔ کا
شولنگ کے پتھر کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس نے کہا:

"میرے سامنے بیٹھ جاؤ۔"

میں خاموشی سے اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ میرے ساتھ کیسے
کیسے دہشت ناک واقعات گزر چکے ہیں۔ میں نے زبان کھولی ہی تھی کہ کامنی نے ہاتھ اٹھا
کر کہا:

"تمہارے ساتھ جو کچھ ہو چکا ہے مجھے سب کی خبر ہے۔ مجھے بتانے کی کوئی ضرورت
نہیں ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ——————"

اس نے مجھے جملہ مکمل نہ کرنے دیا۔ کہنے لگی:

"شاید تمہیں معلوم نہیں کہ تم ایک ایسی آفت میں پھنس چکے ہو کہ جہاں سے میں
بھی تمہیں نہیں نکال سکتی۔ بس، اس سے زیادہ میں کچھ بیان نہیں کر سکتی۔ اس لئے
نہیں کہ تمہیں بتا نہیں سکتی بلکہ اس لئے کہ خود مجھے اس کو بیان کرنے کی اجازت نہیں
ہے۔ اگر میں نے تمہیں ذرا سا بھی بتا دیا تو میں گندھرو دیوتاؤں کی آگ میں جل کر راکھ
ہو جاؤں گی۔"

میں پہلے ہی ڈرا ہوا تھا۔ کامنی کی باتیں سن کر اور زیادہ خوف زدہ ہو گیا۔ میں نے کہا:
"آخر میرا قصور کیا ہے؟ میں نے تو تمہارے کسی دیوی دیوتا کا کچھ نہیں بگاڑا پھر مجھ پر یہ
آفت کس لئے نازل ہوئی ہے؟"

کامنی نے کہا۔ "یہ میں کچھ نہیں جانتی۔ تمہاری قسمت میں جو لکھا تھا وہ پورا ہو گیا
ہے۔"

مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے کہا:

"تو پھر میری بھی ایک بات سن رکھو۔ میں مسلمان ہوں۔ ایک اللہ کے سوا کسی کو
معبود نہیں مانتا۔ میں تمہارے بتوں کو جھوٹا سمجھتا ہوں' میرا ایمان تم سے زیادہ پختہ ہے۔
مجھے اپنے اللہ پر یقین کامل ہے۔ تمہارے دیوی دیوتا' تمہاری چڑیلیں چاہے کچھ کر لیں' وہ
میرا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔"

کامنی خاموشی اور تحمل سے میری باتیں سنتی رہی۔ جب میں چپ ہو گیا تو وہ بو
"مجھے خوشی ہوئی ہے کہ تم اپنے ایمان پر قائم ہو۔ شاید یہ تمہارا پختہ ایمان ہی کا کرش
ہے کہ تم ابھی تک زندہ ہو لیکن ہونی ہو کر رہتی ہے۔ سنسار میں ہونی کا چکر بھی
رہتا ہے۔ ہونی تم پر وار کرے گی، وہ تم پر وار کرنے سے باز نہیں آئے گی۔ تمہارا ای
جب تک تمہارے ساتھ رہے گا وہ تمہاری حفاظت کرے گا۔"

مَیں نے کہا۔ "مَیں تمہاری ہونی وغیرہ کو کچھ نہیں سمجھتا۔ مَیں تمہارے پاس اس لئے
گیا ہوں کہ مَیں تمہیں اپنی داستان سنانا چاہتا تھا۔ اب میں جا رہا ہوں۔ میرے ساتھ
کچھ ہو گا' مَیں دیکھ لوں گا۔"

کامنی نے آنکھیں بند کر لیں۔ مَیں بھی خاموش ہو گیا۔ دیئے کی لو ساکت تھی۔
کی روشنی میں کامنی کا چہرہ کسی مورتی کی طرح لگ رہا تھا۔ پھر اس نے آنکھیں ک
دیں۔ میری طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھا اور پُرسکون آواز میں بولی:

"تم پر جو آفت نازل ہو چکی ہے مَیں اسے دور نہیں کر سکتی۔ یہ میرے اختیار سے
ہے' لیکن اتنا ضرور کر سکتی ہوں کہ جب تمہاری ہمت جواب دے جائے اور زند
رشتہ توڑ دینے والی طاقتیں تم پر حملہ کریں تو تمہاری مدد کو آ جاؤں۔"

میں نے تلخ لہجے میں کہا:

"؟مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے سوائے خدا کے اور کسی کی مدد
چاہیے۔"

کامنی نے آہستہ سے کہا:

"یہ بھی خدا ہی کی مرضی ہے کہ میں تمہاری مدد کروں۔ میں بھی تمہارے اور
خدا ہی کے حکم سے تمہاری مدد کروں گی۔"

"مگر تم تو بت پرست ہو۔ ایک خدا پر تمہارا ایمان نہیں ہے پھر تم یہ بات کیسے
رہی ہو؟"

کامنی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا:

"تم نہیں سمجھ سکو گے ان باتوں کو۔ اگر تمہیں میرا کچھ خیال ہے اگر تمہیں اپنا کچھ
خیال ہے تو آئندہ اپنے ایمان کو کمزور نہ ہونے دینا۔ آئندہ کبھی اپنے خدا کے ساتھ کسی
دوسری طاقت کا سہارا تلاش نہ کرنا۔ کسی دوسری طاقت کو خدا کے ساتھ شریک نہ کرنا۔
تم سے ایک ایسا ہی گناہ سرزد ہو چکا ہے۔ شاید تم یہ اسی کی سزا بھگت رہے ہو۔ یہ ساری
مصیبت تمہاری اپنی بلائی ہوئی ہے۔ کسی دوسرے نے تمہیں اس میں مبتلا نہیں کیا۔ یاد
رکھو' انسان ہمیشہ اپنی لائی ہوئی مصیبتوں میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں
کہنا چاہتی۔"

کامنی کی ایک انگلی میں چاندی کی ایک انگوٹھی ہمیشہ پڑی ہوتی تھی۔ اس وقت بھی اس
نے انگلی میں چاندی کی انگوٹھی پہنی ہوئی تھی۔ اس نے انگلی میں سے چاندی کی انگوٹھی
اتار کر مجھے دی اور کہا:

"اصل مدد خدا ہی کی طرف سے آتی ہے' اصل کارساز وہی ہے۔ ہاں دنیا میں وہ ایک
وسیلہ ضرور پیدا کر دیتا ہے۔ یہ انگوٹھی اپنے طور پر کچھ بھی نہیں ہے۔ اسے بھی اپنے خدا
اور میرے بھگوان کی طرف سے ایک وسیلہ ہی سمجھو۔ اسے اپنے پاس رکھو۔ جب کبھی
زندگی میں تمہیں میری ضرورت محسوس ہو' اس کو اپنے جسم پر تین بار رگڑنا۔ میں جہاں
بھی ہوئی جس حالت میں بھی ہوئی تمہارے پاس تمہاری مدد کو پہنچ جاؤں گی؟"

میں نے انگوٹھی لے لی۔ اس نے کہا:

"اس طرح اس کے گم ہو جانے کا خطرہ ہے۔ اسے اپنی انگلی میں پہن لو۔"

اس کی انگوٹھی میری سب سے چھوٹی انگلی میں صحیح آ گئی۔ کامنی اٹھ کھڑی ہوئی۔ کہنے
لگی:

"میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں دریا پار ایک ریلوے سٹیشن پر چھوڑ آتی ہوں۔ میں
چاہتی ہوں کہ تم اس علاقے میں زیادہ دیر نہ ٹھہرو۔"

وہ مجھے ساتھ لے کر کھنڈر سے باہر آ گئی۔

رات ڈھلنا شروع ہو گئی تھی۔ کھنڈر کے چاروں طرف گھنا جنگل تھا جو پچھلی رات کے اندھیرے میں پہلے سے زیادہ ڈراؤنا لگ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا:

"یہاں ہمیں کس طرف جانا ہوگا؟ دریا کا گھاٹ تو یہاں سے مشرق کی طرف کافی فاصلے پر ہے اور اس وقت جنگل میں راستہ بھی نہیں ملے گا۔"

کامنی نرتکی نے کہا: "تمہیں اس کی فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے میں جو تمہارے ساتھ ہوں۔ اس طرف میرے ساتھ ساتھ چلے آؤ۔"

کھنڈر کے پیچھے دوسری جانب پہاڑی ٹیلے کے پہلو میں ایک گھاٹی سی تھی' جہاں بڑا گہرا اندھیرا تھا۔ کامنی مجھے لے کر اس طرف چل پڑی۔ گھاٹی میں تھوڑا سا نشیب تھا۔ ہم نشیب میں اتر گئے۔ آگے چڑھائی تھی۔ چڑھائی چڑھ کر ہم دوسرے ٹیلے کے دامن میں گئے۔ یہاں ایک کافی بڑی جھیل تھی' جس کی سطح پر ستاروں کی روشنی میں کھلے ہوئے کنول پھول دور تک نظر آ رہے تھے۔ کامنی نے کہا:

"میرا ہاتھ پکڑ لو۔"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ کامنی نے اونچی آواز میں کوئی طلسمی منتر پڑھا جو میری سمجھ میں نہ آیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے میرے ہاتھ کو آہستہ سے کھینچا اور ہم دونوں جھیل کی سطح پر آ گئے۔ میں ڈر کر کبھی ایک پاؤں اوپر کرتا کبھی دوسرا پاؤں اوپر اٹھا لیتا۔ اس خیال سے کہ میں پانی میں نہ ڈوب جاؤں۔ مگر مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے میں ہوا میں کھڑا ہوں۔ پھر کامنی آہستہ آہستہ جھیل کے اوپر ہوا میں آگے بڑھنے لگی۔ میں بھی اس کے ساتھ ہوا میں اپنے آپ آگے کو جانے لگا۔

جیسے جیسے ہم جھیل کی سطح پر آگے بڑھ رہے تھے کامنی کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی۔
یل کی سطح سے اوپر بھی اٹھتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ ہم جھیل کے اوپر اڑتے
ٔ جھیل کے دوسرے کنارے پر آ گئے۔ یہاں ہر طرف درخت ہی درخت تھے۔
ا میرے ہاتھ کو پکڑ کر ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ ایک دم زمین سے کوئی بیس فٹ بلند
۔ جب جنگل کے درخت قریب آئے تو وہ ذرا سا اچھلی اور ہم زمین سے اور زیادہ
اپر آ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہم درختوں سے بھی اوپر ہوا میں پرواز کرتے جا رہے تھا۔
ں اس طرح پرواز کرنا مجھے بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ یہ ایک ایسا تجربہ تھا جس کا مزا ہر
نہیں اٹھا سکتا تھا۔ ہوا میرے اور کامنی نرتکی کے بالوں کو اڑا رہی تھی۔ یہ بڑی
ار اور ٹھنڈی ہوا تھی۔ اس علاقے میں سردیوں کا موسم نہیں آتا تھا۔ میں نے نیچے
ہمارے نیچے ڈھلتی رات کے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے درختوں کے جھنڈ سیاہ
کی طرح لگ رہے تھے۔ سامنے دور تک سوائے تاریکی کے اور کچھ نظر نہیں آتا
لانے کامنی سے پوچھا:
ہم کس شہر کی طرف جا رہے ہیں؟
ئی نے ذرا اونچی آواز میں جواب دیا:
جب شہر قریب آئے گا تو بتا دوں گی؟"

کامنی نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میری اڑنے کی رفتار بھی اپنے آپ تیز ہو گئی۔ کامنی اپنے ارادے سے رفتار کو کم اور تیز کرتی تھی۔ یہ اس نے مجھے بعد میں بتایا تھا' وہ رفتار تیز کرنا چاہتی تو ارادہ کرتی اور اس کی رفتار تیز ہو جاتی تھی۔ یہ کوئی کرشمہ یا معجزہ نہیں تھا۔ یہ محض جادو اور طلسم تھا۔ کافی دیر تک ہم اسی رفتار سے ہوا میں اڑتے رہے۔ اس کے بعد دور سے کسی شہر کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔

کامنی نے ان روشنیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا:

"یہ برہان پور شہر کی روشنیاں ہیں۔ برہان پور سے بمبئی شہر زیادہ دور نہیں ہے۔ یہاں سے بمبئی چلے جانا۔ بمبئی میں ایک بزرگ کا مزار ہے۔ میں تمہیں کچھ پھول دوں گی میری طرف سے اس بزرگ کے مزار پر فاتحہ پڑھنا۔ جس طرح تم مسلمان لوگ پڑ کرتے ہو اور میری طرف سے پھول چڑھا دینا۔"

تھوڑی دیر میں کامنی اور میں برہان پور شہر کے ریلوے سٹیشن سے کچھ فاصلے پر ا ویران سی جگہ پر زمین پر اتر آئے۔ میں نے کامنی سے کہا:

"مجھے ہوا میں اڑنا بہت اچھا لگا ہے کامنی! کاش! میں بھی اس طرح ہوا میں اڑ سک

کامنی مسکرانے لگی۔ اس نے کہا:

"یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ مجھے تم سے اتنی ہمدردی کیوں" ہے۔ شاید اس لئے کہ تم مجھے اچھے لگتے ہو۔ میں یہ تو نہیں کہوں گی کہ مجھے تم سے ہو گیا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ بات بھی ہو لیکن ابھی اس کا مجھے پورا یقین نہیں ہے۔" میں تمہاری یہ خواہش بھی پوری کر دیتی ہوں۔"

پھر اس نے ایک منتر پڑھا۔ کہنے لگی:

"اسے میرے ساتھ دہراؤ۔"

چھوٹا سا منتر تھا مگر تھا بڑا اوٹ پٹانگ ———— میں اس کے پیچھے منتر کو دہرا

دس بارہ دفعہ منتر دہرانے کے بعد مجھے زبانی یاد ہو گیا۔ کامنی نے کہا:

"اگر کبھی تمہیں ہوا میں اڑنے کی ضرورت محسوس ہو تو اس منتر کو تین بار پڑھ کر پھونکنا۔ تم اپنے آپ ہوا میں بلند ہو جاؤ گے اور پھر جس طرف کا ارادہ کرو گے' جتنی رفتار سے چاہو گے پرواز کرنے لگو گے لیکن ایک بات کی شرط ہے۔ شرط یہ ہے کہ تم اس منتر کو صرف اس حالت میں پڑھو گے جب تمہاری جان پر کوئی بھاری مصیبت آ جائے اور تمہارے سامنے فرار کا کوئی دوسرا راستہ نہ ہو۔ اس کے علاوہ اگر اڑنے کی کوشش کرو گے تو تمہیں الٹا نقصان پہنچ سکتا ہے۔"

میں نے منتر کو دل میں دہرا دہرا کر پکا کر لیا تھا۔ میں نے کہا:

"تم جیسے کہتی ہو' میں ویسے ہی کروں گا اور بلا ضرورت منتر پڑھ کر نہیں پھونکوں گا۔"

کامنی نے سیدھا ہاتھ ایک طرف پھیلا دیا۔ دوسرے لمحے اس کے ہاتھ میں ایک گلدستہ تھا۔ گلدستہ مجھے دے کر بولی:

"بزرگ کے مزار پر میری طرف سے سلام عرض کرنا۔ فاتحہ پڑھنا اور میری طرف سے یہ حقیر نذرانہ ان کے مزار کے پاس رکھ دینا۔ اب تم جاؤ۔ سٹیشن سامنے ہی ہے۔"

مجھے یاد آ گیا کہ میرے پاس تو ٹکٹ کے لئے ایک پیسہ بھی نہیں ہے' جب میں کامنی سے اس کا ذکر کیا تو وہ بولی:

"فکر نہ کرو' اس کا انتظام بھی کر دیا گیا ہے۔ جاؤ اللہ حافظ! بھگوان کے سپرد!"

اور کامنی ہوا میں اوپر کو بلند ہوئی اور دیکھتے دیکھتے میری نظروں سے غائب ہو گئی۔ میں گلدستہ ہاتھ میں لے کر ریلوے سٹیشن کی طرف بڑھا۔ ریلوے سٹیشن پر کافی روشنیاں تھیں۔ ایک ریلوے انجن کے شنٹ کرنے کی چھک چھک کی آواز بھی کسی وقت آ جاتی تھی۔ اس زمانے میں ابھی تک کوئلے سے چلنے والے انجن چلا کرتے تھے۔ ابھی ڈیزل کے انجنوں کا کسی نے نام بھی نہیں سنا تھا۔ میں سٹیشن کے گیٹ پر آ کر رک گیا۔ سب سے پہلے مجھے یہ دیکھنا تھا کہ میں دوسروں کو نظر آ رہا ہوں یا ابھی تک غیبی حالت میں ہی ہوں۔

اگرچہ مجھے درگادتی کے آسیبی مکان پر خود درگادتی اور اس کی بوڑھی نوکرانی نے دیکھ لیا تھا اور کامنی کو بھی میں نظر آ گیا تھا اور اس نے مجھے یہ نہیں کہا تھا کہ میں غیبی حالت میں ہوں اور صرف وہی مجھے دیکھ سکتی ہے۔ پھر بھی میں اس کی تصدیق کرنی چاہتا تھا۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ سٹیشن کی عمارت کی سیڑھیوں کے پاس ہی چائے کی ایک دکان کھلی تھی۔ جہاں کچھ لوگ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ آسمان پر دن کا اجالا نمودار ہونے لگا تھا۔ میں نے ایک آدمی سے پوچھا:

"کیوں بھائی صاحب! بمبئی کو ٹرین کس وقت جاتی ہے؟"

اس نے چائے پیتے ہوئے میری طرف ایک نگاہ ڈال کر دیکھا اور بولا:

"ابھی فرنٹیئر میل بمبئی کی طرف گئی ہے۔ تم کہاں سو رہے تھے؟"

مَیں نے کہا: "بھائی صاحب! مَیں ابھی ابھی سٹیشن پر آیا ہوں۔" اس نے بے نیازی سے کہا:

"تو پھر سٹیشن پر جا کر بیٹھ جاؤ۔ ایک گھنٹے بعد پنجاب میل آئے گی۔ اس میں سوار ہو جانا۔ وہ تمہیں بمبئی پہنچا دے گی۔"

اس شخص کا مَیں نے شکریہ ادا کیا اور سٹیشن کی عمارت کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اس آدمی سے مل کر یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ مَیں غائب نہیں ہوں۔ حاضر ہوں اور سب کو نظر آ رہا ہوں۔ مَیں نے دل میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ اب مجھے یہ فکر تھی کہ ریل گاڑی کا ٹکٹ کہاں سے لوں گا۔ میری جیب میں ایک پائی بھی نہیں تھی اور مجھے بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ کامنی نے کہا تھا کہ میری ٹکٹ کے پیسوں کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ مگر یہ کیا انتظام ہُوا تھا' اس کی کوئی واضح شکل نظر نہیں آ رہی تھی۔ مَیں نے سوچ لیا کہ بغیر ٹکٹ ٹرین میں بیٹھ جاؤں گا۔ آگے جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ ٹی ٹی نے پکڑ لیا تو اس کی منت سماجت کر کے کہہ دوں گا کہ میری جیب کٹ گئی تھی۔ سارے پیسے جیب کترا لے گیا؟ میرا بمبئی پہنچنا بڑا ضروری ہے' آپ کی مہربانی ہو گی وغیرہ وغیرہ۔ یہ سوچ کر مَیں

ے کے پاس ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ مسافر اپنے اپنے سامان کے ساتھ تانگوں وغیرہ سے اتر ہ تھے۔ صبح ہو گئی تھی۔ سٹیشن پر کافی رونق تھی۔ ایک دبلا پتلا لڑکا میرے پاس آ کر گیا۔ اس کے فلمی ہیرو کی طرح کے لمبے بال تھے۔ وہ سگریٹ پی رہا تھا۔ میں نے اس پوچھا:

"پنجاب میل کس وقت پہنچتی ہے بھائی صاحب؟"

اس نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے کہا:

"گھنٹے پون گھنٹے میں آ جائے گی۔"

"یہ بمبئی کس وقت پہنچے گی؟" میں نے پوچھا:

وہ بولا۔ "شام کے وقت پہنچتی ہے بمبئی۔"

اتنا کہہ کر وہ اٹھا اور ایک طرف کو چل پڑا۔ چند قدم چلنے کے بعد اس نے کھڑے ہو پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ جیب میں سے ایک لفافہ نکالا اور پلٹ کر میرے پاس آ یا۔ لفافہ میری طرف بڑھا کر کہنے لگا:

"بھائی صاحب! آپ کی ایک امانت میرے پاس ہے' یہ لے لیجئے۔"

اس نے لفافہ میرے ہاتھ میں تھمایا اور سگریٹ کے کش لگاتا سٹیشن کی ڈیوڑھی کے یٹ سے باہر نکل گیا۔ میں کچھ سمجھ نہ سکا کہ یہ کون لڑکا تھا اور میری کونسی امانت اس ے پاس تھی۔ میں نے لفافہ کھولا تو اس میں سو سو روپے کے دو نوٹ تہہ کئے ہوئے پڑے ے۔ اچانک مجھے کامنی نرتکی کا خیال آ گیا۔ اس نے کہا تھا کہ پیسوں کی فکر نہ کرو، اس کا ی انتظام ہو جائے گا۔ مَیں نے گیٹ کی طرف نگاہ ڈالی۔ لیکن اب وہ لڑکا مجھے کہیں دکھائی رہا۔

مجھے ایک سکون سا محسوس ہوا کہ بغیر ٹکٹ سفر کرنے سے بچ گیا۔ ویسے بھی آگے ولیس کا معاملہ تھا اور پھر مجھے بمبئی سے واپس اپنے شہر لاہور بھی جانا تھا۔ اس سفر کے لئے کی پیسوں کی ضرورت تھی۔ میں نے لفافے میں سے سو روپے کا نوٹ نکالا اور جہاں لوگ

ٹکٹ لے رہے تھے اس کھڑکی کے پاس جا کر قطار میں کھڑا ہو گیا۔ میں نے بمبئی کا ای
تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لے لیا اور باقی پیسے لفافے میں ڈال کر سنبھال کر رکھ لئے۔ میں پلی
فارم پر آ گیا۔ چائے کے سٹال پر ناشتہ کیا۔ کچھ دیر بعد پنجاب میل شور مچاتی پلیٹ فارم
داخل ہو گئی۔ میں تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں سوار ہو گیا۔ ٹرین تھوڑی دیر رکنے
بعد چل پڑی۔ شام کا اندھیرا چھانے لگا تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا کہ بمبئی شہر
مضافات یعنی اس کے آس پاس کی آبادیاں شروع ہو گئیں۔

میں جن دنوں دسویں جماعت میں پڑھتا تھا تو اپنے ایک رشتے دار کے ساتھ لاہور
بمبئی آیا تھا۔ مجھے یاد تھا کہ بمبئی کے دو ریلوے سٹیشن تھے۔ ایک کا نام بوری بندر تھا
دوسرے کا نام بمبئے سینٹرل تھا۔ اس کے علاوہ بھنڈی بازار کا نام یاد تھا' جہاں ہم ا
مکان میں دس پندرہ دن تک رہے تھے اور بمبئی کی چوپاٹی کی بھی سیر کی تھی جو بمب
ساحل سمندر تھا۔ اس کے سوا مجھے اور کچھ یاد نہیں تھا۔ ہماری گاڑی بمبئی کے سٹ
بمبئے سینٹرل پر جا کر رکی۔ کامنی نے مجھے مزار کا پورا ایڈریس سمجھا دیا تھا اور یہ بھی
تھا کہ مجھے ٹیکسی والے کو کہاں جانے کے لئے کہنا ہے۔ بمبئی میں اس زمانے میں ابھی
رکشا چلنے شروع نہیں ہوئے تھے۔ ٹیکسی اور وکٹوریہ یعنی فٹن چلتی تھی یا پھر بسیں
لوکل ٹرینیں چلتی تھیں۔ کامنی کا دیا ہوا پھولوں کا گلدستہ میرے پاس ہی تھا۔ میں نے
کہ پہلے کہیں ٹھہرنے کا انتظام کیا جائے۔ اس کے بعد مزار پر جاؤں گا۔ سٹیشن سے
کر میں نے ایک ٹیکسی ڈرائیور سے کہا:

"بھائی! مجھے کسی درمیانے درجے کے ہوٹل میں لے چلو' جہاں میں دو تین ر
ٹھہر سکوں۔ میں زیادہ پیسے خرچ نہیں کر سکتا۔"

ٹیکسی ڈرائیور مجھے ٹیکسی میں بٹھا کر شہر کے گنجان علاقے میں واقع ایک ہوٹل
لے آیا' جس کا نام ممتاز ہوٹل تھا۔ یہاں میں نے پندرہ روپے یومیہ پر ایک کمرہ لے
میرے پاس سامان وغیرہ کچھ بھی نہیں تھا۔ میرے کپڑے بھی بوسیدہ ہو چکے تھے۔ گ

ہوٹل کے کمرے میں رکھ کر میں پوچھتا پوچھتا ایک بازار میں پہنچ گیا' جہاں سلے سلائے
ریڈی میڈ کپڑوں کی دکانیں تھیں۔ میں نے ایک کرتہ پاجامہ اور ایک پتلون قمیض اور
ایک جوتا بھی خرید لیا۔ کچھ دوسری چیزیں مثلاً کنگھی اور رومال وغیرہ خریدا اور ہوٹل میں
واپس آ کر نہایا۔ شیو کی اور پتلون قمیض پہن کر ہوٹل کے نیچے ہال میں آ کر کھانا کھایا'
چائے پی اور ہوٹل کے مالک سے مزار کا ایڈریس بتا کر پوچھا کہ یہ جگہ کس علاقے میں
ہے۔ اس نے کہا:

"بابا جی کے مزار پر آپ کو کوئی بھی ٹیکسی والا پہنچا دے گا۔ یہ بمبئی میں مشہور جگہ
ہے۔ بے شک رات کو چلے جائیں، وہاں تو دن رات میلہ لگا رہتا ہے۔"

میں نے سوچا کہ کامنی کی امانت ابھی مزار شریف پر جا کر پیش کر دینی چاہیے۔ مجھے
نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ میں نے ٹیکسی پکڑی اور اسے مزار پر چلنے کے لئے کہا۔ گلدستہ
میں نے اخبار میں لپیٹ کر اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔

یہ مزار شہر کے جنوب میں کافی دوری پر تھا۔ مزار پر بڑی رونق تھی۔ لوگ دعا مانگنے
چلے آ رہے تھے۔ اگربتیوں کی مہک سے فضا لبریز تھی۔ مزار پر خوب روشنیاں جگمگا رہی
تھیں۔ ایک طرف لنگر کھلا ہوا تھا۔ دوسری طرف قوالی ہو رہی تھی اور ایک درویش
دھمال ڈال رہا تھا۔ میں نے سب سے پہلے مزار شریف پر حاضری دی۔ دعائے فاتحہ پڑھی
اور کامنی کا گلدستہ ایک طرف بڑے ادب سے رکھ دیا۔ کچھ دیر سر جھکائے بیٹھا فاتحہ پڑھتا
رہا۔ پھر اٹھا اور الٹے قدموں مزار شریف کے احاطے سے نکل کر اس طرف آ گیا جہاں
لنگر تقسیم ہو رہا تھا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا مزار کے عقب میں آ گیا۔ یہاں چھوٹی چھوٹی
کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ میں ایک کوٹھڑی کے قریب سے گزرا تو ایک درویش صورت
بزرگ نے میری طرف گھور کر دیکھا۔ میں نے انہیں سلام کیا۔ سلام کا جواب دینے کے
بعد اس درویش نے کہا:

"میرے پاس بیٹھو! تمہیں زعفرانی چائے پلاؤں گا۔ کیوں میاں کیا خیال ہے؟"

میں نے کہا۔ "یہ میری خوش قسمتی ہے جناب کہ آپ مجھے چائے کی دعوت د
رہے ہیں۔

درویش کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ کتابی چہرے پر بڑی بشاشت تھی۔ آنکھوں میں
پُرکشش چمک تھی۔ لمبے بال تھے۔ سر پر سبز صافہ باندھا ہوا تھا۔ سیاہ چولا پہن رکھا
لوہے کی کرسی پر بیٹھے تھے' اٹھ کھڑے ہوئے۔ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنی کوٹھڑی میں
گئے۔ بڑی صاف ستھری کوٹھڑی تھی۔ بجلی کا بلب روشن تھا۔ زمین پر ایک طرف
بچھی تھی۔ گاؤ تکیے لگے تھے۔ وہ گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھ گئے۔ میں بھی جوتا اتار کر
ادب سے ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ مجھے نہیں معلوم انہوں نے کب کس کو چائے لا
لئے کہا۔ تھوڑی دیر میں ایک لڑکا ٹرے میں چائے کی چینک اور دو پیالیاں رکھے آ
اس نے سلام کیا اور ٹرے میرے سامنے رکھ کر چلا گیا۔ درویش نے خود پیالیوں میں
ڈالی۔ زعفران کی خوشبو اڑنے لگی۔ کہنے لگے۔

"لو چائے پیو۔"

میں نے چائے کا گھونٹ بھرا۔ بڑی لذیذ اور خوشبودار چائے تھی۔ اگر میں یہ ک
مبالغہ نہ ہوگا کہ میں نے اتنی لذیذ چائے پہلے کبھی نہیں پی تھی۔ درویش نے مجھ سے
شروع کر دیں۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں بمبئی کیسے آیا ہوں۔ میں نے انہیں
میں لاہور کا رہنے والا ہوں اور سیر کی غرض سے بمبئی آیا ہوں۔ درویش نے کہا:

"آج کل پنجاب میں تو فضا بڑی خراب ہو رہی ہے۔ جالندھر میں ایک جگہ ہند
فساد بھی ہوا ہے۔ تمہیں ان حالات میں لاہور سے نہیں نکلنا چاہیے تھا۔"

یہ ۱۹۴۷ء کے شروع کا زمانہ تھا۔ مسلم لیگ نے قیامِ پاکستان کا مطالبہ کر دیا
ہندوستان کے ہر شہر میں خاص طور پر پنجاب اور یو۔پی میں تحریکِ پاکستان اپنے
تھی۔ جب میں لاہور سے چلا تھا تو فضا کچھ کشیدہ ضرور تھی مگر درویش کی زبانی م
کہ اب حالات زیادہ خراب ہو گئے ہیں اور ہندو سکھوں نے تحریکِ پاکستان کے

جلسے جلوس نکالنے شروع کر دیئے ہیں۔ مجھے سیاست سے کبھی اتنی زیادہ دلچسپی نہیں رہی
تھی لیکن مسلمانوں کے ایک الگ ملک پاکستان کے قیام کا میں حامی تھا' جہاں مسلمان اپنے
دین اسلام کے احکام کے مطابق آزادی اور خودمختاری سے زندگی بسر کر سکیں۔ قائداعظم
کو میں مسلمانوں کا بے لوث اور عظیم رہنما سمجھتا تھا۔

میں نے درویش سے کہا:

"کانگریس کو مسلم لیگ کا مطالبۂ پاکستان تسلیم کر لینا چاہیے۔ یہ ہندوستان کے مسلمان
اکثریت کے علاقوں کا حق ہے۔"

درویش مسکرا رہے تھے۔ کہنے لگے: "پاکستان ضرور بنے گا مگر مسلمانوں کو بڑی
قربانیاں دینی پڑیں گی۔ پاکستان کو بننے سے کوئی نہیں روک سکتا۔"

میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ مجھے اس سے پہلے کہ پنجاب کی فضا اور خراب ہو
واپس لاہور چلے جانا چاہیے۔"

درویش نے کہا۔ "میں بھی تمہیں یہی مشورہ دوں گا لیکن لگتا ہے کہ تم جب بھی
پنجاب جاؤ گے راستے میں پھنس جاؤ گے۔"

"میں آپ کا مطلب سمجھا نہیں۔" میں نے ادب سے کہا:

درویش نے کہا:

"بعض باتیں آدمی کی سمجھ میں نہیں آتیں مگر وہ ہو کر رہتی ہیں۔ بہرحال ابھی تو تم
بمبئی میں ہو۔ اس کی سیر کرو، چلے جانا۔"

کچھ دیر اس درویش کے پاس بیٹھنے کے بعد میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور سلام کر کے
اجازت چاہی تو درویش میرے ساتھ کوٹھڑی سے باہر آ گیا۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر
کہنے لگا:

"کبھی کبھی خدا کو بھی یاد کر لیا کرو۔ خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لیا کرو۔ انسان
غلطی کا پتلا ہے۔ اس سے انجانے میں یا جان بوجھ کر غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ اگر گناہوں سے

سچے دل سے توبہ کر کے خدا سے معافی کا طلب گار ہو تو خدا معاف کر دیتا ہے۔"

میں نے ادب سے سر جھکاتے ہوئے کہا: "آپ نے بالکل بجا ارشاد فرمایا۔ میں تو ہمیشہ اللہ پاک سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہتا ہوں۔"

درویش نے میرے شانے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:

"اللہ معاف کرنے والا ہے ——— اب جاؤ۔"

درویش کی باتیں بڑی رمز و اشاروں میں تھیں۔ پھر میں نے سوچا کہ درویش اور بزرگ لوگ اسی طرح باتیں کیا کرتے ہیں۔ یہ کوئی اللہ کا نیک بندہ تھا جس نے مجھے نیکی کی باتیں ہی بتائیں ہیں۔ مزار شریف کے باہر آ کر میں نے ٹیکسی لی اور ہوٹل میں واپس آ گیا۔ میں نے پنجاب کے جو حالات سنے تھے میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے بمبئی میں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا چاہیے۔ میری طبیعت لاہور جانے کے لئے ایک دم بے چین ہو گئی۔

وہ رات تو میں نے ہوٹل میں گزار دی۔ دوسرے دن ہوٹل ہی سے معلوم کیا کہ پنجاب میل بمبئی سے کس وقت روانہ ہوتی ہے۔ پتہ چلا کہ رات کے وقت جاتی ہے۔ دن میں نے بمبئی کے بازاروں میں گھوم پھر گزارا اور رات کو کھانا کھا کر ہوٹل سے سٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ پنجاب میل بمبئی کے سٹیشن پر ہی تیار ہوتی تھی۔ ایک پلیٹ فارم پر تیار کھڑی تھی۔ مَیں نے لاہور کا ٹکٹ خریدا اور ٹرین میں بیٹھ گیا۔ ٹرین کا سفر شروع ہو گیا۔ راستے میں کھنڈوہ پر گاڑی رکی تو مجھے وہ تمام دہشت ناک واقعات یاد آ گئے جو میرے ساتھ گزرے تھے۔ میرے شب و روز اور حالات اتنے نارمل ہو گئے تھے کہ لگتا تھا کہ یہ واقعات جیسے خواب میں میرے ساتھ گزرے ہوں اور میں نے یہ کوئی دہشت ناک خواب دیکھا ہو۔ آہستہ آہستہ یہ تمام واقعات میرے ذہن سے محو ہونا شروع ہو گئے تھے۔ میری انگلی میں کامنی نرتکی کی انگوٹھی موجود تھی۔ لگتا تھا کہ یہ کسی عورت کی محبت کی نشانی ہے اور مجھے اس کی ابھی ضرورت نہیں پڑے گی۔ مجھے کامنی کا بتایا ہوا وہ منتر بھی یاد تھا جس کو تین بار پڑھ کر اس نے کہا تھا کہ میں زمین سے بلند ہو کر ہوا میں اڑنے لگوں

گا۔ یہ سب کچھ ایک ڈراؤنے ماضی کی یادگار معلوم ہو رہا تھا۔

گاڑی بھوپال، جھانسی اور گوالیار سے بھی آگے نکل گئی۔ میں دلی پہنچ گیا۔ یہاں ٹرین ائی دیر تک رکی رہی۔ سٹیشن پر کچھ مسلمان آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کی باتوں ے معلوم ہوا کہ دلی میں بھی فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو چکے ہیں اور سبزی منڈی کے لمانوں کی کچھ دکانیں ہندوؤں نے جلا دی ہیں۔ ٹرین دلی سے پنجاب کی طرف روانہ ہو ئی میرٹھ کے سٹیشن پر میں نے بہت سی مسلمان برقعہ پوش خواتین کو پلیٹ فارم پر بیٹھے ئے دیکھا۔ ایک آدمی نے جو مسلمان تھا بتایا کہ میرٹھ سے مسلمان نکل کر دلی، بمبئی کی رف جا رہے ہیں۔ انبالے سے آگے جب پنجاب شروع ہوا تو ٹرین کی دونوں جانب یتوں میں ویرانی سی چھائی ہوئی دکھائی دی۔ کوئی کسان کسی کھیت میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ ر ایک گاؤں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ لدھیانہ سٹیشن پر آ کر گاڑی ایسی رکی کہ آگے چلنے نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ مسافر ڈبوں سے باہر نکل آئے۔ گارڈ پریشانی کے عالم میں ن ڈرائیور سے کوئی بات کر کے واپس آ رہا تھا۔ مسافروں نے اسے گھیر لیا۔ اس نے بتایا ، آگے جالندھر میں گاڑیوں پر ہندو سکھ حملے کر رہے ہیں۔ ٹرین آگے نہیں جائے گی۔ ں سے واپس دلی چلی جائے گی۔ مسافروں میں پریشانی پھیل گئی لیکن جان سب کو عزیز تی ہے۔ سب ٹرین میں واپس جانے پر تیار ہو گئے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ خواہ کچھ ہو ئے میں واپس نہیں جاؤں گا۔ میں ٹرین سے نکل کر پلیٹ فارم کے بنچ پر بیٹھ گیا۔ میرے تے دیکھتے پنجاب میل لدھیانے کے سٹیشن سے دلی کی طرف واپس روانہ ہو گئی۔ جن افروں نے لدھیانے جانا تھا وہ ضرور اتر گئے تھے۔

میرے پاس لاہور کا ٹکٹ تھا۔ جب گاڑی دلی کی طرف واپس چلی گئی تو میں سوچنے لگا ہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں کسی نہ کسی طرح لاہور پہنچنا چاہتا تھا۔ ابھی مشرقی پنجاب سے لمانوں کی ہجرت شروع نہیں ہوئی تھی۔ مسلمان پنجاب کے شہروں اور دیہات میں رہ ہے تھے۔ لدھیانے میں بھی مسلمانوں کی کافی آبادی تھی۔ میں نے سوچا کہ شہر میں چلتا

ہوں۔ ہو سکتا ہے وہاں سے جالندھر، امرتسر جانے والی کوئی لاری وغیرہ مل جائے۔ سٹیشن
پر ویرانی سی چھائی تھی۔ سٹیشن کے سامنے بازار میں کچھ دکانیں کھلی تھیں مگر لوگوں
آمد و رفت زیادہ نہ تھی۔ فضا میں کشیدگی اور تناؤ کا احساس ہو رہا تھا۔ چائے کے ایک
ہوٹل میں دو تین آدمی بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ میں بھی ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ میں
نے ان سے پوچھا کہ یہاں سے جالندھر امرتسر کی طرف جانے والی کوئی لاری وغیرہ
جائے گی۔ ان میں سے ایک نے مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں سے آ رہا ہوں۔ میں
انہیں بتایا کہ پنجاب میل میں لاہور جا رہا تھا۔ ٹرین یہاں سے واپس چلی گئی ہے۔
لاہور جانا ہے۔ میں یہاں اتر گیا ہوں۔ وہ آدمی بولا:

"بہتر تھا کہ تم بھی واپس دلی چلے جاتے۔ یہاں سے تمہیں جالندھر جانے والی لاری
مل جائے گی مگر آگے خطرہ ہے۔ تم مسلمان ہو کیا؟"

میں نے کہا۔ "جی ہاں۔"

دوسرے آدمی نے کہا:

"پھر ہم تمہیں آگے جانے کا مشورہ نہیں دیں گے۔ جالندھر میں بہت زیادہ گڑبڑ
ہو سکتا ہے یہاں بھی کرفیو لگ جائے۔ تم سٹیشن پر چلے جاؤ۔"

یہ کہہ کر وہ لوگ ہوٹل سے اٹھ کر چلے گئے۔ اتنے میں دور سے ایک دھما
آواز آئی اور درختوں پر سے پرندے شور مچاتے اڑ گئے۔ ہوٹل کے مالک نے ملاز
کہا:

"دکان بند کر دو۔"

ملازم باہر سے کرسیاں اٹھا کر اندر رکھنے لگا۔ کچھ لوگ دوڑتے ہوئے بازار م
گزر گئے۔ ان کے پیچھے سکھوں کا ایک جلوس نعرے لگاتا آ گیا۔ ہوٹل والے نے
سے دکان کا دروازہ بند کر دیا۔ میں دکان کے اندر ہی بیٹھا رہا۔ جلوس گزر گیا تو ہوٹل
مالک نے مجھ سے کہا:

"بھائی جدھر جانا ہے چلے جاؤ۔ ہم لوگ ہوٹل بند کر کے جا رہے ہیں۔"

دیکھتے دیکھتے بازار کی جو چند ایک دکانیں کھلی تھیں بند ہو گئیں اور بازار سنسان ہو گیا۔
میں جلدی جلدی بازار میں سے گزر کر ریلوے سٹیشن کے مسافر خانے میں آ کر بیٹھ گیا۔
وہاں پولیس کے سپاہی پھر رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ سٹیشن کے آس پاس کے علاقے میں
کرفیو لگ گیا ہے۔ شہر کی طرف سے فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔

میں مسافر خانے سے اُٹھ کر پلیٹ فارم پر آ گیا۔ پلیٹ فارم خالی پڑا تھا۔ کچھ سکھ
کرپانیں لئے پھر رہے تھے۔ میں عجیب مشکل حالات میں پھنس گیا تھا۔ اب نہ واپس جا
سکتا تھا نہ آگے جانے کا کوئی ذریعہ نظر آ رہا تھا۔ سٹیشن پر ہی اِدھر اُدھر پھرتا رہا، دوپہر ہو
گئی۔ میں نے ایک مسافر خانے میں ہی تھوڑا بہت کھانا وغیرہ کھایا۔ مسافر خانے میں کچھ
لوگ آپس میں اس طرح کی باتیں کر رہے تھے کہ اگر ہم سٹیشن کی پچھلی طرف سے ہو کر
جائیں تو لاری اڈے پر پہنچ سکتے ہیں۔ کیونکہ سٹیشن کے پچھلے علاقے میں کرفیو نہیں لگا۔
میں بڑے غور سے ان کی باتیں سننے لگا۔ اُن کی باتوں سے معلوم ہوا کہ وہ لوگ بھی
جالندھر جانا چاہتے ہیں۔ وہ مسلمان تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں بھی مسلمان ہوں اور
لاہور جانا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ جالندھر تک ہمارے ساتھ چلے چلو۔ جالندھر سے
آگے امرتسر والی بس مل جائے گی۔ وہاں سے نکل جانے کے خیال سے میں ان کے ساتھ
ہو گیا۔ وہ تین آدمی تھے۔ لدھیانے شہر سے اچھی طرح واقف تھے۔ ہم سٹیشن کے آخری
پلیٹ فارم کی ریلوے لائنیں عبور کر کے سٹیشن کی حدود سے باہر نکل گئے۔ اس طرف
کھیت تھے۔ کچھ مکان بھی تھے۔ کوئی انسان نظر نہیں آتا تھا۔ ان لوگوں کا خیال غلط نکلا۔
اس علاقے میں بھی کرفیو لگا ہوا تھا۔ اب وہ کچھ گھبرا گئے۔ ان میں سے ایک نے کہا:

"چوڑے بازار کی طرف نکل جاتے ہیں۔ اُدھر مسلمانوں کی آبادی ہے۔"

میں ان کے پیچھے پیچھے تھا، وہ ایک کھیت میں سے گزر گئے۔ آگے ایک چھوٹی سڑک
تھی۔ سڑک سے ذرا ہٹ کر چھ سات مکان تھے۔ اچانک ان مکانوں کی طرف سے شور

اٹھا اور پھر دس بارہ سکھ تلواریں لئے نمودار ہوئے۔ ہم میں سے ایک نے کہا:

"سٹیشن کی طرف بھاگو۔"

مَیں بھی ان کے ساتھ سٹیشن کی طرف دوڑ پڑا۔ مگر بدقسمتی سے ایک جگہ میرا پاؤں پھسلا اور میں گر پڑا۔ سکھ میرے سر پر پہنچ گئے۔ ایک سکھ نے مجھ پر تلوار کا وار کیا۔ مَیں جلدی سے دوسری طرف ہو گیا۔ دوسرے سکھ نے کہا:

"اوئے اس کو یہاں نہ مارو۔ کھیتوں میں لے جا کر ختم کر دو۔"

معلوم نہیں وہ مجھے کھیتوں میں لے جا کر کیوں قتل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن یہ میرے حق میں بہت اچھا ہوا۔ دو سکھوں نے مجھے پکڑ لیا۔ معلوم نہیں انہیں کس نے اطلاع دے دی تھی کہ سٹیشن سے کچھ مسلمان اس طرف آ رہے ہیں۔ سکھ مجھے پکڑ کر کھینچتے ہوئے کھیتوں کی طرف لے جانے لگے۔ اب میرے سامنے زندہ رہنے کی ایک ہی صورت تھی' ایک ہی وسیلہ تھا۔ چنانچہ میں نے کامنی نرتکی کا بتایا ہوا منتر دل میں تین بار پڑھ کر پھونکا۔ مجھے پورا یقین نہیں تھا کہ منتر چل جائے گا مگر منتر چل گیا۔ یہ طلسم تھا' جادو تھا اور جادو کے بارے میں کہا گیا ہے کہ جادو برحق ہوتا ہے مگر اس کا کرنے والا کافر ہوتا ہے۔ مَیں نے جان بچانے کے لئے منتر پھونکا تھا۔ میں نے دل میں اللہ سے معافی مانگ لی تھی۔

منتر پھونکتے ہی میرے پاؤں زمین سے بلند ہونے لگے۔ میں نے دل میں کہا۔ "اوپر اٹھو۔" یہ میں نے ارادہ کیا تھا اور اس کے ساتھ ہی میں ایک جھٹکے کے ساتھ زمین سے ایک دم پندرہ بیس فٹ بلند ہو گیا۔ جن دو سکھوں نے مجھے پکڑ رکھا تھا' ان کے ہاتھ چھوٹ گئے تھے اور وہ نیچے کھڑے خوف زدہ چہروں سے مجھے ہوا میں بلند ہوتا دیکھ رہے تھے۔ پھر وہ ڈر کر ایسے بھاگے کہ ان میں سے کسی نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ مَیں زیادہ بلندی پر چلا گیا۔ مَیں چاہتا تھا کہ اتنی بلندی پر چلا جاؤں کہ لوگ مجھے آسانی سے دیکھ سکیں۔ میں لوگوں کو کوئی تماشا نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ میں نے جان بچانے کے لئے کیا تھا اور میری جان بچ گئی تھی۔ اب میں وہاں سے سیدھا لاہور کی طرف نکل جانا چاہتا

تھا۔ لاہور جانے کا ایک ہی آسان راستہ تھا کہ میں لدھیانے سے جالندھر جانے والی ریلوے لائن کے اوپر پرواز کروں۔ میں نے نصف دائرے میں فضا میں ایک چکر لگایا اور ذرا نیچے آ کر دیکھا۔ ریل کی پٹڑیوں کا ایک ڈبل ٹریک لدھیانے سٹیشن سے نکل کر مغرب کی سمت جا رہا تھا۔ یہی جالندھر امرتسر والی ریلوے لائن ہو سکتی تھی۔ میں دوبارہ بلند ہو گیا۔ ریلوے ٹریک کو نگاہ میں رکھا اور اس کے اوپر پرواز شروع کر دی۔

ریلوے لائن کی دونوں جانب کھیت ویران پڑے تھے۔ کہیں کہیں کوئی کسان نظر آ جاتا تھا۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ مجھے نیچے سے کوئی دیکھ رہا ہے یا نہیں۔ میں نے اپنی پرواز کی رفتار تیز کر دی تھی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ اگرچہ میں کافی اونچائی پر تھا' پھر بھی مجھے نیچے چمکتی ہوئی ریلوے لائن صاف دکھائی دے رہی تھی۔ یہ مجھے اندازہ بالکل نہیں تھا کہ میری رفتار فی گھنٹہ کتنے کلومیٹر تھی۔ اتنا ضرور محسوس ہو رہا تھا کہ میں کافی تیز جا رہا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فاصلہ جلدی طے ہو گیا اور میں ایک چھوٹے شہر کے اوپر سے گزر گیا۔ پھر ایک بڑا شہر آ گیا۔ مکانات دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ ریلوے پل بھی نظر آ رہے تھے۔ مجھے جالندھر شہر لگتا تھا۔ میں اس شہر کے اوپر سے بھی گزر گیا۔ ہو سکتا ہے نیچے سے لوگوں کو میں نظر آ رہا ہوں گا اور ایک آدمی کو ہوا میں اڑتا دیکھ کر کسی کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا ہو گا مگر مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

میں اسی طرح پرواز کرتے ہوئے ایک دریا کے اوپر سے گزر گیا۔ یہ دریائے بیاس ہی ہو سکتا تھا۔ اسی طرح امرتسر شہر بھی آ گیا۔ یہاں شہر میں کہیں کہیں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ ریل کی پٹڑی میری راہ نمائی کر رہی تھی جو دھوپ میں چمکتی دور نیچے مجھے نظر آ رہی تھی۔ میں امرتسر شہر سے بھی گزر گیا۔ اس کے بعد میرا شہر لاہور تھا۔ میرا خیال ہے کہ مجھے پندرہ بیس منٹ ہی لگے ہوں گے کہ مجھے نیچے ورکشاپ کے شیڈ اور وہ دیوار نظر آنے لگی جہاں سے ریل کی پٹڑی خم کھاتی ہوئی لاہور سٹیشن کی طرف جاتی ہے۔ جب مجھے لاہور کا ریلوے سٹیشن بھی نظر آ گیا تو میں فضا میں اور بلند ہوتے ہوئے بائیں جانب

مڑ گیا۔ میں دریائے راوی کے پار کی ایسی جگہ اترنا چاہتا تھا جہاں مجھے کوئی نہ دیکھ سکے۔ مجھے مقبرہ جہانگیر اور بادشاہی مسجد کے مینار نظر آئے۔ میں مقبرہ جہانگیر کی طرف غوطہ لگا گیا۔ میں آہستہ آہستہ بلندی کم کر رہا تھا اور ساتھ بڑے غور سے چاروں طرف دیکھ بھی رہا تھا کہ کسی ویران جگہ پر اتروں۔ ایک جگہ مقبرے کے عقب میں درختوں کے جھنڈ تھے میں تیزی سے نیچے ہوتا گیا۔ مجھے نیچے اترنے کا تجربہ نہیں تھا۔ میرے پاس کوئی بریک بھی نہیں تھی۔ صرف میرا ارادہ کام کر رہا تھا۔ میرا ارادہ ہی بریک لگاتا تھا اور میری رفتار کو کنٹرول کرتا تھا۔ درختوں کے جھنڈ میری طرف اوپر کی جانب بڑھ رہے تھے۔ میں ان کے پہلو کی جانب ہوتا ہوا نیچے آگیا۔ میرا خیال تھا کہ میں زمین پر اتروں گا مگر میں ایک درخت کی شاخوں میں الجھ گیا۔ ایک دو سیکنڈ تک میں درخت کی شاخوں میں ہی بیٹھا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ درخت سے اتر کر زمین پر آگیا۔

اس طریقے سے میں کبھی لاہور نہیں پہنچا تھا۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ آس پاس کوئی انسان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ یقینا فرقہ وارانہ فسادات لاہور میں بھی شروع ہو چکے تھے۔ خیال آیا کہ کہیں یہاں بھی کر نہ لگا ہو۔ میں مقبرہ جہانگیر کے احاطے کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا نور جہاں کے مقبرے کے قریب سے ہو کر دریائے راوی کے پل پر گیا۔ یہاں لوگ چل پھر رہے تھے تانگے بھی آ جا رہے تھے۔ اس زمانے میں نہ تو ابھی او منی بس سروس شروع ہوئی تھی ا نہ رکشا وغیرہ چلتے تھے۔ پیسے میری جیب میں تھے۔ میں نے ایک خالی تانگہ پکڑا اور اکبر منڈی پہنچ گیا۔ میں سیدھا اپنی دکان پر گیا۔ میرا دوست اور شریک کاروبار خالد مجھے دیکھ حیران رہ گیا۔ اسے جیسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اس کے سامنے کھڑا ہوں۔ بے اخ ہو کر میرے گلے سے لگ گیا۔ تم کہاں چلے گئے تھے؟ کوئی خط لکھ کر اپنی خبر نہ دی۔ ک رہے، کیا کرتے رہے؟ وغیرہ۔ اس نے کئی سوال پوچھ ڈالے۔ میں نے کہا:

"تمہیں ساری کہانی سنا دوں گا مگر پہلے چائے منگواؤ' خلیفے کی دکان سے۔"

اکبری منڈی میں اس زمانے میں خلیفے کی دکان کی چائے بڑی مشہور تھی۔ دکان کے ربھی مجھے بڑی محبت سے ملے۔ میں نے کاروبار کا پوچھا کہ کیسا چل رہا ہے۔ خالد نے ا "اللہ کا شکر ہے۔ مگر دوسرے شہروں میں فسادات وغیرہ کی خبریں آ رہی ہیں' جس کی ے مال باہر سے آنا اور باہر جانا بہت کم ہو گیا ہے۔" چائے آ گئی۔ میں اور خالد دکان ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ میں خالد کو اپنے ساتھ پیش آنے والے مافوق الفطرت اور شت ناک واقعات بالکل نہیں سنانا چاہتا تھا۔ میں نے اسے ایک فرضی کہانی گھڑ کر سنا دی بس ایک عورت کے چکر میں پھنس گیا تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ دوبئی لے گئی۔ وہاں ہم بمبئی آ گئے۔ بڑی مشکل سے اس سے پیچھا چھڑا کر آ گیا۔ اب یہیں رہوں گا اور پنے کاروبار کی طرف توجہ دوں گا۔ میں نے عاصمہ بہن کی خیریت پوچھی۔ خالد نے بتایا کہ ہ اپنے خاوند کے ساتھ امریکہ چلی گئی ہے۔

خالد نے کہا:

"عاصمہ بہن تمہارے لاپتہ ہونے سے بے حد پریشان تھی۔ امریکہ جانے سے پہلے یں یاد کر کے رونے لگی۔ میں نے اسے تسلی دی کہ سلیم بڑا غیر ذمے دار ہے۔ سیلانی ی ہے کہیں آوارہ گردیاں کر رہا ہوگا، جلدی واپس آ جائے گا۔ اب عاصمہ امریکہ کے رواشنگٹن میں اپنے خاوند کے ساتھ رہ رہی ہے۔ اس کے خاوند کا وہاں اپنا پٹرول پمپ ہے۔ میرے پاس ان کا ایڈریس بھی ہے اور ٹیلی فون کا نمبر بھی ہے۔ تم پہلی فرصت میں ہ بہن کو فون کر کے اپنی خیریت کی اطلاع دو۔ وہ تمہارے لئے بے حد پریشان تھی۔"

"وہ پھر بیمار تو نہیں ہوئی؟" میں نے کسی قدر تشویش کے انداز میں پوچھا۔

خالد نے کہا: "عاصمہ بہن کو اللہ تعالیٰ نے مکمل شفا دے دی ہے۔ اس منحوس بیماری ے اسے نجات مل چکی ہے۔ مگر ابھی تک ان کے ہاں اولاد نہیں ہوئی۔ دعا کرو کہ اللہ کی اولاد کی نعمت سے بھی سرفراز فرمائے۔"

میں نے کہا۔ "اللہ تعالیٰ انہیں اس نعمت سے بھی ضرور سرفراز کرے گا۔"

خالد میرے اکبری منڈی والے مکان میں بھی کچھ دن رہ لیتا تھا۔ کچھ دن اپنے مصری
شاہ والے مکان میں گزارتا تھا۔ دکان بند کر کے ہم اکبری منڈی والے مکان میں آ گئے
یہاں سے رات کے دس بجے میں نے عاصمہ بہن کو امریکہ فون کیا۔ اس وقت واشنگٹن میں
دن کا ایک بج چکا تھا۔ عاصمہ بہن اپنے اپارٹمنٹ میں ہی مل گئی۔ میری آواز سنی تو خوشی
سے نہال ہو گئی۔ بار بار خدا کا شکر ادا کرتی کہ میرا بھائی لاہور واپس آ گیا ہے۔ مجھے دعائیں
دیتی۔ کہنے لگی:

"بس اب جیسے بھی ہو میرے پاس امریکہ میں آ کر مجھے اپنی شکل دکھا جاؤ تاکہ میرے
دل کو سکون ہو کہ تم گھر واپس آ گئے ہو۔"

میں نے عاصمہ بہن سے وعدہ کر لیا کہ میں انشاء اللہ بہت جلد اس سے ملنے آؤں گا
رات کا کھانا میں نے اور خالد نے اکبری منڈی کے ایک ہوٹل میں کھایا۔ کھانے کے بعد
ہم کچھ دیر چائے پیتے اور باتیں کرتے رہے۔ خالد نے میرے ہاتھ میں چاندی کی انگوٹھی
دیکھی تو مسکرا کر بولا:

"یہ انگوٹھی کس کی یاد میں پہن رکھی ہے؟"

میں نے انگوٹھی پر ایک نگاہ ڈالی اور خالد سے کہا:

"یہ انگوٹھی؟ یہ تو کلکتے کے بہو بازار سے میں نے خریدی تھی۔ یونہی مجھے اچھی لگی۔
میں نے خرید کر پہن لی۔"

میں اگر اسے بتاتا کہ یہ انگوٹھی ایک ایسی جادوگر حسینہ کی ہے کہ اگر میں اسے اپنے
جسم سے تین بار رگڑوں تو وہ ابھی ہمارے سامنے حاضر ہو جائے گی تو اسے کبھی یقین نہیں
آ سکتا تھا۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ اس کے رگڑنے سے کامنی نرتکی ضرور حاضر ہو جائے
گی۔ اس کے منتر کو پڑھ کر میں لدھیانے سے لاہور تک ہوا میں پرواز کرتے آ چکا تھا۔
مجھے کامنی کے طلسم کا یقین تھا۔ خالد کہنے لگا:

"لاہور میں بھی حالات بگڑنا شروع ہو گئے ہیں۔ اکبری منڈی کے ہندو سکھوں نے

اکثر دکانیں چھوڑ چکے ہیں۔ وہ کئی روز سے دکانوں پر نہیں آ رہے۔"

میں نے کہا۔ "میں نے ہندوستان کے دوسرے شہروں، خاص طور پر جالندھر امرتسر
کے شہروں اور دیہات میں بھی یہی حالات دیکھے ہیں۔ پاکستان کے قیام کا اعلان ہو چکا ہے۔
ہندو سکھ اس کے خلاف جلوس نکال رہے ہیں اور مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگا رہے
ہیں۔"

خالد نے کہا: "انگریز تو اب چلا جائے گا تو سمجھو کہ پاکستان اسلامی ملک بن گیا ہے۔ خدا
کا شکر ہے کہ مسلمان اپنے مذہب کے مطابق آزادی سے زندگی بسر کر سکیں گے۔ ان کے
کاروبار میں بھی بڑی ترقی ہو گی۔"

میں نے کہا: "سنت نگر اور کرشن نگر کے مسلمانوں کا کیا حال احوال ہے؟"

خالد بولا: "وہاں سے تو مسلمان نقل مکانی کر کے کوئی موچی دروازے اور کوئی دلی
دروازے کی طرف آ گئے ہیں۔"

"تمہارے مصری شاہ میں تو حالات ٹھیک ہے نا؟"

خالد کہنے لگا:

"مصری شاہ، وسن پورہ اور بادامی باغ مسلمانوں کی آبادیاں ہیں۔ اس طرف سب
ٹھیک ہے۔ پھر بھی میں سوچتا ہوں کہ رات کو مصری شاہ والے گھر میں ہی چلا جاؤں، گھر
والے میرے لئے پریشان رہیں گے۔"

"تم نے ٹھیک سوچا ہے۔ اب میں آ گیا ہوں۔ میں اکبری منڈی والے گھر میں رہوں
گا۔"

رات کے دس سوا دس بجے خالد اکبری منڈی کے باہر تانگے پر بیٹھ کر مصری شاہ چلا
گیا۔ میں اپنے اکبری منڈی والے پرانے گھر میں آ گیا۔ اس گھر کے ساتھ میرے ماں باپ
اور بہن عاصمہ کی بڑی خوشگوار یادیں وابستہ تھیں۔ کچھ دیر میں کمرے میں بیٹھا ریڈیو وغیرہ
سنتا رہا۔ پھر بتی بجھا کر بستر پر لیٹ گیا۔

مارچ کا مہینہ گزر چکا تھا، اپریل کا آغاز تھا۔ موسم دن کے وقت تھوڑا گرم ہو جاتا تھا
رات کو خوشگوار سی ٹھنڈک ہوتی تھی۔ پھر بھی مَیں چھت پر چارپائی ڈال کر لیٹ گیا۔ اوپر
مَیں نے کھیس لے لیا تھا۔ بازار میں نیچے سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ریڈیو پر اعلان ہوتے مَیں نے
سنا تھا کہ گوالمنڈی اور کرشن نگر کے علاقے میں صبح نو بجے تک کا کرفیو لگا دیا گیا ہے۔ ان
حالات میں رات دس ساڑھے دس بجے ہی لاہور شہر کی رونقیں ماند پڑ چکی تھیں۔ دور
کسی طرف سے کسی کسی وقت فائرنگ کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ نیلے آسمان پر تارے
نکلے ہوئے تھے۔ مَیں کافی دیر تک اپنے ساتھ گزرے ہوئے واقعات پر غور کرتا رہا
حالات کچھ اس طرح نارمل ہو گئے تھے کہ واقعی مَیں اِن ڈراؤنے واقعات کو بھولتا جا رہا
تھا۔ صرف کامنی کا خیال ضرور آتا تھا۔ اس عورت نے میری بہت مدد کی تھی اور کئی بار
مجھے مصیبت سے نکالا تھا۔ مَیں نے اس کے لئے صرف اتنا ہی کیا تھا کہ اسے بدمعاش
سادھو سے نجات دلائی تھی، جس نے اسے ڈبیا میں قید کر کے اپنے سر کی جٹاؤں میں رکھا
ہوا تھا۔ یہ کوئی اتنا بڑا احسان نہیں تھا لیکن کامنی نے اسے فراموش نہیں کیا تھا۔ اس۔
ایک بار مجھے کہا بھی تھا کہ:

"تم نے مجھے اس چنڈال سادھو سے نجات دلا کر مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ مَیں
اسے کبھی نہیں بھلاؤں گی۔"

مَیں سوچنے لگا کہ یہ کتنا زبردست جادو ہے کہ منتر پڑھ کر میں ہوا میں اڑنے لگا تھا
سائنس کے پاس اس کا کیا جواز ہے؟ شاید اس میں کوئی سائنسی پہلو نکلتا ہو۔ ایسا سائنسی
پہلو کہ جو ابھی خود سائنس دانوں کو بھی معلوم نہ ہو۔ پھر مجھے منحوس پاتالی چڑیل کا خیال
گیا اور میرے بدن میں خوف کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ میرے خدا! کس قدر مکروہ چہرہ
اس چڑیل کا ـــــ سارے جسم پر بن مانس کی طرح بال ہی بال تھے اور ان میں
دھواں اٹھ رہا تھا ـــــ اس چڑیل نے کس طرح روپ بدل بدل کر مجھ پر حملے
تھے اور وہ رات تو میں ساری زندگی نہیں بھول سکتا تھا ـــــ مرن گھاٹ کے جنگل

زدہ عمارت کی رات ـــــ جب پاتالی چڑیل درگاوتی کے روپ میں مجھے ملی۔
دل کو لبھاتی رہی اور پھر آدھی رات کو ایک بھیانک چڑیل کے روپ میں خونخوار
اور سانپ کو لے کر میرے اوپر آ گئی اور چمگادڑ میری گردن کا خون چوسنے لگی اور
میرے جسم سے چمٹ گیا تھا۔ میں نے ان ڈراؤنے خیالات کو اپنے دماغ سے جھٹک
بلو بدل لیا اور توبہ استغفار پڑھتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھ پر غنودگی طاری
لگی۔

کے بعد مجھے نہیں معلوم کہ کب مجھے نیند آ گئی۔ یہ بھی نہیں معلوم میں کتنی دیر تک
رہا کہ اچانک ایک جھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی۔ پہلے مجھے خیال آیا کہ زلزلہ آیا
میں نے چارپائی پر لیٹے لیٹے سانس روک لیا اور محسوس کرنے کی کوشش کرنے لگا
زلزلہ ہے یا محض میرا وہم تھا۔ زلزلہ بالکل نہیں تھا۔ میں یہی سمجھا کہ خواب میں ایسا
لگا۔ میں نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ مغرب کی طرف آسمان پر زرد رنگ
چاند ابھر کر نصف آسمان پر آ گیا ہُوا تھا۔ مَیں چاند کو دیکھنے لگا۔ مجھے ایسے لگا جیسے
کرنیں میرے جسم میں داخل ہو رہی ہیں اور میرا جسم گرم ہونے لگا ہے۔ میری
نیند سے بھری ہوئی تھیں۔ مَیں نے کوئی خیال نہ کیا اور آنکھیں بند کر لیں اور
نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ معلوم نہیں پانچ منٹ گزرے ہوں گے یا دس
گزرے تھے کہ مجھے ایک بار پھر ایک جھٹکا سا لگا۔

جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

اس بار مجھے واضح طور پر محسوس ہُوا تھا کہ یہ جھٹکا چارپائی کو نہیں لگا تھا بلکہ میرے
کے اندر سے مجھے لگا تھا۔ مَیں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ میرے بیٹھے بیٹھے میرے جسم کو دو
جھٹکے ایک ساتھ لگے اور مَیں چارپائی سے اچھل کر نیچے گر پڑا۔ یا اللہ خیر! یا اللہ خیر!
ہونٹوں سے اپنے آپ یہ کلمات نکلنے لگے۔ مَیں جلدی سے اٹھا کہ نیچے چلا جاؤں
مجھے محسوس ہُوا کہ میرے پاؤں جیسے چھت نے پکڑ لئے ہیں۔ مَیں کوشش کے باوجود

ایک قدم بھی نہ اٹھا سکا۔ میرے سارے بدن پر دہشت طاری ہو گئی۔ مَیں سمجھ گیا کہ
منحوس آسیب سے مَیں سمجھ رہا تھا کہ مجھے نجات مل گئی ہے' اس نے مجھ پر حملہ
ہے۔ مَیں چھت پر اس طرح کھڑا تھا کہ میرے دونوں پاؤں چھت میں جیسے اندر دھ
گئے تھے۔ میرا چہرہ اپنے آپ چاند کی طرف اٹھنے لگا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک
تھا۔ دل کی دھڑکن کے ساتھ میرے جسم اور میرے چہرے کو بھی آہستہ آہستہ جھٹکے
رہے تھے۔ کسی مافوق الفطرت طاقت نے مجھے اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔ میرا چہرہ چا
طرف کر دیا تھا۔ مَیں نے کئی بار کوشش کی کہ اپنا چہرہ نیچے کروں مگر میں اپنا چہرہ نیچے
سکا اور چاند کی طرف مسلسل دیکھتا گیا۔ مَیں نے محسوس کیا کہ میرے چہرے پر سرکنڈ
طرح کے بال اُگنے لگے ہیں۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر آنکھوں کے
کئے۔ میرے حلق سے ایک ایسی خوف زدہ چیخ نکل گئی کہ جس کی آدھی سے زیا
میرے حلق میں ہی خشک ہو گئی تھی۔ میرے دونوں ہاتھوں کے اوپر اور بازوؤں
سرکنڈوں ایسے لمبے لمبے سیاہ بال نمودار ہو گئے تھے۔

پھر ایک چمگادڑ اور ایک سانپ چاند میں سے نکل کر شور مچاتے' پھنکاریں مار
چلاتے میری طرف بڑھے اور آندھی ایسے شور کے ساتھ میرے سر کے اوپر
گئے۔ اس کے ساتھ ہی جیسے چھت نے میرے پاؤں چھوڑ دیئے۔ مَیں چھت کے
طرف بھاگا۔ سیڑھیوں پر سے چھلانگیں لگاتا نیچے کمرے میں آیا۔ بتی روشن کی ا
پر رکھے بڑے آئینے کے سامنے آ کر اپنا چہرہ دیکھا۔ اپنا چہرہ دیکھتے ہی میرے حلق
چیخ نکل گئی اور مَیں پیچھے کی طرف لڑکھڑا گیا۔ مَیں نے بڑی مشکل سے ا
سنبھالا۔ میرا سانس تیز تیز چل رہا تھا۔ سانس کو قابو میں کرنے کی کوشش کرتے
نے ڈرتے ڈرتے آئینے کی طرف دوبارہ دیکھا۔ آئینے میں مجھے جو چہرہ نظر آیا
نہیں تھا۔ میرا ماتھا چھوٹا ہو گیا تھا۔ جبڑے چوڑے ہو گئے تھے۔ نتھنے پھیل
آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ سارے چہرے پر کانٹوں کی طرح سیاہ بال

کسی بن مانس سے زیادہ کریہہ المنظر جانور کا چہرہ تھا۔ مَیں ڈر کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔
ڈرتے ڈرتے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ میرے ہاتھوں پر بھی بال ہی بال تھے۔
وٹی چھوٹی چھریوں کی طرح نکل آئے تھے۔ مَیں نے دیکھا کہ میری انگلی میں کا منی
ں جو چاندی کی انگوٹھی پڑی ہوئی تھی وہ غائب ہو چکی تھی۔
پر وہ مصیبت نازل ہو چکی تھی جو شاید اب میری بدنصیبی کا حصہ بن گئی تھی۔ میں
اٹھا اور پاگلوں کی طرح کمرے میں پھرنے لگا۔ پھر مجھے ایسے محسوس ہُوا جیسے میں
وش و حواس میں واپس آ رہا ہوں۔ مجھ پر ایک ٹھہراؤ کی کیفیت طاری ہونے لگی۔
میری کیفیت نہیں تھی۔ یہ اس آسیب کی کیفیت تھی' جس نے مجھے اپنے جیسا کر
مجھے خون کی بُو محسوس ہونے لگی۔ پہلے اس قسم کی بُو مَیں نے کبھی محسوس نہیں کی
میری آسیبی حِس بتا رہی تھی کہ یہ انسانی خون کی بُو ہے۔ ان انسانوں کے خون کی بُو
ارد گرد کے مکانوں میں سو رہے ہیں۔ مجھے اچانک پیاس کا احساس ہُوا۔ کمرے میں
صراحی اور گلاس رکھا ہُوا تھا۔ مگر مَیں اس طرف نہ گیا۔ یہ پانی کی پیاس نہیں تھی۔
ن کی پیاس تھی۔ انسانی خون کی پیاس تھی۔ پہلے مجھے یہ احساس تھا کہ میں انسان
اور مجھ پر کسی آسیب نے قبضہ کر لیا ہے مگر اب یہ احساس بھی غائب ہو گیا تھا۔ میں
حسوس کر رہا تھا کہ مَیں کوئی جنگلی درندہ ہوں جسے اپنی پیاس بجھانے کے لئے کسی
ن کے خون کی ضرورت ہے۔

ئں دروازے کی طرف بڑھا۔ ایک کرسی میرے راستے میں آ گئی۔ مَیں نے اسے اٹھا
وار کے ساتھ دے مارا۔ کرسی چکنا چور ہو گئی۔ میرے حلق سے خرخراہٹ اور
ٹ کی غیر انسانی آوازیں نکل رہی تھیں۔ مجھے سوائے اس کے اور کچھ یاد نہیں تھا کہ
چل رہا ہوں اور مجھے ایک خاص قسم کے انسانی خون کی بُو آ رہی ہے اور میں اسی کی
ف جا رہا ہوں۔ کوئی غیر انسانی طاقت مجھے اپنے آپ لئے جا رہی تھی۔ میں مکان کے
اترنے کی بجائے سیڑھیاں چڑھ کر مکان کی چھت پر آ گئی۔ اوپر پورا چاند چمک رہا تھا۔

مَیں نے چاند کی طرف منہ کر کے اپنے دونوں بازو پھیلا دیئے۔ میرے منہ سے
ڈراؤنی چیخ بلند ہوئی۔ لیکن یہ چیخ بھی آدھی سے زیادہ میرے حلق کے اندر ہی جذب ہو
گئی۔ ہمارا مکان چار منزلہ تھا۔ مَیں بازو کھول کر مکان کی منڈیر پر کھڑا ہو گیا۔ مجھے
لمحے کے لئے بھی ڈر نہ لگا کہ مَیں نیچے گلی میں گر پڑوں گا۔ مَیں نے چھلانگ لگا
چھلانگ لگانے کے بعد میں نیچے گرنے کی بجائے ایک جھٹکے کے ساتھ اوپر کو بلند ہوا
پھر کسی آسیبی طاقت نے مجھے ہوا میں اڑانا شروع کر دیا۔ مَیں اکبری دروازے کے او
پرواز کرتا دِلی دروازے کے بھی اوپر سے گزر گیا۔ کرفیو زدہ رات کے سناٹے میں
کے کوچہ بازار سنسان پڑے تھے۔ مَیں اس طرح ہوا میں اڑ رہا تھا کہ کبھی جھول کھا
آ جاتا اور کبھی پھر اوپر کی طرف اٹھ جاتا۔

مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ مجھے کونسی طاقت کس طرف لئے جا رہی ہے۔ اتنا معلو
میں زیادہ بلندی پر نہیں ہوں، درختوں سے تھوڑا اوپر اڑ رہا ہوں۔ میں مصری شا
اِک موریہ پل سے بادامی باغ کی طرف جانے والی ریلوے لائن کی دیوار کے اوپر آ
میرے حلق سے غرغراہٹ کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ مجھے ہر شے دھندلی دھندلی
دینے لگی تھی۔ میں دریائے راوی کے اوپر سے گزرنے لگا۔ پھر جیسے اپنے آپ میں
مقبرہ جہانگیر کی طرف ہو گیا۔ مجھے ایک خاص قسم کے انسانی خون کی بُو برابر آ رہی
مَیں اسی بُو کے ساتھ ساتھ اڑ رہا تھا۔ پھر اپنے آپ میں نیچے اترنے لگا۔ نیچے مقبرہ
پیچھے کا علاقہ تھا۔ ایک جگہ کھجور کے درختوں کے نیچے خانہ بدوشوں کے جھونپڑے
کچھ مرد اور عورتیں جھونپڑوں کے باہر چارپائیوں پر سو رہے تھے۔ ایک چارپائی کے
کر میں ہوا میں معلق ہو گیا۔ اس چارپائی پر سے انسان کے اس خون کی بڑی تیز بُو
تھی جو مجھے کھینچ کر یہاں تک لے آئی تھی۔

مَیں آہستہ آہستہ نیچے آ گیا۔ اتنا نیچے آ گیا کہ مجھے چاندنی میں ایک نوجوان لڑکی
پر گہری نیند میں سوئی ہوئی نظر آئی۔ لڑکی کے سینے پر سے کپڑا ایک طرف ہٹا ہوا تھا

جسم صاف نظر آ رہا تھا۔ میں لڑکی پر جھکتا چلا گیا۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا کہ میرے نوکیلے
ت ہونٹوں سے باہر نکل آئے ہیں۔ مَیں نے اپنا منہ لڑکی کے جسم کے ساتھ لگا دیا اور
پنے دو دانت آہستہ آہستہ لڑکی کے جسم میں داخل کر دیئے۔ مجھے ہونٹوں پر خون کا ذائقہ
سوس ہُوا۔ یہ میٹھا خون تھا۔ میٹھا خون کسی کسی عورت کا ہوتا ہے۔ لڑکی پر بھی شاید ایک
ت انگیز نشے کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ وہ ذرا سا کسمسائی مگر اسی طرح گہری نیند سوتی
ہی۔ جب میں جی بھر کر خون پی چکا تو مَیں نے اپنا منہ اوپر اٹھا لیا۔ چاندنی میں مجھے لڑکی
ے جسم پر خون کے دھبے دکھائی دیئے۔ کسی طاقت نے مجھے ایک جھٹکے سے اوپر اٹھا لیا اور
ں ایک بار پھر ہوا میں پرواز کر رہا تھا۔ مَیں مقبرہ جہانگیر سے آگے نکل گیا۔ پھر میری
آنکھیں اپنے آپ بند ہو گئیں مَیں اپنے آپ ہوا میں اوپر اٹھتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی
یرے اڑنے کی رفتار تیز ہو گئی۔ پھر مَیں نے نصف دائرے میں ایک چکر لگایا اور نیچے آ
گیا۔ میری آنکھیں بند تھیں۔ مجھ پر ایک نشے کی کیفیت تھی۔ میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ
ں آنکھیں کھولوں۔ مجھے محسوس ہُوا کہ میں نیم گرم فضا میں سے گزر رہا ہوں۔ میری
فتار کم ہوتے ہوتے رک گئی۔ میں آہستہ آہستہ نیچے آتا گیا۔ پھر میرا جسم کسی ٹھنڈے
فرش کی سل کے ساتھ لگ گیا۔ اس وقت میری آنکھیں اپنے آپ کھل گئیں۔

میں نے دیکھا کہ میں نیچی چھت والے ایک لمبے سے کمرے میں ہوں، جس کی چھت
ے جالے لٹک رہے ہیں۔ کونے میں تیل کا دیا جل رہا ہے۔ میں ایک چبوترے پر پڑا ہوں۔
چانک میرا جسم گرم ہونا شروع ہو گیا۔ پھر میرے بازوؤں اور سینے پر سے دھواں لہروں کی
شکل میں اٹھنے لگا۔ میں نے آنکھیں بند کرنے کی کوشش کی مگر میں آنکھیں بند نہ کر سکا۔
ایک مکروہ چیخ بلند ہوئی۔ یہ چیخ سوائے پاتالی چڑیل کے اور کسی کی نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر
میں نے اپنے پاؤں کی طرف والی دیوار کے سیاہ شگاف میں پاتالی چڑیل کا ڈراؤنا چہرہ ابھرتے
دیکھا۔ اس کے سر کے بکھرے ہوئے بالوں میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ اس کے نوکیلے
دانت باہر نکلے ہوئے تھے۔ آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں۔ وہ شگاف سے باہر نکل آئی۔

اس نے ایک چیخ مار کر دونوں بازو اوپر اٹھا لئے۔ ایک دل ہلا دینے والی پھڑپھڑاہٹ کے ساتھ چھت کے جالوں میں سے ایک چمگادڑ نکل کر اس کے ہاتھ سے لگ کر چمٹ گئی۔ ایک پھنکار بلند ہوئی اور چھت کی بوسیدہ لکڑیوں میں سے ایک سانپ اچھل کر نکلا اور پاتالی چڑیل کے دوسرے ہاتھ کے ساتھ چمٹ گیا۔

پاتالی چڑیل آہستہ آہستہ مجھ پر جھکنے لگی۔ پھر اس نے اپنا مکروہ چہرہ میری گردن کے ساتھ لگا دیا اور اس کے نوکیلے دانت مجھے اپنی گردن میں اترتے محسوس ہوئے۔ اس نے میرا خون پینا شروع کر دیا جس میں خانہ بدوش لڑکی کا میٹھا خون بھی شامل ہو گیا ہُوا تھا۔ جتنا خون میں نے خانہ بدوش لڑکی کا پیا تھا وہ سارے کا سارا پاتالی چڑیل پی چکی تو اس نے اپنا منہ الگ کر لیا۔ میری گردن میں اس کے نوکیلے دانتوں کے دو سوراخ بن گئے تھے۔ پاتالی چڑیل نے دونوں ہاتھوں کو اچھال کر چمگادڑ اور سانپ کو چھوڑ دیا۔ سانپ میرے جسم پر گرا اور تیزی سے رینگتا ہوا میری گردن پر آیا اور ایک سوراخ پر منہ رکھ کر باقی ماندہ خون پینے لگا۔ چمگادڑ پھڑپھڑاتی ہوئی آئی اور میری گردن کے دوسرے سوراخ پر منہ رکھ کر خون چوسنے لگی۔ مجھے کوئی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ خوف اس وقت میرے دل سے نکل چکا تھا۔ میں خود اس خوف کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد پاتالی چڑیل نے سانپ اور چمگادڑ کو ہاتھوں سے پکڑ کر اوپر کھینچ لیا۔ میری آنکھیں پوری کھلی تھیں۔ میں آنکھوں کو نہ جھپک سکتا تھا' نہ بند کر سکتا تھا۔ پاتالی چڑیل ہوا میں بلند ہو گئی۔ اس کے نوکیلے دانتوں کے ساتھ لگا ہوا خون مجھے دیئے کی روشنی میں صاف نظر آ رہا تھا۔

پاتالی نے میرے اوپر وحشیانہ قہقہے لگاتے ہوئے دو چکر لگائے اور چمگادڑ اور سانپ کے ساتھ دیوار کے شگاف میں گھس کر میری نظروں سے غائب ہو گئی۔ اس کے غائب ہوتے ہی دیوار کے طاق میں جلتا ہوا دیا اپنے آپ پھڑپھڑا کر بجھ گیا۔ کمرے میں تاریکی چھا گئی۔ میری آنکھیں اپنے آپ ایسے بند ہو گئیں جیسے کسی نے ہاتھوں سے پکڑ کر میرے پپوٹے بند کر دیئے ہوں۔ مجھ پر غنودگی چھانے لگی۔ میں نہ سویا ہوا تھا نہ جاگ رہا تھا۔ خواب

بد اور بیداری کے درمیان لٹک رہا تھا۔ یہ حالت کچھ پتہ نہیں کب تک طاری رہی۔ ھے گڑگڑاہٹ کی آواز آنے لگی۔ اس آواز کے ساتھ زمین آہستہ آہستہ ہلنے لگی تھی۔ یرے اندر کی کوئی انسانی حس بیدار ہو چکی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ یہ ریل گاڑی کی آواز ہے۔ مجھے اب یہ بھی یاد آ گیا کہ مقبرہ جہانگیر کے آس پاس ہی تھا اور یہاں قریب ہی یل گاڑی کی لائن ہے۔ انسانی حسیات پوری طرح سے بیداری نہیں ہوئی تھیں۔ مجھے پنے جسم کا بوجھ محسوس ہونے لگا تھا۔ جبکہ ہوا میں اڑتے وقت یہ بوجھ محسوس نہیں ہوتا ھا۔ میں آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ تاریکی میں مجھے اپنا جسم اپنے بازو نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں چبوترے سے نیچے اتر آیا۔ مجھے کسی قسم کی کمزوری محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ب مجھے کسی طرف سے بھی انسانی خون کی بُو نہیں آ رہی تھی۔ میں نے تاریکی میں آگے ذم بڑھا کر دیوار کو پکڑ لیا اور اسے ٹٹول کر سامنے کی طرف قدم قدم چلنے لگا۔ ایک جگہ زینہ تھا' جو اوپر جا رہا تھا۔ میں زینے کی گرد آلود سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ جیسے جیسے میں اوپر جا رہا تھا' زینے کی سیڑھیوں میں روشنی ہوتی جا رہی تھی۔ یہ چاند کی چاندنی تھی۔ میں باہر نکل آیا۔

میں نے سب سے پہلے اپنے بازوؤں اور ہاتھوں کو دیکھا۔ میرے بدن پر اسی طرح بال ہی بال تھے۔ میں نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ میرا چہرہ اسی طرح بالوں سے بھرا ہُوا تھا۔ چاند مغرب کی طرف درختوں کے پیچھے ہو رہا تھا۔ اس کی چاندنی پھیکی پڑتی جا رہی تھی۔ چاند کی کرنیں اب میرے جسم پر کسی قسم کا کوئی اثر نہیں کر رہی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے انسانی محسوسات آہستہ آہستہ واپس آ رہے ہیں۔ مجھے اب اپنے آپ سے ڈر آنے لگا۔ مجھے اس بات سے خوف محسوس ہونے لگا کہ مجھے کسی نے اس حالت میں دیکھ لیا تو اس کا کیا حال ہو گا اور وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ ہو سکتا ہے وہ مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کرے۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ میں ایک کھنڈر کے تہہ خانے سے باہر نکلا تھا۔ زرد پُراسرار

چاندنی میں کچھ فاصلے پر کھجور کے درختوں کے جھنڈ دکھائی دے رہے تھے۔ یہ شاہدرہ کے
درختوں کے درخت تھے۔ مجھے سب کچھ یاد آ رہا تھا۔ میرا انسانی ذہن بیدار ہو گیا تھا۔ میں
اب اپنے آپ سے نہیں، لوگوں سے ڈر رہا تھا کہ مجھے رات کی گشت پر ڈیوٹی دیتے
سپاہیوں نے دیکھ لیا تو وہ مجھے کوئی درندہ سمجھ کر گولی مار دیں گے۔ پہلے میں بن مانس کی
طرح جھک کر چلتا تھا۔ مگر اب میں انسانوں کی طرح چل رہا تھا۔ مگر اپنے جسم کو چھپانے،
اپنے آپ کو چھپا کر چلنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ کوئی مجھے دیکھ نہ لے۔ میں کسی کی نگاہ
میں نہ آ جاؤں۔ اگرچہ وہاں گہری خاموشی اور سناٹا چھایا ہوا تھا اور آس پاس دور دور تک
کسی آدم زاد کا نشان نہیں تھا۔ اس کے باوجود میں خوفزدہ تھا کیونکہ مجھے وہاں سے اکبری
منڈی اپنے گھر تک جانا تھا۔ میں اپنے آپ کو درختوں اور جھاڑیوں کے اندھیرے میں
رکھنے کی کوشش کرتا شاہدرہ کے پل کی طرف بڑھ رہا تھا کہ جھاڑی میں سے ایک کتا
بھونکتا ہوا نکلا اور مجھ پر حملہ آور ہو گیا۔ میں پہلے تو ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔ پھر میں نے منہ
سے عجیب سی آواز نکال کر اس کی طرف بازو پھیلائے تو وہ بھاگ گیا۔

اچانک مجھے خیال آ گیا کہ میرے پاس تو کامنی کا دیا ہوا منتر ہے۔ میں منتر پڑھ کر ہوا
میں اڑتا ہوا جا سکتا ہوں۔ میں نے اسی وقت منتر پڑھ کر پھونکا اور اس کے ساتھ ہی ایک
جھٹکے سے میں زمین سے پانچ سات فٹ بلند ہو گیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اب محفوظ
رہ کر اپنے گھر پہنچ جاؤں گا۔ میں نے اپنے آپ کو اور اوپر اٹھا لیا۔ میں زمین سے ایک دم
ساٹھ ستر فٹ بلند ہو گیا۔ میں مزید بلند ہو گیا۔ میں رات کو گشت لگاتی پولیس کی نظروں
میں بھی نہیں آنا چاہتا تھا۔ میں نے بادشاہی مسجد کی طرف رخ کر لیا۔ دو چار منٹ کے بعد
ہی مجھے اپنی دائیں جانب بادشاہی مسجد کے بلند مینار غروب ہوتی چاندی میں دھندلے
دھندلے نظر آنے لگے۔ میں ریلوے لائن کے اوپر آ گیا۔ یہاں سے آگے اڑتا چلا گیا۔
سارے بازار خالی پڑے تھے۔ پھیکی چاندنی میں کوئی پولیس کا سپاہی بھی گشت کرتا نظر نہیں
آتا تھا۔ میں ایک موری پل سے دلی دروازے کی طرف ہو گیا۔ وہاں سے اکبری دروازے

ے اوپر سے ہوتا ہوا مکانوں کی چھتوں کے اوپر چکر لگانے لگا۔ مین نے اپنے مکان کی
ہت کو دیکھا اور بڑے آرام سے اپنے مکان کی چھت پر اتر گیا۔ مجھے اپنا جسم اور اپنے
حساسات بالکل نارمل محسوس ہو رہے تھے۔ میں نیم چاندنی اور نیم اندھیرے میں چھت کی
بڑھیاں اتر کر چوتھی منزل کے کمرے میں آ گیا۔ یہاں بجلی کا بلب اسی طرح جل رہا تھا۔
کمرے میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے خوشی مجھے یہ دیکھ کر ہوئی کہ میرے ہاتھوں کے
ل غائب ہو چکے تھے اور میری انگلی میں کامنی نرتکی کی دی ہوئی انگوٹھی واپس آ گئی تھی۔
ں دوڑ کر کارنس پر رکھے آئینے کے سامنے آ گیا۔

میرا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ میرا چہرہ اپنی اصلی انسانی حالت میں واپس آ گیا ہوا تھا۔
ں کارنس سے ہٹ کر پلنگ پر جھک گیا اور سجدے میں گر کر خدا سے اپنے گناہوں کی
عافیاں مانگنے لگا۔ میرے ہونٹ کپکپا رہے تھے اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اللہ کے
ضور سجدہ ریز ہو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگنے اور صدقِ دل کے ساتھ آنسو بہانے سے
یرے ضمیر کا بوجھ کافی ہلکا ہو گیا۔ اس کے بعد میں وہیں پلنگ پر پڑ کر سو گیا۔ سویرے کا
ویا ہوا گیارہ بجے اٹھا۔ سب سے پہلے اپنے آپ کا جائزہ لیا۔ میں بالکل نیچرل حالت میں
ھا۔ نہا دھو کر کپڑے بدلے۔ دکان پر جانے لگا تو خیال آیا کہ اپنی مصیبت کا حال کامنی کو بتا
کر اس سے بھی مشورہ لینا چاہیے۔ ہو سکتا ہے وہ کوئی ایسا طریقہ بتا دے کہ جس سے یہ
ونئی آفت مجھ پر پاتالی چڑیل کی وجہ سے آن پڑی ہے، اس سے چھٹکارا مل جائے۔ اس کی
ی ہوئی انگوٹھی میرے پاس موجود تھی۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ اگر تمہیں کبھی کوئی مشکل
آن پڑے تو اس انگوٹھی کو اپنے جسم کے ساتھ تین بار رگڑنا۔ میں تمہارے پاس آ جاؤں
گی۔ میں نے ایسا ہی کیا۔

انگوٹھی کو میں نے اپنے بازو کے ساتھ بڑی احتیاط سے تین بار رگڑا۔ میرے کمرے کا
دروازہ آدھا کھلا تھا۔ تیسری بار انگوٹھی رگڑنے سے دروازے کا آدھا پٹ بھی کھل گیا اور
کامنی نرتکی اپنے تمام حسن و جمال کے ساتھ میرے سامنے موجود تھی۔ وہ اندر آ کر

میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی:

"مجھے معلوم ہے کہ تم نے مجھے کس لئے بلایا ہے' مَیں خود تمہارے پاس آنے کا سوچ رہی تھی۔"

میں نے کہا۔ "اگر تمہیں سب کچھ معلوم ہے تو خدا کے لئے مجھے اس مصیبت سے نجات دلاؤ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کچھ میرے ساتھ کیوں ہو رہا ہے۔"

کامنی نے کہا۔ "آدمی جب کوئی گناہ کرتا ہے تو وہ یہ بھول جاتا ہے کہ اسے ایک نہ ایک دن اس گناہ کی سزا ضرور مل کر رہے گی۔ پھر جب وہ سزا کے چکر میں جکڑا جاتا ہے تو پھر بھی اسے اپنا گناہ یاد نہیں آتا۔ وہ یہی سمجھتا ہے کہ یہ مصیبت خدا کی طرف سے اس پر نازل ہوئی ہے جبکہ ہر آدمی اپنی لائی ہوئی مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے۔ تمہاری بخشش اس لیے بھی ہو جائے گی کہ تمہیں اپنا گناہ یاد ہے جس کی پاداش میں تم یہ عذاب بھگت رہے ہو۔ لیکن مصیبت کو ختم کرنے کے واسطے بھی کسی وسیلے کی ضرورت ہے۔ میں وہ وسیلہ تمہیں بتانا چاہتی ہوں۔"

میں بڑے غور سے کامنی کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ کسی مسلمان عقیدے والی عورت کی طرح بات کر رہی تھی۔ ہندو عورتیں اس قسم کی باتیں نہیں کیا کرتیں۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی کہ میں نے ایک ایسا گناہ کیا تھا جس کی سزا سے میں بچ نہیں سکتا تھا۔ میں نے شرک کا گناہ کیا تھا اور شرک بہت بڑا گناہ ہے' مجھے اسی کی سزا مل رہی تھی۔ میں نے کامنی سے کہا:

"خدا مجھے معاف کرے۔ مجھے بتاؤ کہ اس عذاب سے بچنے کے لئے مجھے کونسا دنیاوی وسیلہ عمل میں لانا چاہیے؟"

کامنی نرتکی میرے کمرے کی پرانے زمانے کی آرام کرسی پر بڑے سکون کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس نے کیسری رنگ کی ساڑھی پہنی ہوئی تھی اور بالوں میں سفید پھول لگے ہوئے تھے۔ وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ کہنے لگی:

"پاتالی چڑیل نے تمہیں اپنے طلسم میں جکڑ رکھا ہے۔ آج رات تمہارے ساتھ جو ڈراؤنے واقعات پیش آئے ہیں یہ کسی بھی رات تمہارے ساتھ پھر بھی پیش آ سکتے ہیں۔ پاتالی چڑیل میٹھے خون والی کنواری لڑکیوں کی عاشق ہے۔ وہ تمہارے اور اپنے سانپ اور چمگادڑ کے ذریعے میٹھے خون والی لڑکیوں کا خون پیتی ہے۔ اسے اپنا خونی نشہ پورا کرنے کے لئے تمہارے وسیلے کی ضرورت ہے۔ صرف یہی اس کی ایک مجبوری ہے۔ اس نے تمہیں اپنے قابو میں کر کے اپنا وسیلہ بنا لیا ہے۔ میں دل سے چاہتی ہوں کہ تمہیں پاتالی کی لائی ہوئی اس مصیبت سے چھٹکارا دلاؤں مگر میری طاقت پاتالی چڑیل کی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہ میری مجبوری ہے۔ اب میں تمہیں وہ طریقہ ضرور بتا سکتی ہوں جس پر عمل کر کے تمہیں اس عذاب سے نجات مل سکتی ہے۔"

میں نے کہا:

"خدا کے لئے مجھے وہ طریقہ بتاؤ۔ میں اپنی جان پر کھیل کر بھی اس پر عمل کروں گا۔"

کامنی نرتکی نے سر کو ہلکا سا جھٹک کر اپنے ماتھے پر آئی ہوئی بالوں کی لٹ کو پیچھے کیا اور میری طرف پوری توجہ سے اپنی نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے کہنے لگی:

"تم یہاں سے اپنی پہلی فرصت میں کراچی جاؤ گے۔ کراچی میں کلفٹن کی مشہور سیرگاہ ہے۔ کلفٹن سے آگے ساحلِ سمندر کے ساتھ ساتھ چلتے جانا۔ جہاں ساحلِ سمندر کے ساتھ ساتھ بنی ہوئی عمارتوں کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے وہاں سے کچھ فاصلے پر سمندر کے کنارے تمہیں ایک جھونپڑا دکھائی دے گا۔ اس جھونپڑے میں خدا کا ایک مجذوب بندہ رہتا ہے۔ وہ کسی سے نہیں ملتا۔ کسی سے بات نہیں کرتا' وہ سمندر کے کنارے پھرتا رہتا ہے۔ اس کا کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ اپنے جھونپڑے میں کب آتا ہے۔ تم جھونپڑے کے باہر ایک طرف ہو کر بیٹھ جانا اور مجذوب کا انتظار کرنا۔ جب وہ آئے تو کھڑے ہو کر بڑے ادب سے اسے سلام کرنا اور کچھ نہ بولنا۔ وہ تمہیں دیکھ کر سب کچھ سمجھ جائے گا کہ تم کون ہو۔ اس کے پاس کس غرض سے آئے ہو اور تمہیں کس نے بھیجا ہے۔ وہ غصے میں

تمہیں کہے گا کہ یہاں سے بھاگ جاؤ' یہاں کیوں آئے ہو۔ تمہیں برا بھلا کہے گا۔ تم سلام کر کے وہاں سے چلے آنا اور دوسرے دن پھر وہاں پہنچ جانا۔ مجھے یقین ہے کہ دوسرے دن وہ تمہیں بلا کر اپنے پاس بٹھا لے گا اور پھر وہ تمہیں جو کہے' اسے غور سے سننا اور اس پر عمل کرنا۔ وہ مجذوب تمہیں وہ راستہ دکھا دے گا' جس پر چل کر تم اپنی مصیبت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھٹکارا حاصل کر لو گے۔"

کامنی خاموش ہو گئی۔ میں نے کہا:

"میں آج ہی کراچی کے لئے روانہ ہو جاتا ہوں اور جیسا تم نے کہا ہے ویسے ہی کروں گا۔"

کامنی کہنے لگی۔ "وہ مجذوب بزرگ تمہیں جو چیز کرنے کو کہے وہی کرنا۔ جس چیز سے منع کرے وہ ہرگز ہرگز نہ کرنا۔ اگر کرو گے تو اس عذاب سے کبھی نجات حاصل نہ کر سکو گے۔"

میں نے کہا:

"میں مجذوب بزرگ کی ایک ایک بات پر عمل کروں گا۔ وہ جس چیز سے روکے گا مَیں وہ ہرگز نہیں کروں گا۔ تم بے فکر رہو۔"

کامنی نرتکی اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ کہنے لگی:

"مَیں جاتی ہوں۔ جانے سے پہلے تمہیں ایک بات پھر یاد دلا دینا چاہتی ہوں کہ مجھے بغیر سخت مشکل وقت کے کبھی بلانے کی کوشش نہ کرنا۔ میرا تمہارے پاس ظاہر ہونا اتنی آسان بات نہیں ہے' جتنی تم سمجھ رہے ہو۔ اب مَیں جاتی ہوں۔"

اور میرے دیکھتے دیکھتے کامنی نرتکی غائب ہو گئی۔

کمرے میں اس کے آنے سے جو ہلکی ہلکی سی خوشبو پھیل گئی تھی' اس کے غائب ہونے کے بعد وہ خوشبو بھی غائب ہو گئی۔

مَیں نے کراچی جانے کی تیاری شروع کر دی۔ ایک چھوٹے سے سوٹ کیس میں ایک

دو جوڑے کپڑوں کے اور کچھ ضروری سامان رکھا اور سوٹ کیس بیٹھک میں رکھ کر مکان کو تالا لگایا اور سیدھا دکان پر آ گیا۔ دکان پر خالد روزمرہ کے کام کاج میں مصروف تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا:

"لگتا ہے رات دیر تک جاگتے رہے تھے جو اتنی دیر تک سوئے رہے۔"

مَیں نے کہا۔ "ہاں یار ——— تمہارے جانے کے بعد مجھے نیند ہی نہیں آئی۔ بہرحال دو ایک روز کے لئے مجھے کراچی جانا پڑ گیا ہے۔ میرے مکان کو خالی نہ رکھنا۔ کسی ملازم کو کہنا کہ وہ رات کو وہاں سو جایا کرے۔"

خالد کہنے لگا: "کراچی تمہیں اچانک کیا کام پڑ گیا؟"

مَیں نے کہا۔ "یہ سب کچھ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ تم یہ بتاؤ کہ کراچی اس وقت کونسی گاڑی جاتی ہے؟"

اس نے کہا: "کوئی نہ کوئی گاڑی ضروری جاتی ہوگی۔ کیونکہ ریلوے کی گاڑیاں اس طرف چل رہی ہیں۔ میں فون کر کے معلوم کر دیتا ہوں۔"

اس نے لاہور سٹیشن پر فون کیا تو معلوم ہُوا کہ رات کے نو بجے ایک گاڑی کراچی جائے گی۔ مَیں شام تک دکان پر ہی رہا۔ اس کے بعد خالد بھی میرے ساتھ دکان بند کر کے آ گیا۔ ہم نے وہیں ایک ہوٹل میں کھانا کھایا۔ سوا آٹھ بجے کے قریب ہم تانگے میں سوار ہو کر ریلوے سٹیشن پر آ گئے۔ اس روز لاہور شہر میں کرفیو نہیں لگا ہُوا تھا۔ حالات کچھ ٹھیک ہی تھے۔ خالد مجھے گاڑی میں سوار کرا کر چلا گیا۔ مَیں دوسرے روز سورج غروب ہونے سے ذرا پہلے کراچی پہنچ گیا۔ یہ ۱۹۴۷ء کا کراچی تھا۔ مختصر آبادی تھی۔ مَیں نے سٹیشن کے پاس ہی ایک ہوٹل میں کمرہ لے لیا۔ سوٹ کیس کمرے میں رکھ کر مَیں ایک ل میں بیٹھ کر کلفٹن آ گیا۔ حالات کشیدہ ہونے کی وجہ سے ساحل سمندر پر سیر کرنے الے چند ایک ہی نظر آ رہے تھے۔ سمندر کے ساتھ کچھ پرانے کاٹج نما کوارٹر بنے ہوئے تھے' جو دور تک چلے گئے تھے۔ مَیں ان کے سامنے سے گزرتا گیا۔ یہ کاٹج انگریزوں اور

ہندو سرمایہ داروں نے بنا رکھے تھے جو اب خالی پڑے تھے۔

یہ کاٹج ختم ہو گئے۔ آگے سمندر کا کنارہ خالی پڑا تھا۔ کہیں کہیں ریت کے ڈھیر تھے۔ سورج مغرب کی طرف سمندر کے اوپر جھک رہا تھا۔ اس کی ہلکی گلابی کرنیں سمندر کی لہروں کو گلابی رنگ عطا کر رہی تھیں۔ بڑی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ مَیں آگے بڑھتا گیا۔ کافی آگے جانے کے بعد مجھے سمندر سے ہٹ کر ایک جھونپڑا دکھائی دیا۔ یہی وہ جھونپڑا تھا' جس کے بارے میں کامنی نے کہا تھا کہ وہاں مجھے مجذوب بزرگ ملے گا۔ مَیں جھونپڑے کے قریب جا کر ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔ جھونپڑے کا کوئی دروازہ نہیں تھا۔ ایک بوریا تھا جسے اوپر اٹھا دیا گیا تھا۔ جھونپڑا بالکل خالی تھا۔ اندر مٹی کا ایک مٹکا ایک طرف رکھا ہُوا تھا۔ مَیں ذرا پرے ہٹ کر بیٹھ گیا اور مجذوب کا انتظار کرنے لگا۔

سورج آہستہ آہستہ سمندر میں اتر رہا تھا۔ اس کی کرنیں ارغوانی رنگ اختیار کر رہی تھیں۔ مَیں یہ سوچ کر آیا تھا کہ مجھے جتنی دیر بھی وہاں بیٹھنا پڑے بیٹھ کر مجذوب بزرگ کا انتظار کروں گا۔ اتنے میں' مَیں نے ایک آدمی کو دیکھا جو ریت کے ایک ٹیلے کی اوٹ سے نکل کر چلا آ رہا تھا۔ اس کا رخ جھونپڑے کی طرف تھا۔ وہ ذرا قریب آیا تو مَیں نے دیکھا کہ ایک بھاری جسم والا درمیانے قد کا فقیر قسم کا آدمی ہے۔ کالے رنگ کا چولا پہنا ہُوا ہے۔ سر اور ڈاڑھی مونچھیں غائب ہیں۔ وہ ایسے چلا آ رہا تھا' جیسے اسے اِردگرد کیا ہو رہا ہے اس کی کچھ خبر نہیں ہے۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر گزر گیا۔ مَیں سمجھ گیا کہ یہی مجذوب بزرگ ہے۔ مَیں جلدی سے اٹھ کھڑا ہُوا اور جب وہ میرے قریب سے گزرا مَیں نے اسے سلام کیا۔ اس نے میرے سلام کا کوئی جواب نہ دیا۔ دو قدم چل کر رکا' پلٹ کر میری طرف دیکھا اور غصے میں بولا:

"جب مصیبت پڑ جاتی ہے تو میرے پاس آ جاتے ہو۔ اس وقت کہاں تھے جب کے حکم کی نافرمانی کی تھی۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ اپنے ساتھ مجھے کیوں مصیبت پھنساتے ہو۔ چلو' بھاگو یہاں سے۔"

مَیں بڑے ادب سے ہاتھ باندھے چپ چاپ کھڑا رہا۔ کامنی نے مجھے ہدایت کی تھی کہ مجذوب کچھ بھی کہے آگے سے مت بولنا۔ مجذوب نے مجھے اپنی لال لال آنکھوں سے دیکھا اور غضب ناک لہجے میں بولا:

"میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو؟ یہاں سے دفع کیوں نہیں ہو جاتے۔ چلو' بھاگ جاؤ' بھاگ جاؤ۔"

مَیں چپ چاپ وہاں سے واپس ہو گیا۔

رات مَیں نے ہوٹل میں گزاری۔ دوسرے دن صبح صبح دوبارہ کلفٹن میں مجذوب بزرگ کے جھونپڑے پر پہنچ گیا۔ جھونپڑا خالی پڑا تھا۔ مَیں کل کی طرح ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ کافی دیر بیٹھا رہا۔ اس کے بعد مجذوب بزرگ اسی طرح جھومتے جھامتے اپنے خیالوں میں گم ٹیلے کے پیچھے سے نمودار ہوئے اور میری طرف دیکھے بغیر قریب سے گزر گئے۔ مَیں نے اٹھ کر انہیں ادب سے سلام کیا۔ کل کی طرح' انہوں نے میرے سلام کا کوئی جواب نہ دیا۔ دو قدم چلنے کے بعد رک گئے اور پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ دس پندرہ سیکنڈ تک دیکھتے رہے۔ پھر کہا: "تم باز نہیں آؤ گے۔ اچھا کوئی بات نہیں۔ آ جاؤ' آ جاؤ۔"

یہ کہہ کر وہ جھونپڑے میں چلے گئے۔ مَیں ان کے پیچھے چلتا جھونپڑے کے باہر آ کر رک گیا۔ مجذوب اندر جا کر بیٹھ گئے تھے۔ انہوں نے مجھے سخت غصے میں آواز دے کر کہا:

"وہاں کونسی تمہاری ماں ہے جس کے پاس کھڑے ہو گئے ہو۔ اندر آتے ہوئے ڈر لگتا ہے؟"

مَیں جلدی سے جھونپڑے میں داخل ہو کر ان کے سامنے ادب سے دو زانو ہو کر بیٹھ گیا۔ زمین پر میلی سی صف بچھی ہوئی تھی۔ مجذوب نے اپنے سیاہ چولے کی جیب میں سے سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس کی ڈبیا نکالی۔ ایک سگریٹ سلگایا اور لمبا سوٹا لگانے کے بعد سر جھکا لیا۔ وہ دیر تک اسی حالت میں گم رہے۔ مَیں بھی چپ بیٹھا رہا۔ کافی دیر بعد

مجذوب نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ سگریٹ ان کی انگلیوں میں آدھے سے زیادہ جل چکا تھا۔ انہوں نے سگریٹ کو میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

"لو' اسے باہر پھینک دو۔"

مَیں نے جلدی سے سگریٹ ان کے ہاتھ سے لے لیا اور زور سے جھونپڑے کے باہر پھینک دیا۔ مجذوب اس طرح بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک گھٹنا اوپر کو اٹھا ہوا تھا' جس پر انہوں نے اپنا بازو ٹکایا ہوا تھا۔ انہوں نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور ہاتھ کو بار بار جھٹک رہے تھے۔ میں بالکل خاموش تھا۔ مجذوب نے آخر آنکھیں کھولیں۔ میری طرف دیکھا اور گھٹنا نیچے کر کے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ کہنے لگے:

"جس نے تمہیں میرے پاس بھیجا ہے، مجھے اس کی بڑی قدر ہے۔ تم دنیا والے جہنم کی طرف بڑے شوق سے بھاگ بھاگ کر جاتے ہو۔ جب آگ لگتی ہے تو شور مچاتے ہو۔"

مَیں نے زبان کھولی اور عاجزی سے کہا:

"مَیں خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہوں۔"

مجذوب سر ہلاتے رہے۔ میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ جھونپڑی میں خاموشی چھا گئی۔ اس خاموشی میں دور سے سمندر کی لہروں کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دے رہی تھی۔ مجذوب کہنے لگا:

"جو میں کہوں اس پر پورا عمل کرنا۔ جس شے سے منع کروں، اس کو ہاتھ بھی نہ لگانا۔ تم کبھی ولائت گئے ہو؟"

مَیں نے عرض کی۔ "جی مَیں ولائت کبھی نہیں گیا۔"

انہوں نے سخت لہجے میں کہا:

"تو پھر اب جاؤ۔ تمہارا ولائت جانا مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔ ولائت میں ایک ملک ہے فرانس۔ یہ وہ ملک ہے جہاں عرب مسلمانوں کی فوجیں ایک زمانے میں اس کے جنوبی

پر اتری تھیں۔ اس علاقے کے لوگوں میں آج بھی عربوں کا خون گردش کر رہا ہے۔ وہاں ایک پہاڑی گاؤں ہے۔ گاؤں سے کچھ دور ساحلِ سمندر پر ایک پرانے قلعے کا کھنڈر ہے۔ اس قلعے کے کھنڈر کے بائیں جانب سرو کے بہت سے درخت ہیں۔ ان درختوں کے درمیان دو چوکور سرخ پتھر زمین سے باہر نکلے ہوئے ہیں۔ تمہارے خیال میں یہ کیا ہو سکتے ہیں؟"

مَیں چپ رہا۔ مجذوب نے کڑک دار آواز میں کہا:

"میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے؟ تمہارے خیال میں یہ پتھر کیا ہو سکتے ہیں؟"

مَیں نے سنبھلتے ہوئے کہا: "جی مَیں کیا عرض کر سکتا ہوں۔ مَیں نے وہ پتھر کبھی نہیں دیکھے۔"

مجذوب نے غصیلی آواز میں مجھے جھڑک کر کہا:

"تو پھر اب جا کر دیکھو۔ ان سرخ پتھروں کو جا کر دیکھو اور ان کے پاس کھڑے ہو کر پڑھو۔ وہ پتھر عرب مسلمانوں کی فوج کے ایک شہید کی قبر کا نشان ہے جو عیسائیوں کی فوج سے جہاد کرتے ہوئے شہید ہو گیا تھا' جو کچھ مَیں کہہ رہا ہوں تم سمجھ رہے ہو کیا؟"

مَیں نے جلدی سے کہا۔ "جی مَیں سمجھ رہا ہوں۔"

"تو پھر یہاں کیا کر رہے ہو۔ دفع ہو جاؤ۔ کل اسی وقت آنا۔"

مَیں خاموشی سے اٹھا' سلام کیا اور جھونپڑے سے نکل گیا۔

دوسرے روز میں صبح صبح مجذوب بزرگ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔
اس وقت وہ جھونپڑے کے باہر ہی بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بولے:
"تم پھر آ گئے ہو؟"
مَیں نے قریب جا کر سلام عرض کی اور کہا:
"مجھے تو آپ کے دروازے سے ہی خیر ملے گی۔" اس پر مجذوب بزرگ نے بڑ
جلال کے ساتھ کہا:
"تو پھر اس خیر کو شر میں نہ بدل دینا ورنہ نہ گھر کے رہو گے نہ گھاٹ کے۔"
مَیں نے عرض کی۔ "محترم آپ جیسے فرمائیں گے مَیں ویسے ہی حکم بجا لاؤں گا۔"
"تو پھر بیٹھ جاؤ' میرے پاس آ کر۔" انہوں نے مجھے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا
ان کی خدمت میں بیٹھ گیا۔ پوچھا:
"کل میں نے بات کہاں ختم کی تھی؟"
مجھے ان کا ایک ایک لفظ یاد تھا۔ بھول بھی کیسے سکتا تھا۔ اِن باتوں سے میری زند
موت کا معاملہ وابستہ تھا۔ مَیں نے انہیں بتایا کہ وہ فرانس کے جنوبی علاقے کے
پہاڑی گاؤں مین عرب مسلمان شہید کی قبر کا ذکر فرما رہے تھے۔ کہنے لگے:
"تمہاری باتوں سے لگتا ہے کہ جو امانت میں تمہارے سپرد کر رہا ہوں، تم وا

دار ہو لیکن انسان حرص و ہوس کا غلام ہے۔ عورت اس کی سب سے بڑی کمزوری
یاد رکھو اس کمزوری کو اپنے اوپر غلبہ نہ پانے دینا، ورنہ سب کچھ خاک میں مل
گا۔"
یں نے کہا: "مَیں آپ کے حکم کے مطابق عمل کروں گا۔"
"تو پھر سنو۔" انہوں نے دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا۔ "جب تم شہید کی قبر پر فاتحہ
چکو تو وہیں بیٹھ جانا اور آنکھیں بند کر لینا۔ شہید کی روح تمہیں اپنے سامنے نظر آئے
اِس کے ساتھ ہی تمہیں اپنے اندر ایک نورانی روشنی پھیلتی محسوس ہو گی۔ یہ روشنی
ے اندر کی تمام تاریکیوں کو ختم کر دے گی اور تم اپنی اِس مصیبت سے نجات حاصل
گے جو تمہارے شرک کے گناہ اور ایک بدروح کی نحوست سے تم پر نازل ہوئی
اب یہاں سے اپنا منحوس وجود اٹھا کر میری نظروں سے دفع ہو جاؤ۔"
یں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ مَیں نے کہا:
"آپ نے اس گاؤں کا نام نہیں بتایا۔"
مجذوب بزرگ نے اس پہاڑی گاؤں کا نام بلند آواز میں کہا جو جنوبی فرانس کے ایک
شہر سے کچھ فاصلے پر قدیم قلعے کے پہلو میں واقع ہے۔ مَیں نے وہ نام اپنے ذہن میں
لیا اور مجذوب بزرگ کو ادب سے سلام کر کے وہاں سے رخصت ہو گیا۔
مَیں جس کام کے لئے کراچی آیا تھا وہ کام ہو گیا تھا۔ اب وہاں میرا کوئی کام نہیں تھا۔
ای رات مَیں لاہور واپس روانہ ہو گیا۔ لاہور آنے کے بعد مَیں فرانس کی طرف سفر
یاری کرنے لگا۔ اِس زمانے میں لوگ سمندر پار یورپ کے ملکوں میں عام طور پر بحری
وں میں ہی جاتے تھے۔ ہوائی جہازوں کا ابھی ہندوستان میں اتنا رواج نہیں ہوا تھا اور
تو ہوائی جہازوں کے کرائے بڑے زیادہ تھے' دوسرے ہوائی سفر کو محفوظ بھی نہیں
ا جاتا تھا۔ کیونکہ طیارے پَروں والے انجنوں کی مدد سے پرواز کرتے تھے۔ ان پَر
لے انجنوں کا کچھ پتہ نہیں ہوتا تھا کہ کب اچانک رک جائیں۔ اس قسم کے شکوک و

شبہات عام طور پر لوگوں میں پائے جاتے تھے۔ ہندوستان سے باہر کسی ملک میں جانے
لئے پاسپورٹ ویزے کی ضرورت ہوتی تھی۔ ابھی ہندوستان سے انگریز گیا نہیں ز
چنانچہ پاسپورٹ ویزے کی اتنی زیادہ دِقت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ مَیں نے اپنے دوس
خالد سے پوشیدہ طور پر اپنے اثر و رسوخ کے ذریعے پاسپورٹ بنوا لیا اور کراچی جا
یورپ کے تقریباً سبھی ملکوں کے ویزے بھی لگوا لئے۔ کراچی ہی سے میں ایک بحری جہ
مَیں سوار ہو گیا۔ جس کی منزل انگلستان کی بندرگاہ ساؤتھیمپٹن تھی۔ جہاز میں سوار ہو
سے پہلے میں نے اپنے دوست خالد کے نام ایک خط پوسٹ کر دیا' جس میں بس اتنا ہی ل
کہ مَیں سیر و سیاحت کی غرض سے لندن جا رہا ہوں، پیچھے کاروبار کا خیال رکھنا۔ ان دن
بحری جہازوں کی رفتار اتنی تیز نہیں ہوتی تھی۔ معلوم ہوا جہاز تین ہفتوں میں انگلس
پہنچے گا۔

یہ ملک ہالینڈ کی ایک کمپنی کا جہاز تھا۔ کافی بڑا جہاز تھا۔ اس کی تین منزلیں تھیں۔
نے سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ لیا تھا اور جہاز کی دوسری منزل کے ایک آرام دہ کیبن میں
تھا۔ مئی کا مہینہ شروع ہو چکا تھا' جب میں نے اپنے سمندری سفر کا آغاز کیا۔ کراچی
دن کے وقت کافی گرمی پڑتی تھی۔ رات کو ہوا چلتی تو موسم خوشگوار ہو جاتا تھا۔ سمند
سفر بڑا خوشگوار تھا۔ میں دوسرے درجے کے عرشے پر آ کر بیٹھ جاتا۔ سمندر کی طرف
ٹھنڈی ہوائیں آتیں۔ عرشے پر آرام کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک رات خوب
ریستوران تھا۔ ایک جانب بار روم تھا' جہاں ہر قسم کی مشروبات ملتی تھیں۔ میں شام
وقت ریستوران میں بیٹھ کر کبھی کافی اور کبھی چائے سے لطف اندوز ہوتا۔ سفر طویل
راستے میں کوئی نہ کوئی دوست بن جاتا ہے۔ ایک لڑکی سے میری بھی جان پہچان ہو
نازک سے جسم کی خاموش طبع لڑکی تھی۔ وہ بھی شام کے وقت ریستوران میں اکیلی
بیٹھ جاتی اور خاموشی سے کافی پیتی رہتی۔ اتفاق سے وہ میرے ساتھ والی ٹیبل پر ہی
بیٹھتی۔ ایک روز اس نے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبایا اور ماچس دیکھی تو وہ خالی

اس نے میری طرف دیکھ کر انگریزی میں پوچھا کہ میرے پاس ماچس ہو گی۔ مَیں نے کہا کہ میں سگریٹ نہیں پیتا۔ اس نے ویٹر سے ماچس لے کر سگریٹ سلگایا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگی:

"کیا مَیں آپ کی میز پر آ کر بیٹھ سکتی ہوں؟"

مَیں نے تکلفاً کہہ دیا۔ "بیٹھ جاؤ۔" وہ اٹھ کر میری میز پر آ گئی۔ اس نے مجھ سے باتیں شروع کر دیں۔ کہنے لگی:

"مَیں فرانس کی رہنے والی ہوں۔ پیرس یونیورسٹی میں دوسرے سال کی سٹوڈنٹ ہوں۔ چھٹیوں میں انڈیا کی سیر کرنے آئی تھی اب واپس جا رہی ہوں۔"

اس نے اپنا نام سلوٹی بتایا۔ جہاز کے سفر میں ہم کافی ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ مَیں نے اس سے جنوبی فرانس کے بارے میں دریافت کیا کہ وہاں ایک گاؤں ہے جو جنوبی فرانس کی ساحلی بندرگاہ مارسیلز کے جنوب میں واقع ہے۔ اس نے اس گاؤں کا نام پوچھا تو جو نام مجھے مجذوب بزرگ نے بتایا تھا مَیں بھول گیا۔ مجھے اس وقت بھی جب انہوں نے نام بتایا تھا تو ڈر لگتا تھا کہ کہیں میں یہ نام بھول نہ جاؤں۔ فرانسیسی زبان کا بڑا مشکل سا نام تھا۔ مَیں نے سلومی سے کہا:

"مجھے نام یاد نہیں رہا لیکن یہ گاؤں جنوبی فرانس میں ہے۔ اس کے قریب ہی سمندر کے کنارے ایک قدیم تاریخی قلعہ بھی ہے۔"

مَیں نے اسے یہ بتانے کی ضرورت نہ سمجھی کہ قلعے کے پہلو میں سرو کے درختوں کے درمیان سرخ چوکور پتھروں کی ایک قبر بھی ہے۔ کیونکہ مجذوب بزرگ نے بتایا تھا کہ وہاں کوئی نہیں جانتا کہ یہ ایک عرب مسلمان شہید کی قبر ہے۔ سلومی کہنے لگی:

"جنوبی فرانس میں تو کئی صوبے ہیں اور ہر صوبے میں کتنے ہی شہر اور گاؤں اور قصبے ہیں۔"

مَیں نے کہا: "اس گاؤں کے قریب قدیم قلعہ ہے۔"

وہ بولی۔ ”فرانس کے ہر قصبے، ہر گاؤں کے پاس ایک قلعہ ہے اور سمندر کے کنارے تو جنوب میں جتنے گاؤں ہیں وہاں اتنے ہی قلعے ہیں۔ یہ سارے قلعے قدیم زمانے میں رومنوں نے بنائے تھے۔“

مَیں پریشان ہو گیا۔ مجھے پریشان ہوتا دیکھ کر سلومی نے کہا:

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ مَیں فرانس کی رہنے والی ہوں۔ وہاں چل کر معلوم کرلیں گے، مگر تم اس خاص گاؤں کا کیوں پوچھ رہے ہو؟“

مَیں نے کہہ دیا کہ وہاں میرا ایک دوست رہتا ہے، مَیں اسی کے پاس جا رہا تھا۔ اب میرے لئے مشکل پیدا ہو جائے گی۔ پردیس کا معاملہ ہے۔ میرے پاس اتنے پیسے بھی نہیں کہ ہوٹلوں کا خرچ اٹھا سکوں۔

سلومی نے کہا: ”اس کی تم فکر نہ کرو۔ میرا باپ جاگیردار ہے۔ میں پیرس کے ایک ہوسٹل میں رہتی ہوں۔ میرا باپ مجھے کافی رقم ہر سال بھیج دیتا ہے۔ جب تک تمہیں تمہارے دوست کا گاؤں نہیں مل جاتا تم میرے مہمان بن کر رہ سکتے ہو۔ میں تمہیں ایک ہوٹل میں کمرہ لے دوں گی۔“

مجھے کچھ حوصلہ ہُوا۔ مجھے محسوس ہُوا کہ اگر اس وقت یہ لڑکی میرا ہاتھ نہ پکڑتی ت
پردیس میں میرا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ کامنی نرتکی نے اس بار مجھے صاف لفظوں میں خبردا
کر دیا تھا کہ میں اسے صرف اس وقت انگوٹھی رگڑ کر بلاؤں جب میری جان پر کوئ
مصیبت بن گئی ہو، ورنہ وہ میرے پاس آنا بند کر دے گی۔ یہ سب کچھ اس کی مجبور
تھی۔ میں نے سلومی کا شکریہ ادا کیا۔ اب یہ لڑکی میری ضرورت بن گئی تھی۔ میں کم از
اس وقت تک پردیس میں اس کے ساتھ رہنے پر مجبور تھا جب تک کہ میں وہ گاؤں تلا
نہیں کر لیتا، جس کے قلعے کے پاس شہید کی قبر تھی اور جب تک کہ اس دوران میں ا
رہائش کا کوئی الگ بندوبست نہیں کر لیتا۔ سلومی نے انتہائی خوش اخلاقی اور کشادہ ظرف
مظاہرہ کیا تھا۔ میں اس کے حسنِ اخلاق سے بے حد متاثر ہُوا۔ میرے پاس جہاز کی وا

ی کرائے کے علاوہ اتنے پیسے تھے کہ مَیں فرانس میں پندرہ بیس روز کسی درمیانے درجے کے ہوٹل میں گزارہ کر سکتا تھا۔ اس کے باوجود میں نے ایک دو بار چائے کافی کا بل اپنی طرف سے ادا کرنا چاہا تو سلومی نے مجھے اس کی اجازت نہ دی۔ دوپہر اور رات کا کھانا ہماری سیکنڈ کلاس کی ٹکٹ میں ہی شامل تھا۔ صرف ناشتہ اور شام کی چائے کا بل ہمیں خود ادا کرنا ہوتا تھا۔

جب ہمارا جہاز انگلستان کی بندرگاہ ساؤتھیمپٹن کے ساحل پر لگا تو میں اور سلومی ایک دوسرے کے گہرے اور بے تکلف دوست بن چکے تھے۔ ساؤتھیمپٹن سے ہم بذریعہ ریل گاڑی پیرس آ گئے۔ پیرس کی میں نے بڑی شہرت سن رکھی تھی کہ دنیا جہان کا فیشن پیرس سے شروع ہوتا ہے اور وہاں عورتیں نیم عریاں چلتی پھرتی ہیں۔ مگر وہاں جا کر معلوم ہوا کہ فیشن تو وہاں بہت تھا مگر عورتوں کے نیم عریاں پھرنے والی بات غلط تھی۔ آج کل وہ بات سچ ثابت ہو گئی ہے۔ آج کل تو اگر پیرس کی سڑکوں پر کوئی عورت بالکل عریاں حالت میں بھی چلتی نظر آئے تو لوگوں کو تعجب نہیں ہوتا۔ لیکن سن ۱۹۴۷ء کے زمانے میں ابھی پیرس کی کم از کم عام سڑکوں پر اتنی عریانی شروع نہیں ہوئی تھی۔ البتہ پیرس کی بعض گلیوں میں مَیں نے عریانی کے انتہائی حیا سوز منظر دیکھے۔ یہ مَیں آپ کو آگے چل کر بیان کروں گا۔ پیرس ایک تو ماڈرن فیشن ایبل علاقہ تھا۔ ایک اندرونِ شہر کا گنجان علاقہ تھا، جہاں تنگ بازار جھکے ہوئے چھجوں والے بوسیدہ مکان اور لاہور کی طرح کی چھتی ہوئی گلیاں بھی تھیں۔ پیرس کے ایک ذرا کم گنجان علاقے کے ایک درمیانے ہوٹل میں سلومی نے مجھے ایک کمرہ کرائے پر لے دیا اور کہا:

”تم آج کی رات آرام کرو۔ کل مَیں تمہارے پاس آؤں گی۔ مَیں اپنے ساتھ جنوبی فرانس کا نقشہ بھی لاؤں گی۔ اس نقشے کو دیکھ کر تم یاد کرنا کہ تمہارے دوست کے گاؤں کا نام کیا تھا۔ اگر پھر بھی وہ گاؤں نہ ملا تو ہم اخبار میں تمہارے دوست کے نام سے ایک اشتہار شائع کرا دیں گے کہ وہ جہاں کہیں بھی ہے تم سے ہوٹل کے ذریعے رابطہ پیدا

کرے۔"

اسے معلوم نہیں تھا کہ اس قسم کا اشتہار بے معنی ہوگا کیونکہ میرا کوئی دوست فرانس میں مقیم نہیں تھا۔ بہرحال مجھے کچھ امید پیدا ہوگئی کہ نقشے پر فرانسیسی گاؤں کا نام دیکھ کر شاید مجھے اس گاؤں کا نام یاد آجائے جو مجذوب بزرگ نے مجھے بتایا تھا اور جہاں جانے کے واسطے مَیں نے فرانس کا سفر اختیار کیا تھا۔ سلومی مجھے ہوٹل کے پرانے ٹائپ کے چھوٹے سے کمرے میں چھوڑ کر چلی گئی۔

اگلے روز وہ ہوٹل میں آئی تو اس کے پاس فرانس کے جنوبی علاقے کا نقشہ بھی تھا۔ وہ نقشے پر انگلی رکھ کر مجھے جنوبی علاقے کے مشہور قصبات کا نام بتاتی گئی۔ لیکن میرے ساتھ قدرت کی ستم ظریفی سمجھ لیں کہ یا میری بدقسمتی یہ ہوئی تھی کہ مجذوب بزرگ نے کلفٹن کے ساحل پر مجھے جس گاؤں کا نام بتایا تھا' وہ میرے ذہن ہی سے نکل گیا تھا۔ کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ نام کیا ہے۔ سلومی نے نقشہ ایک طرف رکھ دیا۔ کہنے لگی:

"ہو سکتا ہے جس گاؤں میں تمہارا دوست رہتا ہے اس کا نام نقشے میں درج نہ کیا گیا ہو، اس لئے بہتر ہے کہ اخبار میں تمہارے دوست کے نام ایک اشتہار چھپوا دیتے ہیں کہ تم پیرس کے اس ہوٹل میں ہو۔ یہاں گاؤں میں بھی اخبار جاتے ہیں اور لوگ اخبار ضرور پڑھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے تمہارے دوست کی نظر سے یہ اشتہار ضرور گزرے گا اور وہ تم سے رابطہ پیدا کرے گا۔"

مَیں جانتا تھا کہ اشتہار چھپوانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ چنانچہ مَیں نے سلومی کو منع کر دیا اور کہا کہ مَیں خود اس علاقے میں جا کر مطلوبہ گاؤں تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ سلومی نے کہا:

"تم یہاں بالکل اجنبی ہو اور تمہیں یہاں کی زبان بھی نہیں آتی۔ کسی سے کیا پوچھو گے۔"

مَیں نے کہا: "اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ بھی تو نہیں ہے؟"

"تو پھر میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔ مَیں کالج سے چھٹی لے لوں گی۔"

سلومی کے ایثار سے میں بہت زیادہ متاثر ہوا۔ مَیں نے اسے روکنے کی کوشش بھی کی لیکن وہ نہ مانی اور ہم اگلے روز دوپہر کے بعد ایک ٹرین کے ذریعے فرانس کے جنوبی ساحل شہر مارسیلز کی جانب روانہ ہو گئے۔

مارسیلز میں ہم ایک چھوٹے سے ہوٹل میں ایک رات ٹھہرے اور سلومی کے مشورے کے مطابق ہم ان دیہات کی طرف چل پڑے جو سمندر کے ساحل کے ساتھ واقع تھے۔ کیونکہ جس گاؤں کی مجھے تلاش تھی' سمندر اس کے قریب ہی تھا۔ تین دن تک ہم ساحلی دیہات میں بھٹکتے پھرے۔ کئی ایسے قلعے بھی دیکھے جو سمندر کے کنارے پر واقع تھے لیکن وہاں وہ سرو کے درختوں کا جھنڈ مجھے کہیں نہ ملا جہاں عرب شہید کی سرخ پتھروں والی قبر تھی۔ ہم تھک ہار کر مارسیلز کے شہر میں واپس آگئے۔ اس وقت میں نے فیصلہ کر لیا کہ مَیں کامنی کو بلا کر اس سے راہ نمائی حاصل کروں گا۔ کیونکہ یہ میری زندگی کا سب سے اہم مسئلہ تھا۔ ہم مارسیلز کے جس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے وہ معمولی درجے کا ہوٹل تھا پھر بھی کافی مہنگا تھا۔ مَیں نے کراچی میں فرانس کی کرنسی حاصل کر لی تھی۔ مَیں نے سلومی کو فرانسیسی لیرے دینے کی کوشش کی تاکہ ہم ہوٹل کے دو الگ الگ کمرے لے لیں مگر وہ نہ مانی۔ کہنے لگی:

"تمہارے سارے پیسے یہیں خرچ ہو جائیں گے۔ تمہیں یہاں قدم قدم پر پیسوں کی ضرورت پڑے گی۔ انہیں اپنے پاس رکھو اور پھر ایک کمرے میں رہنے میں کیا حرج ہے؟ یہاں ٹورسٹ لڑکے لڑکیاں اکثر ایک ہی کمرے میں ٹھہرتی ہیں۔"

چنانچہ اس نے ایک سنگل بیڈ کا کمرہ لے لیا تھا۔ میں رات کو صوفے پر سوتا اور سلومی بیڈ پر سو جاتی تھی۔ میں نے کامنی کو بلانے کا فیصلہ کیا تو سوچنے لگا کہ کامنی کو کس جگہ بلانا ٹھیک رہے گا۔ ہوٹل کے کمرے میں سلومی میرے ساتھ تھی۔ وہاں میں کامنی کو نہیں بلا سکتا تھا۔ آخر یہی سوچا کہ ہوٹل سے باہر کسی ویران جگہ پر چلا جاتا ہوں۔ سلومی اس وقت

نہانے کے بعد الماری کی اوٹ میں ہو کر لباس تبدیل کر رہی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ میں ذرا ٹہلنے باہر جا رہا ہوں۔ شروع رات کا وقت تھا۔ سلومی نے مجھے اکیلے باہر جانے سے منع کیا اور کہا:

"اس شہر میں رات کے وقت اکیلے باہر جانا ٹھیک نہیں۔ نیگرو غنڈے سیاحوں کی تاک میں ہوتے ہیں۔ وہ سیاحوں کو لوٹتے ہی نہیں جان سے بھی مار ڈالتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "میں زیادہ دور نہیں جاؤں گا۔ ہوٹل کے آس پاس ہی رہوں گا۔"

سلومی اپنا لباس درست کرتے ہوئے الماری کی اوٹ سے نکل کر میرے سامنے آ گئی۔ اس نے بڑا اشتعال انگیز لباس پہن رکھا تھا۔ سینہ آگے سے کافی کھلا تھا۔ میں کوشش کے باوجود اپنی نگاہیں دوسری طرف نہ کر سکا۔ میں کہنے لگا:

اگر تمہیں ضرور جانا ہے تو میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ سلومی کا یہ روپ میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ اس سے پہلے وہ بڑی پڑھاکو قسم کی دبلی پتلی لڑکی لگتی تھی لیکن اب وہ کسی نائٹ کلب کی ڈانسر معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے کہا:

"اچھا لباس ہے؟"

سلومی نے پرس کندھے پر ڈالتے ہوئے کہا:

"میں سخت بور ہو رہی ہوں۔ یہاں ایک کلب ہے۔ چلو وہاں چلتے ہیں۔ تم بہت انجوائے کرو گے۔"

میں کمرے میں ہی رہنا چاہتا تھا۔ کیونکہ مجھے کامنی کو بلانا تھا مگر سلومی نے میری بغل میں بازو ڈال دیا۔ اس کے جسم کی گرمی مجھے محسوس ہوئی تو میرے جسم کے وہ احساسات بیدار ہونے لگے۔ جنہیں اب تک مَیں نے دبا رکھا تھا یا وہ خود ہی میری المناک مصیبتوں کی وجہ سے دبے ہوئے تھے۔ سلومی مجھے اپنے ساتھ چلاتے ہوئے بولی:

"پلیز چلو ناں۔"

اس نے کچھ ایسے انداز میں یہ جملہ کہا کہ مَیں انکار نہ کر سکا۔ میرا جسم ویسے

سلومی کے جسم کی گرمی سے الگ نہیں ہونا چاہتا تھا۔ یہ ایک ایسا منفی اور شرانگیز جذبہ تھا' جس سے مجھے بچنا چاہیے تھا مگر کسی سیلاب کی طوفانی لہر نے میرے پاؤں اکھاڑ دیئے تھے اور میں کوشش کے باوجود سنبھل نہ سکا اور سلومی کے ساتھ چل پڑا۔ مارسیلز میں کئی مشرقی قومیتوں کے لوگ آباد تھے' جن میں افریقی نیگروز کی تعداد زیادہ تھی۔ یہاں کا موسم بھی پیرس کے مقابلے میں گرم تھا۔ مارسیلز میں کئی کلب تھے۔ یہ کلب ایسے نہیں تھے جیسے انگریزوں نے ہندوستان میں بنائے ہوئے تھے کہ جہاں صرف کلب کے رکن ہی جا سکتے تھے۔ یہ چھوٹے چھوٹے ریستوران تھے جہاں گوری اور نیگرو عورتیں ڈانس کرتی تھیں۔ ان کلبوں میں جانے کا کوئی ٹکٹ نہیں تھا۔ کوئی بھی جا سکتا تھا۔ صرف شرط یہ تھی کہ کلب میں بیٹھنے کے بعد چالیس پچاس فرانک کی بیئر یا وائن وغیرہ پینی پڑتی تھی۔ یہی کلب کا ٹکٹ تھا۔ جو بیئر یا وائن دکان پر چار پانچ فرانک میں مل جاتی تھی وہ ان کلبوں میں چالیس پچاس فرانک میں ملتی تھی۔ یہ مجھے کلب میں جانے کے بعد سلومی کی زبانی معلوم ہوا۔

کلب کی فضا میں سگریٹوں کا دھواں اور مختلف شرابوں کی بُو پھیلی ہوئی تھی۔ پہلے تو میرا جی گھبرانے لگا۔ مگر سلومی نے زبردستی یہ کہہ کر مجھے بیئر کا ایک گلاس پلا دیا کہ یہ شراب نہیں ہے' جَو کا پانی ہے۔ مَیں نے آج تک کبھی کسی نشے کو ہاتھ نہیں لگایا تھا لیکن سلومی کے نیم عریاں جسم اور اس کے جسم کی گرمی نے میری عقل پر پردہ ڈال دیا تھا۔ بیئر کے ایک گلاس نے میری پیاس کو اور بھڑکا دیا۔ اوپر سے سلومی خود بھی پی رہی تھی اور میرے گلاس میں بھی ڈالتی جاتی تھی۔ میں تین چار گلاس پی گیا۔ سامنے ایک چھوٹا سا سٹیج بنا ہوا تھا۔ سٹیج پر دو نیگرو عورتیں میوزک پر رقص کر رہی تھیں۔ میرے دیکھتے دیکھتے انہوں نے اپنے کپڑے اتار کر پھینکنے شروع کر دیئے۔

اُم الخبائث نے میرے جو شائستگی' خودداری اور بُرے بھلے کی تمیز کے جو اعلیٰ اخلاقی محاسن تھے اسے بے ہوش کر دیا تھا۔ یہاں مَیں اپنے پڑھنے والوں اور میری داستان الم سننے

والوں کو خاص طور پر پاکستان کی نوجوان نسل کو ہدایت نہیں کروں گا۔ نصیحت بھی نہیں کروں گا بلکہ خبردار کروں گا کہ وہ زندگی بھر کسی قسم کے نشے کے قریب بھی نہ جائیں۔ کیونکہ نشہ انسان کے کردار کو ہی تباہ نہیں کرتا بلکہ اسے معاشرے میں ذلیل و خوار کر دیتا ہے اور ایسے شخص کی کوئی عزت نہیں رہتی۔

کافی رات گزر چکی تھی، جب ہم اپنے ہوٹل میں واپس آئے۔ اس وقت مجھے یہ احساس تک نہیں تھا کہ مَیں گناہ کی دلدل میں ڈوبتا جا رہا ہوں اور اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھود رہا ہوں۔ رات کے پچھلے پہر جب اُمّ الخبائث کا نشہ کافی اتر گیا تو مجھے احساس ہُوا کہ مجھ سے بھیانک گناہ سرزد ہو گیا ہے۔ ایک ایسا گناہ کہ جس کی سزا شاید مجھے ساری زندگی بھگتنی پڑے۔ میرے پہلے گناہوں کا حساب بے باق نہیں ہوا تھا کہ مجھ پر ایک اور ناقابلِ معافی گناہ کا قرض چڑھ گیا تھا۔ مَیں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سلومی میرے پہلو میں بے سدھ پڑی تھی۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ مَیں نے اٹھ کر تھرمس میں سے گرم کافی نکال کر پی۔ ذرا طبیعت سنبھلی تو مَیں دروازہ کھول کر کمرے سے نکل گیا۔ آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ مَیں ہوٹل کے چھوٹے سے باغیچے میں ایک درخت کے پیچھے چلا گیا۔ مَیں نے کامنی کی دی ہوئی انگوٹھی کو تین بار اپنے بازو کے ساتھ رگڑا۔ کامنی ظاہر نہ ہوئی۔ مَیں نے ایک بار پھر کوشش کی۔ کامنی پھر بھی ظاہر نہ ہوئی۔ تیسری بار انگوٹھی رگڑنے کے بعد میں نے کچھ فاصلے پر باغیچے کی باڑھ کے پیچھے کامنی کو دیکھا۔ وہ خاموش کھڑی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ مَیں دوڑ کر اس کی طرف بڑھا۔ جیسے ہی میں باڑھ کے قریب پہنچا کامنی کا ہیولا غائب ہو گیا۔ اس کے بعد مَیں نے کئی بار انگوٹھی کو اپنے جسم کے ساتھ رگڑا مگر کامنی کو نہ آنا تھا اور نہ آئی۔

مَیں سمجھ گیا کہ وہ میرے گناہ آلود کردار کی وجہ سے مجھ سے شاید ہمیشہ کے لئے دور ہو گئی ہے۔ مَیں وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ میری یہ حالت تھی کہ مجھے خدا سے اپنے گناہ کی معافی مانگتے ہوئے بھی شرم آ رہی تھی۔ کیا منہ لے کر مَیں خدا سے معافی مانگوں گا۔ مَیں

انیت کی سطح سے گر چکا تھا۔ اب پچھتانے سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ مَیں جس ب العین کو لے کر گھر سے نکلا تھا وہ مجھ سے ہزاروں لاکھوں میل دور ہو گیا تھا۔ مَیں عذاب میں پہلے سے گرفتار تھا لگتا تھا کہ اب میں اس سے کبھی چھٹکارا حاصل نہ کر ں گا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے مگر اب میرے آنسو بھی بے سود تھے۔ پھر وہی جس کا مجھے دھڑکا لگا تھا۔ میں اٹھ کر کمرے مَیں واپس جانے لگا تو اچانک جیسے کسی نے پیچھے سے دھکا دیا اور میں گر پڑا۔ مجھے کسی نے دھکا نہیں دیا تھا بلکہ مجھے وہی منحوس لگا تھا جس کے بعد مجھ پر شیطانی طاقتوں نے حملہ کرنا تھا۔

مَیں جانتا تھا کہ تھوڑی دیر بعد میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ مَیں نے کمرے میں نے کی بجائے ہوٹل کے پچھلے گیٹ سے نکل کر کھیتوں کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ یہ ے کھیت نہیں تھے جیسے ہمارے دیہات میں ہوتے ہیں۔ یہ چوکور تختوں میں بٹے ہوئے یتوں کے تختے تھے، جن کے درمیان رات کی تاریکی اور ستاروں کی مدہم روشنی میں ب ڈھلوان چھت والا گودام سا نظر آ رہا تھا۔ مَیں اس گودام نما عمارت کی طرف بھاگا کہ ں کسی جگہ چھپ جاؤں مگر شیطانی طاقتیں میرے سر پر پہنچ گئی تھیں۔ یہ وہ منحوس یطانی طاقتیں تھیں، جنہیں مَیں نے خود بلایا تھا کہ آؤ اور مجھے برباد کرو۔ میری پاکبازی ر پارسائی داغ دار ہو گئی تھی۔ میں اپنے ہی گناہوں میں لتھڑا بھاگتا چلا جا رہا تھا کہ انک مجھے ایک اور جھٹکا لگا۔

میں لڑکھڑا گیا۔ سنبھل کر پھر دوڑ پڑا۔ گودام نما عمارت جانوروں کا باڑہ تھا، جہاں اس ت کوئی بھی جانور نہیں تھا۔ کونے میں مویشیوں کے چارے کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ھت پر ایک بجلی کا بلب روشن تھا۔ میں چارے کے ڈھیر کے اوپر بے دم ہو کر گر پڑا۔ را سانس پھول رہا تھا۔ مجھے اپنا جسم گرم ہوتا محسوس ہُوا۔ مَیں نے سر اٹھا کر اپنے ھوں کو دیکھا۔ میرے ہاتھوں پر سیاہ بال اُگ آئے تھے۔ مَیں نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ میرا چہرہ بالوں سے بھر گیا تھا اور کسی بن مانس کا چہرہ معلوم ہوتا تھا۔ میرے حلق

سے دہشت کے مارے چیخ نکل گئی۔ یہ کسی خونخوار جنگلی درندے کی چیخ تھی۔

اس کے بعد میری انسانی سوچ کا بلب فیوز ہو گیا۔

اب میں ایک خونخوار جانور تھا۔ مجھے انسانی خون کی بو کا احساس ہُوا۔ یہ کسی کنواری لڑکی کے میٹھے خون کی بُو تھی۔ اس بُو نے مجھے دیوانہ کر دیا۔ مَیں اٹھ کر گودام سے باہر نکل آیا اور جس طرف سے خون کی بُو آ رہی تھی' اس طرف چلنے لگا۔ مَیں جھک کر جانوروں کی طرح چل رہا تھا۔ میرے انسانی محسوسات ماؤف ہو چکے تھے۔ ان کی جگہ جانوروں کی جبلت بیدار ہو گئی تھی۔ رات کی تاریکی چاروں طرف تھی۔ دور دور مارسیلز شہر کی عمارتیں تھیں' جن میں روشنی ہو رہی تھی۔ میں تھوڑی دیر بعد رک کر جانوروں کی طرح منہ اِدھر اُدھر گھما کر انسانی خون کی بُو لیتا اور جس طرف سے بُو آ رہی تھی' اس طرف چلنے لگتا۔ مَیں نے دیکھا کہ مَیں ایک باغیچے میں آ گیا ہوں۔ یہ اسی ہوٹل کا باغیچہ تھا' جہاں میں سلومی کے ساتھ ٹھہرا ہُوا تھا۔ یہ سب کچھ مجھے بہت دھندلا دھندلا سا یاد آ تھا۔ میری انسانی یادیں گناہ اور عذاب کے اندھیروں میں گم ہو رہی تھیں۔ مَیں ہوٹل برآمدے میں ستون کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

کسی عورت کے میٹھے خون کی بُو سامنے والے کمرے سے آ رہی تھی۔ مَیں کمرے دروازے کی طرف بڑھا۔ مَیں نے دروازے کو دھکیلا۔ دروازہ کھلا تھا۔ مجھے بالکل نہیں تھا کہ مَیں ابھی ابھی اس کمرے سے نکل کر باہر گیا تھا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا بن مانس کی طرح جھک کر کمرے میں اِدھر اُدھر تکنے لگا۔ یہاں خون کی بو بڑی تیز دھیماں سرخ رنگ کا بلب روشن تھا۔ اس کی روشنی میں کمرے کی ہر شے سرخ ہو تھی۔ بستر پر ایک لڑکی گہری نیند سو رہی تھی۔ یہ سلومی تھی۔ ایک لمحے کے لئے ڈوبتی ہوئی انسانی حِس نے بتایا کہ یہ سلومی ہے جو شراب کے نشے میں بے سدھ ہے۔ اس کے بعد میں بالکل بھول گیا کہ یہ لڑکی میری دوست ہے۔ مَیں نے جھک کر کی گردن کو دیکھا جو سینے سے بھی نیچے تک بے لباس تھی۔ مجھے سرخ روشنی میں

ی ایک رگ دھڑکتی دکھائی دی۔ مَیں نے اپنے نوکیلے دانت اس رگ میں چبھو دیئے۔ ھے میٹھے خون کا ذائقہ محسوس ہُوا۔ جانے کتنی دیر تک مَیں آہستہ آہستہ خون پیتا رہا۔ ب طبیعت سیر ہو گئی تو مَیں نے سر پیچھے کر لیا۔ جیسے ہی مَیں نے سر پیچھے کیا، مَیں نے یکھا کہ سامنے والی دیوار میں شگاف نمودار ہو گیا ہے اور اس شگاف میں سے دھواں نکلنے لگ۔ پھر پاتالی چڑیل نمودار ہو گئی۔ اس کے بالوں بھرے جسم اور سر میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ ایک ہاتھ میں سانپ تھا اور دوسرے ہاتھ کے ساتھ چمگادڑ چمٹا ہُوا تھا۔ میرے پاؤں جیسے من من بھاری ہو گئے تھے۔ عجیب بات ہے۔ تب مجھے پاتالی سے خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

پاتالی نے ایک چیخ ماری اور فضا میں دس فٹ اوپر اٹھ کر اس نے کمرے کا ایک چکر لگایا۔ میرے سر کے اوپر آ کر اس نے سانپ اور چمگادڑ چھوڑ دیئے۔ میں قالین کے فرش پر کٹے ہوئے درخت کی طرح گر پڑا۔ میری گردن کی ایک طرف سانپ اور دوسری طرف چمگادڑ نے اپنے نوکیلے دانت گاڑ دیئے اور سلومی کا جو میٹھا خون میں نے پیا تھا وہ اسے پینے لگے۔ پاتالی چڑیل کمرے کی چھت سے تھوڑا نیچے تیر رہی تھی اور اس کے حلق سے دبی دبی ڈراؤنی چیخیں نکل رہی تھیں۔ پھر وہ ایک دم سلومی پر جھپٹی اور اس کی گردن میں اپنے نوکیلے دانت گاڑ دیئے۔ یہ خونی کھیل نہ جانے کتنی دیر تک جاری رہا۔ جب پاتالی چڑیل نے سلومی کی گردن پر سے منہ اٹھایا تو اس کے ہونٹ بلب کی سرخ روشنی میں اور سرخ اور خون کے رنگ کے ہو گئے تھے۔ چمگادڑ اور سانپ بھی میری گردن سے الگ ہو گئے۔ پاتالی چڑیل' نے دونوں بازو اوپر اٹھائے۔ سانپ اور چمگادڑ اس کے ایک ایک ہاتھ سے لگ کر چمٹ گئے۔ پاتالی چڑیل فضا میں تیرتی ہوئی میرے چہرے کے قریب جھک گئی۔ اس کے ہونٹوں سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ مَیں قالین پر ساکت حالت میں لیٹا اسے تک رہا تھا۔ پہلے مجھے اس سے دہشت ہُوا کرتی تھی خوف محسوس ہوتا تھا مگر اب یہ دہشت اور خوف مجھ سے الگ ہو چکے تھے۔ شاید مَیں خود بھی شیطانی طاقتوں کا ایک حصہ

بن چکا تھا۔ اب شاید مجھ میں اور کسی شیطانی چڑیل میں کوئی فرق نہیں رہا تھا۔

پاتالی چڑیل نے میری طرف گھورتے ہوئے ایک ڈراؤنا قہقہہ لگایا۔ اس قہقہے سے مَیں ضرور ڈر گیا۔ مَیں نے آنکھیں بند کر لیں۔ پاتالی چڑیل آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگی۔ اس کے جسم سے نکل کر جتنا دھواں کمرے میں جمع ہو گیا تھا وہ اس کے جسم میں بڑی تیزی سے واپس جا رہا تھا۔ پاتالی نے اپنی انگارہ ایسی سرخ آنکھوں سے مجھ پر ایک الوداعی نظر ڈالی۔ سر اوپر کو جھٹک کر حلق سے ایک چیخ کی آواز نکالی اور دیوار کے شگاف میں گھس گئی۔ اس کے غائب ہوتے ہی دیوار کا شگاف بھی غائب ہو گیا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ مَیں قالین کے فرش پر سیدھا پڑا ہُوا ہوں۔ میرا جسم بھاری ہو گیا تھا۔ پھر میرا جسم ہلکا ہونا شروع ہو گیا۔ مَیں جلدی سے اٹھا۔ بستر پر سلومی کی گردن پر جو چھوٹے سوراخ نمودار ہوئے تھے ان پر خون جم گیا تھا۔ مجھے کچھ کچھ یاد آنے لگا کہ یہ لڑکی میری جانی پہچانی ہے۔ میری انسانی حسیات واپس آنے لگی تھیں۔ سلومی نے منہ سے ہلکی سی آواز نکال کر پہلو بدلا تو مَیں جلدی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ مجھے اتنا احساس ہو گیا تھا کہ اس حالت میں مجھے سلومی سے دور ہو جانا چاہیے۔

برآمدہ رات کی خاموشی میں خالی پڑا تھا۔ میں دوڑ کر باغیچے میں آ گیا۔ مجھ پر ایسی حالت طاری ہونا شروع ہو گئی تھی، جیسے میرے اندر جو قیامت خیز سیلاب آیا تھا وہ آہستہ آہستہ اتر رہا ہے۔ اب مجھے پوری طرح یاد آ گیا تھا کہ مَیں سلومی کے ساتھ رات کلب میں گیا تھا اور پچھلے پہر کو پاتالی چڑیل نے مجھ پر حملہ کیا تھا اور میں جس عذاب سے نجات کے واسطے کامنی کے مشورے پر کراچی کے مجذوب بزرگ کی خدمت میں حاضر ہُوا تھا اور پھر جس مقصد کے حصول کی خاطر میں مجذوب بزرگ کی ہدایت پر فرانس میں بطور سیاح وارد ہُوا تھا وہ مقصد مجھ سے مزید لاکھوں میل دور ہو گیا ہے اور میں عذاب کی دلدل میں اور بھی دھنس گیا ہوں۔ میں نے اپنے چہرے پر دونوں ہاتھ پھیر کر دیکھا، میرا چہرہ ابھی تک اسی طرح وحشی درندے کے بالوں سے بھرا ہُوا تھا۔ میرے نتھنے جانوروں جیسے ہی تھے

ہاتھوں پر بھی بال تھے اور میرے ناخن چھریوں کی طرح باہر نکلے ہوئے تھے۔ میرا انسانی شعور واپس آ چکا تھا اور مَیں جانتا تھا کہ مَیں جس شکل میں ہوں، اس شکل میں میرا انسانوں کے قریب رہنا بے حد خطرے کا باعث بن سکتا تھا۔ مجھے وحشی درندہ سمجھ کر کوئی بھی مجھے شوٹ کر سکتا ہے۔ مَیں نے جانور کی طرح باغیچے کی باڑ پھلانگی اور فارم کے کھیتوں کی طرف دوڑ پڑا۔

کھیت میں ایک جگہ کسان ٹریکٹر چلا رہا تھا۔ اس وقت سپیدۂ سحری چاروں طرف نمودار ہو چکا تھا۔ مَیں دوسرے کھیت کی طرف بھاگا، وہاں ابھی فصل اگائی جا رہی تھی۔ میرے چھپنے کے لئے کوئی آڑ نہیں تھی۔ میں انسانوں کی طرح نہیں دوڑ رہا تھا بلکہ کسی وحشی درندے کی طرح اچھل اچھل کر بھاگ رہا تھا۔ ٹریکٹر کے پیچھے ایک اور آدمی چلا آ رہا تھا۔ اس کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ وہیں کھڑے ہو کر مجھے حیرت سے دیکھنے لگا۔ میں دوڑتا چلا گیا۔ سامنے ایک کشادہ سڑک آ گئی۔ یہ ہائی وے تھی۔ اس پر ٹرک اور ٹریلر وغیرہ چل رہے تھے۔ مَیں نے بھاگ کر سڑک عبور کی اور ایک دیوہیکل ٹرک کی زد میں آتے آتے بچا۔ دن کی روشنی کافی ہو گئی تھی۔ سامنے ایک تین چار منزلہ عمارت تھی۔ ایک طرف سے تین لڑکے سائیکلوں پر سوار اچانک نکل کر میرے سامنے آ گئے۔ انہوں نے مجھے دیکھا تو ڈر کر سائیکلیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ایک لڑکا ہمت کر کے میری طرف آیا۔ مَیں جلدی سے سامنے والی عمارت میں گھس گیا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ عمارت کیسی ہے۔ وہ کوئی ہیلتھ سنٹر تھا۔ مَیں ایک راہ داری میں تھا، جس کی دونوں جانب کمروں کے دروازے بند تھے۔ مجھے اپنے پیچھے آدمیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ لوگ میرے پیچھے آ رہے تھے۔ مَیں ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اندر گھس گیا۔ اندر ایک مریض بستر پر لیٹا شاید سو رہا تھا۔ ایک سفید کپڑوں والی نرس اس کے پاس کرسی پر بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ نرس نے چونک کر مجھے دیکھا تو اس کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ کتاب اس کے ہاتھ سے گر پڑی اور وہ پلنگ کی دوسری طرف جا کر دیوار کے ساتھ لگ کر کانپنے لگی۔ مَیں کمرے

سے باہر نکل کر راہ داری میں سامنے کی طرف دوڑنے لگا۔ لوگوں کی آوازیں میرے پیچھے قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھیں۔

سامنے ایک کمرے کا دروازہ دیکھا تو میں اس کمرے میں گھس گیا۔ یہ کمرہ خالی تھا۔ الماری میں دوائیوں کی شیشیاں اور ڈبے رکھے ہوئے تھے۔ مَیں نے دروازے کو کنڈی لگا دی اور کونے میں پڑے ہوئے سٹریچر کے نیچے چھپ گیا۔ خوش قسمتی سے عین اس وقت مجھے ایک جھٹکا لگا۔ مَیں سمجھ گیا کہ میں انسانی شکل میں واپس آنے لگا ہوں۔ مَیں نے اپنا چہرہ گھٹنوں میں چھپا لیا۔ دوسرا اور پھر تیسرا جھٹکا لگا۔ کمرے میں ایک بلب روشن تھا۔ تیسرے جھٹکے کے بعد میرا جسم جیسے ہلکا ہو گیا۔ مَیں نے ڈرتے ڈرتے چہرہ اٹھا کر اپنے ہاتھوں پر نگاہ ڈالی۔ میرے ہاتھوں کے بال اور نوکیلے ناخن غائب ہو گئے تھے۔ مَیں نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ میرے چہرے کے بال بھی غائب ہو گئے تھے۔ مَیں جلدی سے اٹھ کھڑا ہُوا۔ الماری کے شیشے پر جھک کر مَیں نے اپنا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔ مجھے تھوڑا تھوڑا اپنے چہرے کا عکس نظر آ رہا تھا۔ مَیں اپنی انسانی شکل میں واپس آ گیا تھا۔ مَیں نے جلدی سے دروازے کی کنڈی اتار دی اور باہر نکل گیا۔ باہر تین چار نرسیں اور سفید کپڑوں والے ڈاکٹر اور وہی لڑکے جو سائیکلوں پر آ رہے تھے اور مجھے دیکھ کر ڈر کر بھاگ گئے تھے راہ داری میں دروازے کے باہر جمع تھے۔ جیسے ہی مَیں دروازہ کھول کر باہر نکلا سب ڈر کر پیچھے ہٹ گئے۔

جب انہوں نے کمرے میں سے ایک عام شکل صورت والے انسان کو باہر آتے دیکھا تو میرے قریب آ گئے۔ دو تین آدمی کمرے میں گھس گئے وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ ابھی ابھی جو ایک درندہ نما آدمی کمرے میں گھسا تھا وہ کہاں چھپا ہُوا ہے۔ یہ لوگ فرانسیسی زبان میں مجھ سے کچھ دریافت کرنے لگے۔ مَیں ان کی زبان نہیں سمجھ رہا تھا مگر اتنا معلوم تھا کہ وہ کمرے میں گھسنے والے درندے کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔ میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے انگریزی میں کہا:

اور مَیں عمارت کے بڑے دروازے کی طرف چلنے لگا۔ کسی کو میرے پیچھے آنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی کیونکہ جس انسان نما جانور یا جانور نما انسان کی انہیں تلاش تھی وہ مجھ سے جدا ہو چکا تھا۔ مَیں وہاں سے سیدھا ہوٹل میں آ گیا۔ کمرے کا دروازہ اَدھ کھلا تھا۔ مَیں نے اندر آ کر دیکھا۔ سلومی اپنے بستر پر نہیں تھی۔ باتھ روم میں سے پانی کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ مَیں نے جلدی سے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آ کر آئینے میں دیکھا۔ مَیں بالکل ٹھیک تھا۔ مَیں اپنی اصلی شکل صورت میں واپس آ چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ میری عقل بھی واپس آ گئی تھی۔ لیکن اب اس عقل کی حالت کسی شکست خوردہ سپاہی کی طرح تھی۔ مَیں اپنی عقل سے اور عقل مجھ سے، ہم دونوں ایک دوسرے سے آنکھیں چار کرتے ہوئے گھبرا رہے تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے شرمندہ تھے۔ لیکن میں زیادہ شرمسار تھا۔ مَیں زیادہ نادم تھا کیونکہ مَیں نے عقل سے بے وفائی کی تھی، عقل کو بدنام کیا تھا اور عین اس وقت عقل کا ساتھ چھوڑ دیا تھا جب عقل کو ساتھ رکھنے کی اشد ضرورت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ سب سے زیادہ نقصان بھی مجھے پہنچا تھا۔ مَیں پہلے ہی ناقابلِ تلافی نقصان کی زد میں تھا۔ رات والے گناہ کے بعد مَیں پہلے سے بھی زیادہ ذلت آمیز پستی کی گہرائیوں میں گر چکا تھا۔

سلومی اپنے آدھے جسم کو تولیے میں لپیٹے باتھ روم سے باہر آئی تو مجھے میرے گناہوں کے پچھتاوے کچوکے لگانے لگے لیکن اس عورت کا اتنا قصور نہیں تھا۔ ایک طالب علم اگر امتحان میں فیل ہو جائے تو وہ اپنی ناکامیابی کا الزام اور اپنی ناکامیابی کی ذمے داری امتحانی سوالات کے پرچے پر نہیں ڈال سکتا۔ سوالات کا پرچہ تو طالب علم کی لیاقت کو پرکھنے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ اصل قصور طالب علم کا اپنا ہے، جس نے اپنا وقت غفلت میں گزارا اور یہ کبھی نہ سوچا کہ اسے پڑھائی بھی کرنی چاہیے کیونکہ ایک دن اس کا امتحان لیا جائے گا۔ سلومی میرے امتحان کا ایک پرچہ تھا، جس کو مَیں الزام نہیں دے سکتا

تھا۔ قصور میرا تھا جو اس وقت غافل ہو گیا اور عقل سے کام نہ لیا' جس وقت بیدار رہنے اور عقل سے کام لینے کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ خدا نے انسان کو عقل اسی لئے عطا فرمائی ہے کہ وہ انسانیت کے ضابطۂ اخلاق کی حفاظت کرے اور انسان برائی اور بھلائی' نیکی اور بدی میں تمیز کر سکے۔ جس آدمی نے عقل کا ساتھ چھوڑ دیا اس میں اور جانور میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ بلکہ جانور پھر بھی تھوڑی بہت عقل سے کام لے لیتا ہے۔ انسان تو جب گرنے پر آتا ہے تو جانور سے بھی کئی درجے نیچے گر جاتا ہے۔

میں ان ذلتوں کی گہرائیوں میں گرنے کے بعد پستیوں کا عذاب جھیل چکا ہوں۔ اس لئے میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ اپنے آپ کو ان ذلتوں سے ہمیشہ محفوظ رکھیں اور عقل کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑیں اور اپنی زندگی کو جہنم نہ بنائیں بلکہ اسے بہشت بنانے کی کوشش کرتے رہیں۔ یہ بات کبھی نہ بھولیں کہ خدا آپ کی ہر حرکت کو دیکھ رہا ہے اور آپ اپنے ہر فعل کے اس کے حضور جواب دہ ہیں اور آپ کو اپنے گناہوں کی سزا بھگتنی ہی پڑے گی۔

سلومی نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ میرا مسکرانے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن میں بادلِ نخواستہ ذرا سا مسکرا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ سلومی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر بالوں میں برش پھیرتے ہوئے بولی:

"تم کہاں چلے گئے تھے؟"

میں نے کہا۔ "یونہی باہر کھلی ہوا میں نکل گیا تھا۔"

ڈریسنگ ٹیبل میرے قریب ہی تھا۔ سلومی کی گردن ننگی تھی۔ اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہاں مجھے کسی چمگادڑ' کسی سانپ کے دانتوں کے نشان دکھائی نہ دیئے۔ یہ بھی ایک طلسم ہی تھا کہ دن کے وقت دانتوں کے نشان غائب ہو جاتے تھے۔ اب میں اس لڑکی کے ساتھ نہیں رہنا چاہتا تھا۔ میں اس سے الگ ہو جانا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ سلومی مجھ سے الگ ہونا گوارا نہیں کرے گی اور اس کی یہی کوشش ہوگی کہ میرے ساتھ ہی رہے

میں نے اسے بتائے بغیر اس سے الگ ہونے کا سوچ لیا۔ اب تک سارا خرچ سلومی ہی اٹھا رہی تھی اور میرے پاس فرانس کی کرنسی میں اتنی رقم تھی کہ میں پیرس ایسے مہنگے شہر میں بیس پچیس دن رہ بھی سکتا تھا اور بحری جہاز کا کرایہ خرچ کر کے واپس بھی جا سکتا تھا۔

مگر مجھے پیرس نہیں جانا تھا۔ میری زندگی کا ایک ہی مقصد رہ گیا تھا اور میری نجات کا واحد راستہ بھی یہی تھا کہ جس طرح سے بھی ممکن ہو شہید کی قبر تلاش کروں اور وہاں دعائے فاتحہ پڑھوں اور پھر قبلہ رو ہو کر خدا کے حضور سجدہ ریز ہو جاؤں اور روتا رہوں۔ روتا رہوں۔ بس!

سلومی اٹھ کر کمرے میں رکھی ہوئی سٹینڈ والی سکرین کے پیچھے جا کر کپڑے بدلنے لگی۔ کہنے لگی:

"آہ ہم ہسپانوی ریستوران میں بیٹھ کر لنچ کریں گے۔ اس کے بعد میں تمہیں ایک اٹالین کلب میں لے چلوں گی۔ مائی گاڈ! اس کلب کے ڈانس دیکھ کر تم نیگرو ڈانسر لڑکیوں کو بھول جاؤ گے۔"

سلومی کی آواز میرے کان ضرور سن رہے تھے لیکن میں اس کے الفاظ یوں سمجھ لیں کہ بالکل نہیں سن رہا تھا۔ میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ میں اسی ہوٹل سے سلومی سے الگ ہو جانا چاہتا تھا اور میں نے اس کا فیصلہ بھی کر لیا تھا۔ میرا سامان تو کچھ نہیں تھا۔ چھوٹے سے اٹیچی کیس میں ایک دو جوڑے کپڑوں کے تھے یا شیو وغیرہ کا سامان تھا۔ میں نے کارڈرائے کی مٹیالے رنگ کی پتلون اور کارڈرائے کی جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ یہ ایسا لباس تھا جو بغیر دُھلے یورپ ایسے ملک میں جہاں گرد بالکل نہیں اڑتی' مہینوں چل سکتا تھا۔ موسم بھی سرد نہیں تھا۔ فرانس کے جنوب کا علاقہ تو مئی جون میں کافی گرم ہو جاتا ہے۔ فرانسیسی کرنسی یعنی فرانک جو دس دس اور پچاس پچاس کے نوٹوں کی شکل میں تھے میری قمیض کی جیب میں تھے۔ اس علاقے سے میں کافی واقف ہو چکا تھا۔

سلومی سکرین کے پیچھے کپڑے بدل رہی تھی اور باتیں بھی کئے جا رہی تھی۔ میں نے

اٹیچی اٹھایا اور دبے پاؤں کمرے سے نکل گیا۔ ہوٹل کے باہر آکر میں نے ریلوے سٹیشن کا رخ کرلیا۔ نقشے پر میں نے اس صوبے کا ساحلی علاقہ ذہن نشین کرلیا تھا۔ میں اپنے طور پر اس گاؤں کو تلاش کرنا چاہتا تھا جہاں سرخ پتھروں والی عرب مسلمان شہید کی قبر تھی۔ اس کی سب سے اہم نشانی یہ تھی کہ گاؤں کے قریب سمندر کے کنارے ایک قدیم رومن قلعہ تھا اور جہاں شہید کی قبر تھی' وہاں سرو کے درختوں کے جھنڈ تھے۔ میری عافیت اب اسی میں تھی کہ شہید کی قبر تلاش کروں۔ کراچی والے مجذوب بزرگ کی ہدایت کے مطابق وہاں فاتحہ پڑھوں اور اگر میری خوش نصیبی سے شہید کی روح کی زیارت ہو جائے تو اس کی ہدایت کے مطابق عمل کروں۔ شاید اس طرح سے مجھے اس عذاب سے نجات حاصل کرنے کا کوئی راستہ مل جائے جو ایک آسیب بن کر مجھ سے چمٹا ہوا تھا۔ امید کی یہی ایک دھندلی سی روشنی باقی رہ گئی تھی۔

جو نقشہ مجھے سلومی نے دکھایا تھا اس پر آرلس نام کے ایک قصبے کا نام میں نے یاد کرلیا تھا۔ یہ قصبہ ساحل سمندر سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔ یورپ کے دوسرے شہروں کی طرح فرانس کے مضافاتی علاقوں میں بھی لوکل قسم کی ٹرینیں صبح سے رات گئے تک چلتی رہتی تھیں۔ مجھے آرلس جانے والی ایک ٹرین مل گئی۔ میں اس میں سوار ہوکر تین گھنٹے کے سفر کے بعد آرلس نام کے قصبے میں پہنچ گیا۔ یورپ کے قصبے ہمارے ملک کے مقابلے میں بہت ترقی یافتہ ہوتے ہیں اور ہمارے قصبوں سے بالکل ہی مختلف ہوتے ہیں۔ وہاں کے قصبے بھی ماڈرن شہروں کا ایک حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان قصبوں میں ریستوران ہوتے ہیں' بار ہوتے ہیں۔ پوسٹ آفس' تار گھر' پولیس سٹیشن' ہسپتال' شاپنگ سینٹر اور سستے ہوٹل ہوتے ہیں' جن میں ہر قسم کی جدید سہولیات میسر ہوتی ہیں۔ فرانس میں خاص طور پر زبان کا بڑا مسئلہ تھا۔ وہاں کے لوگ انگریزی کم جانتے ہیں اور جو انگریزی بول سکتے ہیں وہ بھی انگریزی بولنے سے گریز کرتے ہیں اور اپنی قومی زبان فرانسیسی ہی کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن میں کچھ فرینچ اور باقی انگریزی کے لفظ بول کر اپنا

مطلب سمجھا دیتا تھا۔ آرلس کا قصبہ نیم پہاڑی علاقے میں تھا۔ گول گول چھوٹے پتھروں سے بنی ہوئی سڑکیں تھیں۔ چند ایک محراب دار پرانے رومن زمانے کے دروازے بھی تھے جن کے نیچے سے ٹریفک گزرتی تھی۔ بڑا پرسکون قصبہ تھا۔ آبادی مختصر سی تھی۔ سرخ ڈھلوانی چھتوں والے کاٹیج نما مکان وادی میں جگہ جگہ نظر آرہے تھے۔ ایسے ریستوران بھی تھے جن کے باہر فٹ پاتھ پر کرسیاں بچھی تھیں اور لوگ وہاں بیٹھ کر کافی وغیرہ پی رہے تھے۔

ایک چھوٹے سے دو منزلہ ہوٹل میں مجھے سستا کمرہ مل گیا۔ کمرے میں ایک آہنی پلنگ تھا جس پر بستر اور کمبل لگا تھا۔ باتھ روم کمرے کے ساتھ ہی تھا۔ ٹیلی فون بھی موجود تھا۔ ٹیلی فون کی ڈائریکٹری میں مجھے آرلس کے آس پاس کے علاقے کا ایک نقشہ مل گیا۔ اس نقشے سے مجھے معلوم ہوا کہ قصبے سے جنوب مشرق کی طرف سمندر ہے اور وہاں تین گاؤں ایسے ہیں جہاں رومن عہد کے پرانے قلعے موجود ہیں۔ میں نے ان گاؤں کی طرف جانے کا فیصلہ کیا۔ مطلع صاف تھا' موسم خوشگوار تھا۔ میں نے ہوٹل کے چھوٹے سے ڈائننگ روم میں بیٹھ کر تھوڑا سا کھانا کھایا اور کاؤنٹر پر جاکر ہوٹل کے مینیجر کو کچھ فرینچ اور کچھ انگریزی میں بتایا کہ میں ٹورسٹ ہوں اور علاقے کی سیاحت کو جاتا ہوں۔ ہو سکتا ہے میں رات کو نہ آسکوں۔ مینیجر کو یہ بتانا ضروری تھا۔ آرلس کے سٹیشن پر پہنچ کر میں نے مطلوبہ دیہات کے بارے میں انکوائری کلرک سے مزید معلومات حاصل کیں۔ معلوم ہوا کہ صرف ایک گاؤں تک ریل جاتی ہے۔ اس کے آگے مجھے پیدل یا اگر کوئی ٹیکسی مل گئی تو ٹیکسی کے ذریعے سفر کرنا ہوگا۔

میں نے اس گاؤں کا ٹکٹ لے لیا جہاں سے ریل ساحلی علاقے کو چھوڑ کر اندرونی علاقے کی طرف مڑ جاتی تھی۔ ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد ٹرین نے مجھے گاؤں کے چھوٹے سے سٹیشن پر پہنچا دیا۔ یہ پہلا گاؤں تھا۔ اس کے آگے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر باقی کے دو گاؤں تھے۔ یہ تینوں گاؤں سمندر کے قریب واقع تھے۔ ان تینوں گاؤں کے باہر

قدیم تاریخی قلعے تھے۔ یہاں مجھے یورپ کے ملکوں سے آئے ہوئے سیاح مل گئے، جو
تاریخی قلعے کو دیکھنے جا رہے تھے۔ میں بھی ان کی پارٹی میں شامل ہو گیا۔ محکمۂ سیاحت کی
بس ہمیں قلعے کے دروازے تک لے گئی۔ مجھے قلعہ نہیں بلکہ یہ دیکھنا تھا کہ قلعے اور
گاؤں کے درمیان کے درختوں کا جھنڈ کس جگہ پر ہے، جہاں شہید کی قبر ہے۔ کچھ دوری
پر گاؤں کے لال چھتوں اور سفید دیواروں اور سبز دروازوں والے مکان نظر آ رہے تھے۔
میں قلعے کی سیدھ میں گاؤں کی طرف چل پڑا۔ گاؤں میں اور کھیتوں میں سرو اور سائبرس
کے درخت ضرور تھے مگر اکیلے اکیلے کھڑے تھے۔ ان کا کوئی جھنڈ کہیں نہیں تھا۔ میں
نے گاؤں اور قلعے کے درمیان کا سارا علاقہ چھان مارا۔ مجھے سرو کے درختوں کا کوئی جھنڈ
اور شہید کی سرخ پتھروں والی قبر کہیں نہ ملی۔ میں نے وہیں سے ایک پرانی سی ٹیکسی پکڑی
اور اگلے گاؤں میں آ گیا۔ یہاں بھی سمندر کے کنارے ایک قدیم قلعہ تھا۔ قلعے کے
درمیان ڈھلان پر گیہوں کے کھیت دھوپ میں لہلہا رہے تھے۔ سرو کے درختوں کا جھنڈ
یہاں بھی نہیں تھا۔ اسی طرح میں نے تیسرا گاؤں بھی دیکھ لیا۔ وہاں بھی مجھے مایوسی ہوئی۔
مجبوراً شام کے وقت میں آرلس قصبے کے ہوٹل میں واپس آ گیا۔ رات کو کھانا کھا کر پلنگ
پر لیٹ گیا۔ خیال آیا کہ کامنی کو ایک بار پھر بلانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہو سکتا ہے
معاملے کی سنگین نوعیت کا احساس کرتے ہوئے کامنی مجھے مشورہ دینے اور میری راہنمائی
کرنے کے لئے آ جائے۔

میں نے کمرے کی چٹخنی اندر سے لگا لی اور کامنی کی دی ہوئی چاندی کی انگوٹھی کو تین
بار اپنے جسم کے ساتھ لگا کر رگڑا۔ کامنی ظاہر نہ ہوئی۔ ایک بار پھر کوشش کی، پھر بھی کچھ
نہ ہُوا۔ تین چار مرتبہ کوشش کرنے کے بعد بھی کامنی ظاہر نہ ہوئی۔ پہلے وہ مجھے دور سے
نظر آ گئی تھی۔ اب ایسا بھی نہ ہُوا تو میں سمجھ گیا کہ کامنی بھی میرا ساتھ چھوڑ گئی ہے۔
اب سوائے اللہ کی ذات کے میرا کوئی مددگار نہیں تھا۔ تنہائی کا شدید احساس ہونے لگا۔
ایسے لگتا تھا کہ میں دنیا میں رنج و الم اٹھانے کے لئے اکیلا رہ گیا ہوں۔ یہ رنج و الم میرے

پیدا کئے ہوئے تھے۔ دوسروں کی لائی ہوئی مصیبتوں کا علاج تو ہو سکتا تھا لیکن جو
اپنے پاؤں پر خود کلہاڑا مارے اس کا کوئی علاج نہیں ہو سکتا۔ رات کسی نہ کسی طرح
گئی۔ اگلی صبح میں اللہ کے بھروسے اگلے دیہات کی دربدری کرنے کے لئے نکل کھڑا
ان دیہات میں ایک بات بڑی اچھی تھی کہ ہر گاؤں میں رہنے کے لئے ہوٹل نہ
مگر سیاحوں کے لئے بنائے ہوئے ہوسٹل کا ایک آدھ کمرہ ضرور مل جاتا تھا۔ وہاں سے
کوئی ٹیکسی تو نہ ملی میں پیدل ہی چھوٹی سی مگر پختہ سڑک پر روانہ ہو گیا۔ سڑک کی
جانب کھیت تھے۔ کہیں کہیں ٹریکٹر چل رہے تھے، کہیں کٹائی ہو رہی تھی۔ چھوٹا سا
میں نے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ پیچھے سے ایک ٹرک آتا دکھائی دیا۔ میں سڑک کے
ے کھڑا ہو گیا۔ ٹرک ایک بوڑھا فرانسیسی چلا رہا تھا۔ اس نے ٹرک روک کر فرانسیسی
میں کچھ پوچھا۔ ظاہر ہے یہی پوچھا ہو گا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ میں نے آگے کی
اشارہ کر دیا۔ اس نے اشارہ کیا کہ ٹرک میں آ جاؤ۔ میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر
لیا۔ خدا جانے وہ اپنی زبان میں کیا کہتا رہا اور میں ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اسے کیا کہتا
بہرحال سفر جاری رہا۔ کافی دیر کے بعد ٹرک بائیں جانب ایک ٹیلے کے عقب میں گھوما
ے دور سمندر نظر آیا۔ سمندر کے کنارے ایک قلعہ بھی نظر آ رہا تھا۔ کہیں کہیں سرو
درختوں کے جھنڈ بھی تھے۔ میرے دل میں اُمید کی جو دھندلی سی شمع روشن تھی، اس
تیز ہو گئی۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ میں اپنی منزل پر آ گیا ہوں۔

سڑک کے کنارے دائیں جانب چھوٹی سی وادی میں ایک گاؤں بھی تھا۔ میں وہیں اتر
۔ گاؤں کی سڑکیں پختہ تھیں اور وہاں سیاحوں کے لئے ایک چھوٹا سا ہوسٹل بھی تھا۔
نے وہیں ایک تنگ سا کمرہ لے لیا۔ اٹیچی کیس کمرے میں رکھا اور گاؤں سے نکل کر
کی جانب چل پڑا۔ یہ علاقہ پہاڑی بھی تھا اور میدانی بھی تھا۔ کچھ فاصلے پر قلعے کے پہلو
ایک جگہ سرو کے درخت ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ
درختوں کی طرف بڑھا۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑا حوصلہ ہُوا کہ سرو کے درخت ایک چھوٹے

دائرے کی شکل میں تھے۔ کراچی کے مجذوب بزرگ نے شہید کی قبر کی یہی نشانی بتائی تھ
کہ وہاں سرو کے درخت دائرے میں اُگے ہوئے ہیں۔ مَیں امید و بیم کی کیفیت م
درختوں کے پاس آ کر رک گیا۔ درختوں کے درمیان جنگلی پودے اور جھاڑیاں اگی ہو
تھیں۔ میں جھاڑیوں اور پودوں کو ہٹاتے ہوئے شہید کی قبر تلاش کرنے لگا۔ آخر ای
جگہ مجھے جھاڑیوں کے نیچے سرخ پتھر کی ایک جھلک نظر آ گئی۔ میں نے جلدی جلد
جھاڑیوں کی شاخوں کو توڑ کر جگہ صاف کی تو دیکھا کہ زرد گھاس کے درمیان تین
چوکور سرخ پتھر لگے ہوئے تھے۔ پتھروں کا سرخ رنگ کئی جگہوں سے نسواری ہو گیا ت
ایک پتھر آدھا مٹی میں دھنسا ہُوا تھا۔

مجھے پورا یقین ہو گیا کہ یہی عرب مسلمان شہید کی قبر ہے۔

ں وہیں جھاڑیوں میں بیٹھ گیا۔
زرد گھاس کے خوشوں میں چھپے ہوئے سرخ پتھروں کو دیکھ رہا تھا۔ مَیں دعائے فاتحہ
چاہتا تھا مگر میں بغیر وضو کے تھا۔ جلدی سے اٹھا اور پانی تلاش کرنے لگا۔ یہی خیال
۔ سمندر قریب ہے، وہاں جا کر وضو کرتا ہوں۔ سمندر قلعے کی بلند دیو ہیکل پرانی
کے ساتھ پھیلی ہوئی چٹانوں میں اپنی موجوں کی جھاگ اڑاتا نظر آ رہا تھا۔ چٹانوں کے
ایک جگہ سمندر کا پانی جمع ہو گیا ہوا تھا۔ میں نے وہاں بیٹھ کر وضو کیا۔ واپس سرخ
کے پاس آیا اور ایک طرف کھڑے ہو کر سر جھکا دیا۔ ہاتھ اٹھا دیئے اور صدقِ دل
دعائے فاتحہ پڑھی۔ کراچی کے مجذوب نے کہا تھا کہ فاتحہ پڑھ کر خاموش اور ادب
ہیں بیٹھے رہنا۔ پھر شہید کی روح ظاہر ہو گی اور تمہارے دل میں یہ خیال ڈالے گی
جس عذاب میں مبتلا ہو اس سے کیسے نجات حاصل کر سکتے ہو۔
ں وہیں دو زانوں ہو کر بڑے ادب کے ساتھ بیٹھ گیا۔ میری نگاہیں سامنے کی طرف
۔ سامنے سرو کے درخت تھے۔ میں بے تاب نظروں سے مسلسل دیکھ رہا تھا۔ دس
منٹ گزر گئے۔ وہاں کوئی روح نمودار نہ ہوئی۔ معلوم نہیں مجھے ایسا کرنا چاہیے تھا
ا لیکن میں نے ہاتھ اٹھا کر ایک بار پھر فاتحہ پڑھی اور متلاشی نظروں سے چاروں
دیکھنے لگا۔

اس بار بھی شہید کی روح ظاہر نہ ہوئی۔ درخت خاموش کھڑے تھے۔ سمندر کی طرف
سے ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ قلعے کی چٹانوں کے ساتھ سمندری موجوں کے ٹکرانے کی
آواز مسلسل آ رہی تھی۔ میرا وہاں سے اٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا کہ
اگر وہاں سے مایوس ہو کر اٹھا تو پھر چاروں طرف میرے لئے سوائے مایوسی اور ناکامی کے
اور کچھ نہیں ہوگا۔ دل میں ایک بار یہ خیال بھی آیا کہ کہیں میں غلط جگہ پر تو نہیں آگیا
ہو سکتا ہے یہ شہید کی قبر نہ ہو۔ لیکن کراچی کے مجذوب بزرگ کے بارے میں مجھے یقین
تھا کہ انہوں نے جو کچھ کہا تھا سچ کہا تھا۔ ان کا کہا جھوٹ نہیں ہو سکتا۔ انہیں جھوٹ
بولنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ شہید کی قبر کا نشان ہی تھا۔ میں صحیح جگہ پر آچکا تھا مگر
میری بدقسمتی تھی کہ میرے نصیب میں شہید کی روح کی زیارت نہیں لکھی ہوئی تھی
میں نے سر جھکا کر آنکھیں بند کر لیں اور اللہ سے اپنی مغفرت اور گناہوں کی بخشش
دعائیں مانگنے لگا۔ ایسے محسوس ہوتا تھا کہ میرے بد اعمالی کی وجہ سے میرے واسطے تو
دروازہ بند ہو چکا ہے۔ بلکہ میرے گناہوں اور برے اعمال نے از خود توبہ کا دروازہ میرے
لئے بند کر دیا تھا۔

میں نے سوچا کہ شام کو ایک بار پھر آؤں گا۔ میں اٹھا اور مایوسی کے عالم میں قدم اٹھاتا
گاؤں کے ٹورسٹ ہوسٹل میں واپس آگیا اور اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیا۔ دوپہر کو
نیچے آکر تھوڑا بہت کھانا کھایا اور واپس کمرے میں چلا گیا۔ دل میں طرح طرح کے خیال آ
رہے تھے۔ ایک ایک سانس کے ساتھ میں اپنے گناہوں پر پچھتا رہا تھا۔ میں نے اپنی
قسمت خود خراب کی تھی۔ میں کسی کو دوش نہیں دے سکتا تھا۔ اندر ہی اندر پچھتاوے
اور ملال کی آگ میں جلتا رہا۔ جب دن ڈھل گیا' سورج غروب ہو گیا اور گاؤں کے مکانوں
اور کھیتوں پر شام کا اندھیرا اترنے لگا تو میں ہوسٹل سے نکل کر شہید کی قبر پر آگیا۔ ایک
بار پھر دل کی گہرائیوں کے ساتھ فاتحہ پڑھی اور درختوں کے آس پاس متلاشی نگاہوں سے
دیکھنے لگا۔ دن کا اجالا شام کے اندھیروں میں ڈھل رہا تھا۔ یہ بات میرے علم میں

تھی کہ جس وقت شہید کی روح ظاہر ہو گی تو ایک نورانی روشنی سی پھیل جائے گی۔ میری
آنکھیں اس نورانی روشنی کا انتظار ہی کرتی رہ گئیں اور مجھے بادلوں کے گرجنے کی دھیمی
سی آواز سنائی دی۔ یہ آواز قلعے کی چٹانوں سے سمندری موجوں کے ٹکرانے کے ہلکے ہلکے
شور کے درمیان ابھری تھی۔ میں نے پلٹ کر سمندر کی طرف دیکھا۔ سمندر میں دور
آسمان پر بجلی چمک کر لہرا گئی۔

میں اپنی جگہ پر خاموش بیٹھا شہید کی روح کے ظاہر ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ میں انتظار
میں ایسا محو ہوا کہ وقت گزرنے کا بالکل احساس نہ رہا۔ ایک جگہ آنکھیں بند کئے بیٹھے
بیٹھے مجھے اونگھ آگئی۔ جانے کتنی دیر میں اسی عالم میں دنیا و مافیہا سے بے خبر سر
جھکائے بیٹھا رہا ہوں گا کہ اچانک میرے اوپر ٹھنڈے پانی کے قطرے گرنے لگے۔ میں نے
چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا کہ میرے چاروں طرف رات کی تاریکی پھیل چکی
تھی۔ آسمان پر رہ رہ کر بجلی چمک رہی تھی۔ بادل دھیمی آواز میں گرج رہے تھے اور بونداباندی شروع ہو گئی تھی۔ میں جلدی سے اٹھا اور جھاڑیوں میں سے نکل رہا تھا کہ مجھے قلعے
کی جانب تاریکی میں روشنی سی دکھائی دی۔

میں وہیں ٹھٹھک کر رک گیا۔ روشنی ایک دائرے کی شکل میں تھی اور دائرے میں
سے کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ ایک دم مجھے خیال آیا کہ شہید کی روح ظاہر ہو رہی ہے۔
میں بڑی بے تابی سے روشنی کی طرف بڑھنے لگا۔ جیسے جیسے میں روشنی کے قریب ہو رہا تھا
روشنی کا دائرہ پھیلتا جا رہا تھا۔ میں قدیم قلعے کی دیو ہیکل دیوار کے پاس پہنچ گیا۔ روشنی
قلعے سے آگے سمندر کے اوپر چمک رہی تھی۔ میرے قریب ہی سمندر کی موجیں قلعے کی
دیوار والی چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر شور پیدا کر رہی تھیں۔ قلعے پر ہیبت ناک آسیبی تاریکی
چھائی ہوئی تھی۔ قلعے کو دیکھ کر ہی خوف آتا تھا۔ روشنی سمندر کی سطح سے اوپر ہو گئی' پھر
آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنے لگی۔ میں چند قدم چل کر ایک چٹان کے اوپر چڑھ کر
روشنی کو دیکھنے لگا۔

بوندا باندی اسی طرح ہو رہی تھی۔ مجھے اپنی جیکٹ کے بھیگنے کا کوئی خیال نہیں تھا۔ میں روشنی کو مسلسل دیکھ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ابھی اس روشنی میں سے شہید کی روح نمودار ہو گی اور میری راہنمائی کرے گی اور مجھے بتائے گی کہ میں اپنی اذیت ناک آسیبی بیماری سے کیسے چھٹکارا حاصل کر سکتا ہوں۔ روشنی کا دائرہ سمٹنے لگا۔ سمٹتے سمٹتے وہ سرخ رنگ کا ایک شعلہ بن گیا۔ یہ شعلہ سمندری ہواؤں اور ہلکی بارش میں بالکل ساکن اور ساکت فضا میں جیسے جم گیا تھا۔ میں نے دل میں کہا: اے شہید کی مقدس روح میرے قریب آ کر میری رہنمائی کر ———— شعلے میں تحرک پیدا ہوا۔ وہ لہرانے لگا۔ پھر وہ دوبارہ گول دائرے کی شکل میں واپس آگیا اور اس کی روشنی میں مَیں نے دیکھا کہ کھلے سمندر کی اوپر نیچے ہوتی موجوں پر ایک کشتی میری طرف آ رہی ہے۔ میں چٹان سے نیچے اتر آیا۔ کشتی میری طرف چلی آ رہی تھی۔ جب قریب آئی تو دیکھا کہ ایک سیاہ پوش آدمی اسے چپوؤں کی مدد سے چلا رہا ہے۔ میں اپنی جگہ پر بت بنا کشتی کو کنارے کی طرف آتے دیکھتا رہا۔ کشتی میرے قریب آ کر رک گئی۔ سیاہ پوش آدمی کی شکل دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اندھیری رات میں اس کا ہیولا سا ہی نظر آ رہا تھا۔ کشتی موجوں پر اوپر نیچے ہو رہی تھی۔

اچانک میرے کانوں میں ایک آواز آئی۔

"کشتی میں سوار ہو جاؤ۔"

یہ شہید کی روح کی آواز ہی ہو سکتی تھی۔ میں نے یہی سوچا اور آگے بڑھ کر کشتی میں بیٹھ گیا۔ کشتی کے سیاہ پوش ملاح نے اس کا رخ کھلے سمندر کی طرف موڑ دیا۔ اس وقت مجھے ایک خوف سا ضرور محسوس ہوا کہ میں اندھیری رات میں کھلے سمندر کی طرف ایک انجان آدمی کے ساتھ جا رہا ہوں۔ کسی نئی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں۔ پھر خیال آیا کہ شہید کی روح میری راہنمائی کر رہی ہے اور مجذوب بزرگ نے کہا تھا کہ شہید کی روح تمہاری راہنمائی کرے گی۔ کشتی کنارے سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ میرے کانوں میں جو

آواز آئی تھی' اس نے بڑی صاف اردو زبان میں مجھ سے بات کی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے سیاہ پوش ملاح سے پوچھا:

"محترم! ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

سیاہ پوش ملاح کی پشت میری طرف تھی اور وہ کشتی کے سرے پر بیٹھا کبھی دائیں طرف اور کبھی بائیں طرف چپو چلا رہا تھا۔ تیز ہواؤں کے شور میں سمندر کی موجیں کبھی کشتی کو اوپر اٹھاتی اور کبھی نیچے لے جاتی تھیں۔ کشتی چھوٹی سی تھی۔ میں نے کشتی کے ایک بانس کو دونوں ہاتھوں سے تھاما ہوا تھا۔ سیاہ پوش ملاح نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ میں سمجھا کہ تیز ہواؤں کے شور میں شاید اس نے میری بات نہیں سنی۔ میں نے دوبارہ ذرا اونچی آواز میں پوچھا:

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

سیاہ پوش ملاح نے میری طرف دیکھے بغیر بلند آواز میں "ہوں' ہوں—" کی دو بار آواز نکالی اور کوئی بات نہ کی۔ یہ آواز ایسی تھی کہ میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ کشتی کنارے سے بہت دور کھلے سمندر میں نکل آئی تھی اور قدیم قلعے کا سیاہ پوش ہیولا دور چھوٹا سا ہو گیا تھا۔ مجھ پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔ میری چھٹی حس نے جیسے مجھے آگاہ کر دیا کہ تم ایک بہت بڑی مصیبت کے منہ میں جا رہے ہو۔ سمندر کی موجیں تاریکی میں اوپر اٹھ اٹھ کر شور کے ساتھ کشتی سے ٹکرا رہی تھیں اور کشتی پہلے سے زیادہ ہچکولے لگانے لگی تھی۔

خیال آیا کہ سمندر میں کود جاؤں' لیکن خوفناک طوفانی سمندر کا شور اور ہیجان خیز موجوں کو دیکھ کر مجھے چھلانگ لگانے کا حوصلہ نہ ہوا۔ میں نے سیاہ پوش ملاح سے چیخ کر کہا:

"مجھے واپس کنارے پر لے چلو۔"

تب سیاہ پوش ملاح نے میری طرف گردن گھما کر دیکھا۔ اس کو دیکھتے ہی میرے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ سیاہ پوش ملاح انسانی ہڈیوں کا ایک پنجر تھا' جس کی کھوپڑی میں

آنکھوں کی جگہ دو سوراخ تھے۔ جس میں لال سرخ انگارے دہک رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی سیاہ پوش انسانی پنجر کشتی کے سرے پر بیٹھے بیٹھے غائب ہو گیا۔ اب میں تھا' کھلا طوفانی سمندر تھا اور ایک چھوٹی سی ہچکولے کھاتی کشتی تھی۔ میں نے جلدی سے چپو پکڑ لئے اور اپنے خوف کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کشتی کے چپو چلاتے ہوئے کشتی کو سنبھالنے میں لگ گیا۔ مگر وسیع و عریض ہیبت ناک طوفانی سمندر کے آگے ایک چھوٹی سی ڈونگا نما کشتی کی کیا حیثیت تھی۔ کشتی زیادہ ڈولنے لگی۔ پھر چپو میرے ہاتھ سے چھوٹ کر طوفانی موجوں میں غائب ہو گئے۔ مجھے ایسے لگا جیسے طوفانی موجوں نے چپو میرے ہاتھ سے چھین لئے ہوں۔ میں دونوں ہاتھوں سے کشتی کے کناروں کو پکڑ کر سر کو نیچے کر کے بیٹھ گیا۔

اچانک بارش تیز ہو گئی۔ بارش کے ساتھ سمندری طوفان میں بھی تیزی آ گئی۔ چیختی چلاتی موجیں کشتی کو کھلونے کی طرح اوپر نیچے اچھالنے لگیں۔ میں کشتی کے فرش سے چمٹ گیا۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ میں اب زندہ نہیں بچوں گا۔ کشتی الٹ جائے گی اور خونیں موجیں مجھے نگل لیں گی۔ یہ حالت پندرہ بیس منٹ تک ایسے ہی رہی۔ پھر اچانک کشتی کسی چیز سے ٹکرائی اور گول چکر لگانے لگی۔ میرے منہ سے خوف کے مارے چیخیں نکلنے لگی تھیں۔ کشتی دوسری مرتبہ کسی چیز سے ٹکرائی اور اس طرح رک گئی جیسے کسی جگہ پھنس گئی ہو۔ میں کشتی میں اوندھا ہو کر پڑا تھا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپایا ہوا تھا۔ جب کشتی رک گئی تو میں نے جلدی سے ہاتھ ہٹا کر دیکھا۔

اندھیرے میں مجھے کشتی کے اوپر ایک بہت اونچی دیوار کسی پہاڑ کی طرح جھکی ہوئی دکھائی دی۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے تکتا رہا۔ مجھے احساس ہوا کہ یہ کوئی پہاڑ نہیں ہے بلکہ کوئی بحری جہاز ہے جس کی دیوار میں سے باہر کو نکلی ہوئی ہک میں کشتی کا تختہ پھنس گیا ہے۔ میں نے اٹھ کر ہاتھ آگے بڑھا کر دیوار کو ٹٹولا۔ میرا ہاتھ جہاز کی دیوار کے ساتھ لٹکی ہوئی رسے کی سیڑھی سے ٹکرایا۔ میں نے جلدی سے رسے کی سیڑھی کو دونوں

وں سے مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا۔ طوفانی موجیں کشتی کو اوپر نیچے اچھال رہی تھیں اور
تی کا جو تختہ جہاز کے آہنی کنڈے میں پھنسا ہوا تھا' اس کے چرچرانے کی آوازیں آنے
تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ ٹوٹ جاتا میں نے اس کی سیڑھی پر پاؤں جمائے اور آہستہ
ستہ اوپر چڑھنے لگا۔ یہ کوئی بہت بڑا جہاز تھا۔ رسے کی سیڑھی دور اوپر تک چلی گئی تھی۔
دل میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ عین وقت پر اس نے مجھے بچا لیا تھا۔ یہ کوئی مسافر
ر جہاز لگتا تھا' جو طوفان کی وجہ سے وہاں لنگر ڈال کر رک گیا تھا۔

میں سیڑھی پر چڑھتا جہاز کے عرشے کے جنگلے کے پاس پہنچا تو مجھے جہاز کے ملاحوں کی
دوسرے کو پکارنے کی آوازیں آئیں۔ بارش کی وجہ سے یہ ملاح عرشے پر رکھے
ئے سامان کو شاید ایک جگہ سے اٹھا کر کسی محفوظ جگہ پر لے جا رہے تھے۔ انسانی
ازوں نے میرے دل سے سارا خوف دور کر دیا۔ قدرت کو مجھ پر رحم آ گیا تھا اور اس
مجھے واپس انسانوں کی دنیا میں پہنچا دیا تھا۔ میں جنگلے کو پکڑ کر ڈیک یعنی جہاز کے عرشے
ر گیا۔ رات کی تاریکی اور بارش میں مجھے عرشے پر کوئی ملاح نظر نہ آیا۔ شاید وہ لوگ
ے پر سے سامان اٹھا کر نچلی منزل کے ڈیک پر لے جا چکے تھے۔ اگرچہ جہاز کا لنگر سمندر
گرا ہوا تھا مگر سمندر میں طوفان کی وجہ سے جہاز اپنی جگہ آہستہ آہستہ ڈول رہا تھا۔
بارش میں ڈیک پر سے دوڑ کر سائبان کے نیچے آ گیا۔ یہاں سے زینہ نیچے اترتا تھا۔
نے اوپر سے جھانک کر دیکھا۔ نیچے مجھے مدھم سی روشنی دکھائی دی۔ میں زینہ اتر گیا۔
ایک تنگ راہ داری تھی' جس کے دونوں جانب کیبن تھے۔ روشنی راہ داری کی
ت پر لگے ہوئے بلب کی تھی۔ میں نے دیکھا کہ سبھی کیبنوں کے دروازے بند تھے۔
کیبن میں روشنی نہیں ہو رہی تھی۔ میں آگے چلتا گیا۔ جہاں راہ داری ختم ہوتی
وہاں سے پھر ایک زینہ نیچے اترتا تھا۔ یہاں مجھے نیچے سے دو آدمیوں کے باتیں کرنے
قہقہے لگانے کی آواز آئی۔ مجھے بڑا حوصلہ ہوا۔ میں نے اونچی آواز میں کہا:

"ہیلو! ہیلو!"

نیچے سے آوازیں آنا بند ہو گئیں اور سناٹا چھا گیا۔ میں نیچے اتر آیا۔ یہاں بھی ایک
تنگ راہ داری تھی۔ جہاں دھیمی روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ یہاں بھی آمنے سامنے
کیبن تھے جن کے دروازے بند تھے۔ ایک کیبن کا دروازہ ذرا سا کھلا تھا اور اندر سے
روشنی باہر آ رہی تھی۔ میں جلدی سے دروازے کے پاس آ گیا اور دو تین بار ہیلو ہیلو کہا
کہ اگر کوئی اندر ہو تو میری آواز سن کر باہر آ جائے۔ مگر اندر سے کوئی باہر نہ نکلا۔ میں
نے آگے ہو کر کیبن کے اندر جھانک کر دیکھا۔ یہ کیبن کشادہ تھا۔ وسط میں گول میز کے
گرد کرسیاں لگی تھیں۔ میز پر تام چینی کی ایک چینک اور چار پانچ مگ پڑے تھے۔ ایک
ایش ٹرے میں سگریٹ سلگ رہا تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ کوئی سگریٹ ایش ٹرے میں رکھ کر
کسی طرف گیا ہے۔ دیوار کے ساتھ ایک لوہے کے پلنگ پر بستر لگا تھا۔ میں نے تام چینی کی
چینک کا ڈھکن اٹھایا۔ چینک گرم تھی۔ اس کے اندر گرم بلیک کافی تھی۔ صاف لگ
تھا کہ کوئی یہاں تھوڑی دیر پہلے کافی اور سگریٹ سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

میں نے سوچا کہ اس طرح بغیر اجازت کیبن میں آ جانا غیر مہذب بات ہے۔ باتھ ر
میں سے پانی کے گرنے کی آواز آئی تو میں سمجھ گیا کہ کوئی باتھ روم میں ہے۔ میں جلد
سے کیبن کے دروازے میں چلا آیا اور اونچی آواز میں ہیلو کہا۔ باتھ روم میں پانی
گرنے کی آواز بند ہو گئی۔ میں اب اس انتظار میں تھا کہ باتھ روم میں سے کوئی آدمی
یقیناً جہاز کا کوئی اعلیٰ عہدے دار ہی ہو گا کیونکہ کیبن کافی وسیع اور سجا ہوا تھا' باہر نکلے
اور میں اس کو یہی بتاؤں گا کہ میں کشتی میں سمندر کی سیر کو نکلا تھا کہ طوفان میں پھنس
اور کشتی مجھے اس جہاز تک لے آئی۔ جب پانی کی آواز کو بند ہوئے کافی دیر ہو گئی
اندر سے کوئی باہر نہ آیا تو میں نے ایک بار پھر ہیلو ہیلو کہا۔ اس کے بعد پھر وہی خاموشی
گئی۔ میں بڑا حیران ہوا۔ پھر سوچا کہ اندر جو آدمی ہے وہ نہانے کے بعد کپڑے پہن
ہو گا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد میں نے پھر آواز دی۔ اس بار بھی کوئی جواب نہ
مجھے جہاز کے آدمیوں کی مدد درکار تھی اور میں اس خیال سے اپنی پوزیشن بھی واضح

تا تھا کہ یہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ میں کوئی چور ڈاکو ہوں جو طوفانی رات میں وہاں چوری
نیت سے آ گیا ہوں۔ جب تیسری بار آواز دینے پر بھی باتھ روم کے اندر سے کوئی نہ
تو میں نے باتھ روم کے دروازے پر جا کر آہستہ سے دستک دے کر کہا: "ہیلو! کوئی اندر
پلیز؟"

پھر بھی جواب میں وہی سناٹا چھایا رہا۔ جہاز آہستہ آہستہ بے معلوم انداز میں کبھی
یں اور کبھی بائیں ڈول رہا تھا۔ اوپر والے ڈیک سے سمندر کے طوفان کی دبی دبی سی
از سنائی دے رہی تھی۔ میں نے ذرا زور سے دروازے پر ہاتھ مارا تو دروازے کا ایک
کھل گیا۔ اندر روشنی ہو رہی تھی۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے انگریزی
کہا کہ میں ٹورسٹ ہوں۔ کشتی میں سمندر کی سیر کو نکلا تھا کہ طوفان میں پھنس کر یہاں
گیا۔ وہی خاموشی۔۔۔ سناٹا۔۔۔ اس سے زیادہ مجھ سے صبر نہ ہو سکا۔ میں نے آگے
کر دونوں ہاتھوں سے دروازہ کھول دیا۔

یہ دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا کہ یہ کوئی باتھ روم نہیں تھا بلکہ کاٹھ کباڑ سے
ا ہوا ایک چھوٹا سا سٹور تھا جہاں ٹوٹی پھوٹی کرسیاں' پرانے تختے اور رسیوں کے گچھے
ے تھے اور چھت پر اتنے جالے لگے تھے کہ وہ نیچے تک آ گئے تھے۔ میں نے ڈر کر
ی سے دروازہ بند کر دیا۔ اب میرے دل کی دھڑکن خوف کے مارے ڈوبنے لگی
۔ میں نے کیبن کے درمیان میں رکھی ہوئی میز کو دیکھا تو وہاں تھوڑی دیر پہلے جو تام
کی چینک' تام چینی کے مگ پڑے تھے' وہ اب وہاں نہیں تھے۔ ایش ٹرے میں کوئی
یٹ نہیں سلگ رہا تھا۔ میں ڈر کر باہر کو بھاگا۔ میں نیم روشن راہ داری میں دوڑتا ہوا
نے کی طرف بڑھا کہ سب سے اوپر والے ڈیک کے سائبان میں بیٹھ کر رات گزار دوں
دن کی روشنی ہو گی تو اس جہاز سے فرار ہونے کی کوئی راہ تلاش کروں گا۔

جیسے ہی میں راہ داری میں زینے کے پاس آیا۔ اوپر سے ایک عورت کو اترتے دیکھا'
کے ہاتھ میں ٹرے تھا' جس میں چائے کے برتن تھے۔ اس نے مجھے دیکھا تو زینہ اتر

کر مجھ سے پوچھنے لگی:

"تم کون ہو؟ جہاز کے مسافروں کو یہاں آنے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ جہازیوں کے کیبن ہیں۔"

یہ عورت مجھے بالکل نارمل عورت لگی۔ یہ جہاز کی خادمہ تھی شاید۔ اس نے انگریزی میں یہ فقرے کہے تھے۔ میں نے بھی انگریزی میں اسے بتایا کہ میں جہاز کا مسافر نہیں ہوں' ٹورسٹ ہوں۔ کشتی میں سمندر کی سیر کرنے نکلا تھا کہ طوفان میں پھنس گیا اور اس جہاز پر پہنچ گیا۔ عورت کی وضع قطع اور رنگ حبشی عورتوں والا تھا۔ موٹے بدن کی ڈھلتی ہوئی عمر کی عورت تھی۔ کہنے لگی:

"مجھے جہاز کے کپتان کو رپورٹ کرنی ہوگی۔ خیر کوئی بات نہیں۔ تم میرے کیبن میں رات گزار سکتے ہو۔ صبح تمہیں کیپٹن کے آگے پیش کروں گی۔ وہ اچھا آدمی ہے' میرے ساتھ آجاؤ۔"

وہ مجھے اپنے کیبن میں لے آئی۔ یہ کیبن ایک کچن لگتا تھا۔ دیوار پر شیلف میں تانبے اور چینی کے جگ' پیالے' مگ اور گلاس پڑے تھے۔ ایک کاؤنٹر بھی بنا ہوا تھا۔ اس نے ٹرے کاؤنٹر پر رکھ دیا اور اپنا سفید ایپرن اتارتے ہوئے بولی:

"میں یہیں سوتی ہوں۔ یہ کچن بھی ہے اور میرا کیبن بھی ہے۔ چائے پیو گے؟"

دیوار میں سونے کی سیٹ بنی ہوئی تھی' جہاں گدیلا اور سرہانہ پڑا تھا۔ وہ مگ میں میرے لئے چائے انڈیلتے ہوئے بولی:

"تم میرے والے بستر پر سو جانا۔ میں کاؤنٹر کے پیچھے کیمپ کارٹ پر سو جاؤں گی۔"

میں اس سے کہتے کہتے رک گیا کہ پیچھے ایک کیبن میں میرے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا ہے' اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ سوچا خدا جانے یہ مجھے توہم پرست نہ سمجھنے لگے۔ اس نے چائے کا مگ مجھے دے کر کہا:

"تم کھڑے کیوں ہو۔ وہاں بیٹھ جاؤ۔ آج سمندر میں بڑا طوفان ہے۔ یہ موسم طوفانوں

کا نہیں ہے۔ خدا جانے کہاں سے اتنا طوفان آگیا ہے۔ آج کل موسموں کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔"

میں دیوار میں بنی ہوئی لمبی سیٹ پر بیٹھ کر گرم چائے پینے لگا۔ گرم چائے نے میرے اعصاب کو بڑا سکون دیا۔ حبشی عورت کاؤنٹر کے پیچھے جا کر برتن وغیرہ سنبھالنے میں لگ گئی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ جہاز کہاں جا رہا ہے۔ اس نے بتایا کہ جہاز انگلستان سے ہو کر سائبرس جائے گا۔ طوفان آجانے کی وجہ سے کیپٹن کے حکم سے جہاز کا لنگر ڈال دیا گیا ہے۔ جہاز طوفان کے رکتے ہی روانہ ہو جائے گا۔

کاؤنٹر کے پیچھے اوٹ میں کوئی کیمپ کارٹ یعنی فولڈ ہو جانے والی چارپائی بچھی ہوئی تھی جو کاؤنٹر کی وجہ سے مجھے نظر نہیں آ رہی تھی۔ حبشی عورت اس پر چادر کھول کر بچھانے لگی۔ مجھے صرف اس کا اوپر والا آدھا جسم نظر آ رہا تھا۔ پھر وہ نیچے ہو گئی۔ مجھے چارپائی کے چرچرانے کی آواز آئی۔ وہ بستر پر لیٹ گئی تھی۔ اس نے مجھے آواز دی۔

"سونے سے پہلے بتی بجھا دینا۔ سوئچ تمہاری سیٹ کے اوپر ہے۔"

میں نے کہا: "اوکے میڈم!"

میں چائے پینے لگا۔ اتنے میں حبشی عورت نے دوبارہ آواز دی۔ "سنو! میز پر ماچس پڑی ہے۔ مجھے دے جاؤ میں سگریٹ پی کر سوتی ہوں۔"

میرے قریب ہی ایک چھوٹی سی میز رکھی ہوئی تھی۔ اس پر ایش ٹرے کے پاس ماچس کی ڈبیا تھی۔ میں نے چائے کا مگ میز پر رکھا۔ ماچس کی ڈبیا اٹھائی اور کاؤنٹر کی طرف بڑھا۔ میں جھک کر دوسری طرف حبشی عورت کو ماچس کی ڈبیا دینے لگا تو میرے ہاتھ سے ماچس گر پڑی اور میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ نیچے کیمپ کارٹ پر حبشی عورت کی جگہ ہڈیوں کا ایک انسانی پنجر لیٹا ہوا تھا' جس کی کھوپڑی میں آنکھوں کے سوراخ انگاروں کی طرح لال ہو رہے تھے۔ اس کی انگلیوں کی ہڈیوں نے ایک سگریٹ پکڑ رکھا تھا۔ کھوپڑی کی انگارہ آنکھوں نے میری طرف دیکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچ ہاتھ میری طرف بڑھایا اور اس کے

جبڑے کی ہڈیاں اوپر نیچے ہوئیں اور مجھے حبشی عورت کی آواز آئی۔

"میرا سگریٹ سلگا دو۔"

میں چیخ مار کر پیچھے کو ہٹا اور دروازے کی طرف دوڑا۔ گھبراہٹ میں مَیں میز سے ٹکرایا اور چائے کا مگ الٹ گیا۔ چائے کی میز پر سرخ انسانی خون بکھرا ہُوا دیکھا تو مَیں دیوانہ وار کیبن سے نکل کر اوپر جانے والے زینے کی طرف بھاگا۔ جیسے ہی مَیں زینے کے پاس پہنچا' مجھے ایسا جھٹکا لگا جیسے کسی نے مجھے پیچھے سے دھکا دے دیا ہو۔ مَیں منہ کے بل گر پڑا۔ اٹھنے کی کوشش کی تو اُٹھ نہ سکا۔ میرا جسم سن ہو گیا تھا۔ نہ مَیں ہاتھ ہلا سکتا تھا' نہ پاؤں ہلا سکتا تھا' نہ گردن ہلا سکتا تھا۔ آنکھوں کے پپوٹے بھاری ہونا شروع ہو گئے۔ مَیں نے انہیں اوپر اٹھائے رکھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ میری آنکھیں اپنے آپ بند ہو گئیں۔ مجھے محسوس ہُوا کہ میرا جسم سن ہونے کے بعد بے حس ہو گیا ہے۔

پھر مجھے کوئی ہوش نہ رہا کہ مَیں کہاں پر ہوں اور میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اس حالت میں خدا جانے کتنا وقت گزر گیا۔ جس وقت مجھے کچھ ہوش آیا تو سب سے پہلے میرے کانوں میں جو آواز آئی وہ ایسی آوازیں تھیں' جیسے بہت سی عورتیں آہستہ آہستہ رو رہی ہیں۔ مَیں نے آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا کہ گول دیواروں والا کمرہ ہے' جس کی چھت کی کڑیوں کے ساتھ انسانی کھوپڑیاں لٹک رہی ہیں۔ دھیمی دھیمی روشنی ہے۔ مَیں لکڑی کے تختے پر بالکل سیدھا پڑا ہوں۔ میرا ذہن پوری طرح سے بیدار ہے۔ آنکھیں سب کچھ دیکھ رہی ہیں مگر میں اپنے ہاتھ پاؤں نہیں ہلا سکتا۔ چار نوجوان عورتیں جن کے سیاہ بال کھلے ہیں۔ دونوں ہاتھ سینوں پر بندھے ہیں۔ سیاہ لمبے کرتے پہنے ہوئے ہیں' سر جھکائے دھیمی آواز میں بین کرتی' سسکیاں بھرتی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی میرے گرد چکر لگا رہی ہیں۔ یہ گورے رنگ کی خوش شکل لڑکیاں ہیں۔ میں دل میں اپنی عافیت کی دعائیں مانگنے لگا کہ یا خدا مجھے اس منحوس جہاز سے خیریت سے نکال دینا۔ خدا جانے مَیں کس قسم کی آسیبی مخلوق کے پھندے میں پھنس گیا تھا۔

یہ سیاہ پوش روتی ہوئیں اس طرح آ رہی تھیں جیسے ان کا کوئی بہت قریبی عزیز فوت
یا ہو۔ وہ میرے گرد چکر لگانے کے بعد سامنے دیوار میں جو دروازہ نظر آ رہا تھا اس میں
ایک ایک کر کے گزر گئیں۔ کمرہ خالی ہو گیا۔ فضا میں ایک عجیب سی بو پھیلی ہوئی
ے۔ مَیں نے اٹھ کر وہاں سے بھاگنے کی بہت کوشش کی لیکن میں ارادے اور کوشش
باوجود اپنے جسم کو لکڑی کے تختے سے ایک انچ بھی نہ ہلا سکا۔ خدا جانے اس مخلوق
مجھے کیا پلا دیا تھا یا مجھ پر کون سا علمی منتر پھونک دیا تھا کہ میرا جسم ساکت ہو گیا تھا۔
کچھ آوازیں سنائی دیں۔ یہ مردانہ آوازیں تھیں۔ آوازیں آہستہ آہستہ قریب ہو رہی
ں۔ پھر سامنے والے دروازے میں سے یکے بعد دیگرے چھ سیاہ پوش انسان نکل کر
میری ایک جانب اور تین میری دوسری جانب کھڑے ہو گئے۔ ان کے جسم سر سے
ں تک سیاہ لباس میں ملبوس تھے۔ سروں پر سیاہ تکونی ٹوپیاں تھیں۔ چہرے بھی سیاہ
ب میں چھپے ہوئے تھے۔ صرف آنکھوں کی جگہ لال انگاروں ایسی روشنی تھی۔ ان
اسرار آدمیوں نے اپنے ہاتھوں پر بھی سیاہ دستانے چڑھا رکھے تھے۔ ان کے سر جھکے
ئے تھے۔ ہاتھ سینے پر بندھے تھے۔ وہ اپنے حلق سے دھیمی دھیمی' تھوڑے
قفے کے بعد بڑی ڈراؤنی آوازیں نکال رہے تھے۔ یہ آوازیں ایسی تھیں' جیسے پہاڑی
گلوں میں آدھی رات کے سناٹے میں گیدڑ بولتے ہیں۔ مَیں پتھرائی ہوئی آنکھوں کے
اتھ انہیں دیکھ رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ منحوس مخلوق کون ہے اور میرے
اتھ کیا سلوک کرنے والی ہے۔

یکایک انہوں نے اپنے حلق سے ڈراؤنی آوازیں نکالنی بند کر دیں اور سر جھکائے
کھڑے کھڑے تین تین قدم پیچھے ہٹ گئے۔ کمرے میں موت ایسی خاموشی چھا گئی۔
چانک کسی عورت کی مہیب چیخ کی آواز نے اس خاموشی کا جگر چاک کر دیا۔ چیخ کی آواز
تھوڑی دیر فضا میں گونجتی رہی' پھر غائب ہو گئی۔ اس کے بعد سامنے دیوار کے دروازے
سے چار سیاہ پوش آدمی ایک تخت کاندھوں پر اٹھائے کمرے میں داخل ہوئے۔ تخت پر

بہت بڑی کرسی رکھی تھی۔ اس کرسی پر ایک سیاہ پوش انسان بیٹھا تھا۔ اس کا سارا جسم سیاہ چمکدار ریشمی لبادے میں چھپا ہوا تھا۔ ہاتھوں پر بھی سیاہ دستانے تھے۔ چہرے پر سیاہ نقاب تھا، سر پر تکونی سیاہ ٹوپی تھی لیکن اس ٹوپی پر ایک بڑا سا سرخ لعل چمک رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی نقاب کے سوراخوں میں سے سرخ انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ سیاہ پوش آدمیوں نے تخت میرے قریب اتار دیا۔ تین تین کی قطار میں جو چھ سیاہ پوش آدمی پہلے سے سر جھکائے کھڑے تھے۔ انہوں نے سر اوپر اٹھا کر ایک ساتھ منہ سے تین بار ڈراؤنی آوازیں نکالیں اور چپ ہو گئے۔ تخت پر بیٹھے ہوئے آدمی نے اپنے سیاہ لبادے کے اندر ایک انسانی بازو کی ہڈی نکالی اور تخت سے اتر کر میرے پاس آگیا۔ مجھے اس کی آنکھوں کی جگہ لال انگاروں میں چنگاریاں سی پھوٹتی دکھائی دے رہی تھیں۔ اس نے انسانی بازوں کی ہڈی کو میرے ماتھے پر لگایا اور عجیب طلسمی منتروں والی زبان میں کچھ بولتا رہا۔ انسانی ہڈی کے میرے ماتھے پر لگتے ہی میرے اندر بجلی کی ہلکی ہلکی لہر سی دوڑنے لگی۔ میرا بدن کانپنے لگا۔ مجھے پسینے آنے لگے۔ اس شخص نے ہڈی میرے ماتھے پر سے ہٹالی اور میرے بدن میں جو بجلی کے کرنٹ ایسی لہر دوڑ رہی تھی' وہ رک گئی۔ اس شخص نے اپنا چہرہ میری طرف کیا اور اپنے چہرے پر سے نقاب اوپر اٹھایا۔ نقاب کے اندر گوشت پوست کا انسانی چہرہ نہیں تھا' بلکہ اس کی جگہ انسانی کھوپڑی تھی' جس کی آنکھوں کے سوراخوں میں سرخ انگارے دہک رہے تھے۔

خوف کے مارے میں نے آنکھیں بند کرنا چاہیں تو میں آنکھیں بند نہ کر سکا۔ اس شخص نے اپنے چہرے کو نقاب سے دوبارہ ڈھک دیا اور واپس مڑ کر تخت کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ سیاہ پوش کہاروں نے تخت کندھوں پر اٹھایا اور اسے لے کر جدھر سے آئے تھے ادھر چلے گئے۔ ان کے نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد میرے دائیں بائیں کھڑے چھ سیاہ پوش بھی قطار بنا کر سر جھکائے منہ سے بین کرنے کی آوازیں نکالتے دروازے میں سے گزر گئے۔ اس کے فوراً بعد چار سیاہ پوش آدمیوں یا شیطانی مخلوق کی ایک ٹولی نمودار

ئی۔ انہوں نے ایک تابوت اٹھا رکھا تھا۔ انہوں نے تابوب میرے پہلو میں لا کر رکھ ۔ تابوت کا اوپر والا تختہ ہٹا دیا۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے تختے پر سے اٹھایا اور تابوب ڈال کر اس کے اوپر تختہ ڈال کر بند کر دیا۔ وہ تابوت کاندھوں پر اٹھا کر چلنے لگے۔

تابوت میں گھپ اندھیرا اور ناگوار بو تھی۔ میں اپنے ہاتھ پاؤں ہلانے سے معذور تھا۔ چہ میرے جسم میں جان پڑ چکی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ سیاہ پوش آدمی میرے ت کو اٹھائے جہاز کے مختلف حصوں میں سے گزر رہے ہیں۔ کبھی سیڑھیاں چڑھ کر جاتے ہیں ' کبھی کسی جگہ سے سیڑھیاں اترنے لگتے ہیں۔ پھر میرے تابوت کو ایک رکھ دیا گیا۔ مجھے ان آدمیوں کے قدموں کی آواز آئی۔ وہ واپس جا رہے تھے۔ ان کے وں کی آواز خاموشیوں میں ڈوب گئی۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں زندہ درگور ہو گیا ' مجھے جس تابوت میں ڈال کر وہاں لایا گیا ہے تو اب میں اس وقت تک اسی جگہ ت میں بند ہو کر پڑا رہوں گا جب تک کہ میں مر نہیں جاتا۔ میں اپنے اوپر مسلسل رنے والے ہیبت ناک آسیبی واقعات کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ میں خود بھی منحوس آسیبی مخلوق کا ایک کردار بن چکا ہوں۔ اب مجھے دہشت کم اور تشویش زیادہ ئی تھی کہ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے اور ایسا کب تک ہوتا رہے گا۔ میرے ذہن میں ہی سوال بار بار ابھرتا تھا کہ کیا میں اسی طرح اس مخلوق کے ہاتھوں مار دیا جاؤں گا؟ ر یہ لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ میرے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔

میں کب تک اس تابوت کے بدبودار اندھیروں میں پڑا رہا؟ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ ت جیسے میری طرح بے حس اور پتھر ہو گیا تھا۔ مجھے سوائے اندھیرے کے اور کچھ دکھائی دیتا تھا۔ تابوت کے اندر سے ایسی ناگوار بو اٹھ رہی تھی جیسے میں مر چکا ہوں اور میرا گل سڑ رہا ہے۔ میں صرف آنکھیں گھما سکتا تھا۔ ہاتھ اٹھا کر اپنے جسم پر نہیں پھیر تھا۔ میری یہ حالت ہو گئی تھی کہ کسی وقت میں آنکھیں بند کر لیتا تو محسوس ہوتا کہ بے ہوش ہو گیا ہوں۔ یہ عجیب بے ہوشی تھی کہ جس کا مجھے برابر احساس ہو رہا تھا۔

کسی وقت لگتا کہ میں گہری نیند سو گیا ہوں۔ مگر یہ عجیب نیند تھی کہ مجھے محسوس ہو رہا تھا
کہ میں سو رہا ہوں۔ جہاز پہلے تو بڑی خفیف سی لرزش کے ساتھ سمندری موجوں کے
ساتھ ڈولتا محسوس ہوتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ جہاز نے کبھی دائیں اور کبھی بائیں اس طرح
ڈولنا شروع کر دیا جیسے وہ سمندر کی ہیجان خیز موجوں پر چل رہا ہو۔ مگر جہاز کے انجنوں کے
چلنے کی بالکل آواز نہیں آ رہی تھی۔

ایک دن اسی حالت میں گزر گیا تھا یا ایک رات گزر گئی تھی۔ دو دن گزر گئے تھے یا دو
راتیں گزر گئی تھیں' اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ اندازہ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ میں تو
بند تابوت کی تاریکی میں پڑا' زندگی اور موت کے درمیان لٹک رہا تھا۔ وقت میرے لئے
ساکت و جامد ہو گیا تھا۔ صرف جہاز کی دائیں بائیں حرکت مجھے بتا رہی تھی کہ میں سمندر
میں سفر کر رہا ہوں۔ میں اس حالت میں تھا کہ کبھی مجھے ہوش آ جاتا' کبھی کچھ ہوش نہ
رہتا۔

ایک بار میں اپنے ہوش و حواس میں آیا تو جہاز بہت بری طرح ڈول رہا تھا' ہچکولے
کھا رہا تھا۔ کبھی ایک دم اوپر کو اٹھ جاتا۔ کبھی ایکدم نیچے اترنے لگتا۔ کبھی دائیں طرف
جھک جاتا کبھی بائیں طرف جھک جاتا۔ میرا جسم تابوت کی دیواروں سے بار بار ٹکرا جاتا۔
یہ صورتِ حال مسلسل برقرار رہی۔ معلوم ہوتا تھا کہ جہاز کسی بھیانک سمندری طوفان
میں سے گزر رہا ہے۔ رات اور دن کا مجھے کچھ پتہ نہیں چلتا تھا۔ اسی کیفیت میں مجھ پر
ایک بار پھر بے ہوشی طاری ہو گئی۔ کچھ اندازہ نہیں کب تک بے ہوش رہا۔ جس وقت
ہوش آیا تو جہاز شاید طوفان میں سے نکل آیا تھا یا طوفان جہاز کو الٹ پلٹ کر' اس کا انجر
پنجر ہلا کر آگے گزر گیا تھا۔ جہاز ہچکولے نہیں کھا رہا تھا' صرف اتنا ڈول رہا تھا جتنا پرسکون
سمندر میں بھی تھوڑا تھوڑا ڈولا کرتا ہے۔ جہاز اسی طرح نہ جانے کب تک سفر کرتا رہا
پھر مجھے ایسا لگا جیسے جہاز رک گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے دور سے گڑ گڑ گڑ کی آواز
آئی۔ جہاز کا لنگر سمندر میں ڈالا جا رہا تھا۔ اب شاید میری بدنصیب زندگی کا کوئی دوسرا

راؤنا باب کھلنے والا تھا۔ مجھے قدموں کی آواز سنائی دی۔ قدموں کی چاپ میرے تابوت
ے پاس آ کر رک گئی۔ میرے تابوت کو اٹھا لیا گیا تھا اور کہیں لے جایا جا رہا تھا۔

میرا تابوت سامنے کی جانب سے اونچا ہو گیا۔ جن لوگوں نے میرا تابوت کندھوں پر
ا رکھا تھا وہ شاید جہاز کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ چند لمحوں کے بعد تابوت دوبارہ
دھا ہو گیا۔ اس کے بعد تابوت ایک طرف کو گھوم گیا۔ پھر تابوت لے جانے والے
ک گئے اور تابوت نیچے رکھ دیا گیا۔ سناٹا سا چھا گیا۔ جب اس سناٹے کا طلسم ٹوٹا تو ایک
م زبان میں کچھ پڑھنے کی آواز آنے لگی۔ کوئی مرد بیٹھی ہوئی آواز میں شاید منتروں کا
پ کر رہا تھا۔ میرے تابوت کا ڈھکنا آہستہ آہستہ ایک طرف کھسکنے لگا۔ جیسے جیسے تابوت
تختہ کھسکتا جا رہا تھا' سرخی مائل زرد مدہم روشنی میرے تابوت میں آنے لگی تھی۔ تختہ
ب طرف ہٹ گیا۔ مجھ پر چار سیاہ نقاب پوش جھکے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں کے سرخ
قوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے تابوت میں سے نکال کر ایک
انسیسی طرز کے دیوان پر لٹا دیا۔ میں نے اردگرد نگاہ ڈالی۔ چاروں نقاب پوش مجھے دیوان
لٹا کر کسی طرف چلے گئے تھے۔ یہ کمرہ پرانے زمانے کے فرنیچر سے مزین تھا۔ چھت پر
ب روشن فانوس لٹک رہا تھا' جس میں سے سرخی مائل زرد مگر دھیمی روشنی نکل رہی
ی اور کمرے کی فضا کو اور زیادہ پُراسرار بنا رہی تھی۔ دیواروں پر گہرے رنگ کے
دے گرے ہوئے تھے۔ میں دیوان پر اس طرح لٹایا گیا تھا کہ میرے کندھے اور سر ذرا
نچے ہو گئے تھے۔

اچانک ایک طرف سے چار گورے رنگ کی نوجوان اور خوش شکل لڑکیاں نمودار
ئیں۔ یہ وہی لڑکیاں تھیں' جنہیں پہلی بار میں نے اپنے گرد سسکیاں بھر کر بین کرتے
رلگاتے دیکھا تھا۔ چاروں لڑکیاں اسی طرح سیاہ لمبے کرتوں میں ملبوس تھیں۔ سر کے بال
لے تھے اور شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے بے نقاب تھے۔ ہر لڑکی کے ہاتھ میں
ب لمبی موم بتی تھی' جسے انہوں نے دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم

اٹھاتیں میرے قریب آئیں اور میری پائنتی کی جانب رکھے ہوئے میز پر چاروں موم بتیاں لگا دیں۔ پھر انہوں نے نگاہیں اٹھا کر ایک ساتھ مجھے دیکھا۔ ان کی آنکھیں سرخ تھیں اور ان میں سے چنگاریاں سی پھوٹتی معلوم ہو رہی تھیں۔

میں حیران ہو رہا تھا کہ اتنی حسین لڑکیاں یہاں کہاں سے اور کیسے آ گئی ہیں۔ مجھ پر اس خونیں راز کا انکشاف بعد میں ہوا۔ لڑکیاں الٹے پاؤں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتی گئیں اور پھر دیوار کے ساتھ لگ کر خاموش کھڑی ہو گئیں۔ میرے پائنتی کی جانب میز کے شمعدانوں میں چاروں موم بتیاں جل رہی تھیں۔ ان کی لویں بالکل ساکن تھیں۔ ان کی وجہ سے کمرے میں کچھ روشنی بہتر ہو گئی تھی۔ میں نے چاہا کہ اٹھ کر کمرے سے فرار ہونے کا کوئی راستہ ڈھونڈوں مگر ابھی تک میرے جسم میں حرکت کرنے کی طاقت واپس نہیں آئی تھی۔ اس وقت تک میری گردن بھی اکڑ کر ایسے ہو گئی تھی، جیسے پتھر کی ہو۔ صرف میری آنکھیں اور میرے کان دیکھ اور سن سکتے تھے۔ میں اپنے انجام کا منتظر تھا، جو میرے خیال میں انتہائی ہولناک ثابت ہونے والا تھا۔

اچانک کمرے کی بتیاں بجھ گئیں۔ اب صرف کمرے میں چار موم بتیاں ہی جل رہی تھیں، جن کی مدھم روشنی میں کمرے کی فضا زیادہ پُر اسرار اور ڈراؤنی ہو گئی تھی۔ چاروں سیاہ پوش لڑکیاں پتھر کی سیاہ مورتیوں کی طرح لگنے لگی تھیں۔ ان کی آنکھیں نیم اندھیرے میں روشنی کے سوراخ معلوم ہو رہی تھیں۔ اچانک بہت سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اندھیرے میں سامنے والی دیوار کا بھاری سیاہ پردہ اپنے آپ ایک طرف ہٹ گیا اور کمرے میں سرد ہوا کی ایک لہر سی داخل ہوئی۔ موم بتیوں کی لو کپکپانے لگی۔ میری نگاہیں دیوار پر لگی تھیں، جہاں سے قدموں کی چاپ کے ساتھ اب بین کرنے کی انسانی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ آواز نزدیک آ گئی۔ پھر جیسے ایک دھماکے کے ساتھ بجلی چمکی۔ کمرہ ایک سیکنڈ کے لئے چکا چوند ہو کر دوبارہ اندھیرے میں ڈوب گیا۔ دیوار میں سیاہ پوشوں کی ایک جماعت نمودار ہوئی۔ انہوں نے اپنے کندھوں پر تخت اٹھا رکھا تھا۔ تخت پر وہی سیاہ پوش

ا تھا جس کی تکونی جلادوں والی سیاہ ٹوپی پر لعل لگا ہُوا تھا اور جس کا چہرہ ایک کھوپڑی کی
ں میں تھا۔ اس کا سارا جسم سوائے چہرے اور ہاتھوں کے سیاہ لبادے میں چھپا ہُوا تھا۔
کے چہرے کی بجائے ایک کھوپڑی تھی اور ہاتھوں کی انگلیاں بالکل سوکھی ہڈیاں تھیں۔
کے ہاتھ میں ایک سیاہ چھڑی تھی، جس کے سرے پر چھُری لگی ہوئی تھی۔ کمرے میں
آدمی کے آتے ہی جو زرد روشنیاں بجھ گئیں تھیں، پھر سے روشن ہو گئیں۔
اس کا تخت میرے قریب رکھ دیا۔ یہ آدمی اس شیطانی مخلوق کا سرغنہ یا بڑا شیطان
اس نے چھڑی اٹھا کر اشارہ کیا۔ اشارہ پا کر چار سیاہ پوش شیطان اندھیرے میں سے
کر میری طرف آئے۔ انہوں نے ایک لمبوترا بکس اٹھا رکھا تھا۔ انہوں نے بکس
ے قریب ہی فرش کے قالین پر رکھ دیا۔ دو سیاہ پوشوں نے آگے بڑھ کر بکس کا ڈھکن
تو اندر سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی اژدہا پھنکارا ہو۔ انہوں نے بکس میں ہاتھ ڈالا اور
بہت بڑی کالی چھپکلی بکس میں سے نکال کر مجھ پر پھینک دی۔ میرے منہ سے اَلم انگیز
ی چیخ نکل گئی۔ کالی چھپکلی ایک قد آدم مگرمچھ کے سائز کی تھی۔ چھپکلی میرے جسم پر
تے ہی میرے پیٹ اور سینے سے چمٹ گئی۔ اس نے اپنے نوکیلے پنجے میرے جسم میں
یے اور اپنا مکروہ منہ میرے چہرے کے اوپر لا کر پھنکارنے لگی۔
سیاہ چھپکلی اپنی لمبی زبان بار بار میرے چہرے پر پھیر رہی تھی۔ میرا جسم خوف کے
، تھر تھر کانپ رہا تھا مگر مجھ میں اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ مَیں اس گھناؤنے چہرے
کروہ چھپکلی کو دور پھینک سکوں۔ اِس دوران سیاہ پوش شیطان کے اِرد گرد چکر لگانے
تھے اور عجیب و غریب زبان میں منتر پڑھ رہے تھے۔ چھپکلی کا گرم بدبوار سانس میرے
سے لپٹ رہا تھا۔ میرے حلق سے دبی دبی چیخیں نکل رہی تھیں۔ پھر چھپکلی میرے
ے کھینچ کر اٹھالی گئی۔ مجھے اپنے جسم میں سے آگ سی نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ سیاہ
کالی چھپکلی کو بکس میں دوبارہ بند کر کے وہاں سے چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی بڑے
ں شیطان نے منہ سے دل دہلا دینے والی آواز نکالی اور ایک سیاہ پوش ہاتھ میں سیاہ

ڈبہ لئے میرے سر کی طرف آ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے ڈبہ کھولنے کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی میرے سر میں بے شمار سوئیاں چبھتی چلی گئیں۔ مَیں سوائے چیخنے کے اور کچھ نہ کر سکا تھا۔ اب میری چیخوں کی آواز بھی تھک کر دھیمی ہو گئی تھی اور میرے حلق سے صرف کراہیں نکل رہی تھیں۔ میرے سر میں چبھی ہوئی سوئیاں رینگنے لگیں، وہ رینگتی رینگتی میرے ماتھے اور پھر میرے چہرے پر آ گئیں۔ یہ دیکھ کر جیسے میری روح میرے جسم سے نکل گئی کہ یہ ایک ایک فٹ لمبا کنکھجورا تھا اور جنہیں میں سوئیاں سمجھ رہا تھا وہ اس کنکھجورے کے سوئیوں ایسے بے شمار پاؤں تھے جن کے ذریعے وہ میرے سر پر سے رینگتا ہوا میرے چہرے اور پھر گردن پر آ گیا تھا۔

کبھی میں دہشت سے بلبلا اٹھتا، کبھی میرے حلق سے چیخ نکل جاتی اور کبھی یہ چیخ سمٹ کر صرف ایک ڈری ہوئی، سہمی ہوئی کراہ بن کر رہ جاتی۔ کنکھجورا میری گردن میں گلوبند کی طرح لپٹ گیا تھا۔ پھر وہ گردن سے اتر کر میری قمیض کے اندر گھس گیا اور میرے سارے جسم پر رینگتا چلا گیا۔ جہاں جہاں سے کنکھجورا گزرتا جا رہا تھا، وہاں وہاں سے میرے جسم کی محسوس کرنے کی حس واپس آتی جا رہی تھی۔ جب کنکھجورا میرے سارے جسم پر رینگنے کے بعد واپس میرے سر کے ساتھ آ کر چمٹ گیا تو میرے ساکت اور جامد جسم میں زندگی کی حرارت اور اس کا لمس واپس آ چکا تھا مگر میں ابھی تک اپنے ہاتھ پاؤں نہیں ہلا سکتا تھا۔ کنکھجورا میرے سر کے بالوں کے اندر گھس کر میری کھوپڑی کی جلد کے ساتھ چمٹ گیا تھا اور اس کے پاؤں کی بے شمار نوکیلی سوئیوں نے میرے سر کو شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔

جس دیوان پر مجھے ڈالا گیا تھا، اس کے اردگرد سیاہ پوش شیطان کھڑے میری طرف ٹکٹکی باندھے اپنی سرخ آنکھوں سے گھور رہے تھے۔ چاروں خوش شکل لڑکیاں موم بتیوں کے پیچھے آ کر سروں کو جھکا کر کھڑی ہو گئی تھیں اور انہوں نے دھیمی آواز میں سمجھ میں نہ آنے والے منتروں کو پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ سیاہ پوش شیطانوں کا سردار تخت پر سے

کرسی پر جا کر بیٹھ گیا تھا اور اس کی انگارہ ایسی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ ایسے معلوم ہو رہا تھا کہ یہ سارے شیطان کسی چیز کا انتظار کر رہے ہیں۔ کوئی ایسی چیز جو میرے وجود میں کسی تبدیلی کی صورت میں رونما ہونے والی تھی۔ میں ایک طویل عرصے سے منحوس آسیبی طاقتوں کی گرفت میں پھنسا ہوا تھا اور ان باتوں کو بہت سمجھنے لگا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، اب مجھے دہشت کم محسوس ہوتی تھی اور تشویش، فکر مندی اور پریشانی زیادہ لاحق ہوتی تھی کہ خدا جانے اب میرے اوپر کیا گزرنے والی ہے اور کون سی بلا مجھ پر حملہ کرنے کے لئے پر تول رہی ہے۔

کنکھجورے کی سوئیاں میرے سر میں دھنسی ہوئی تھیں۔ کنکھجورا بالکل ساکت ہو گیا تھا مگر مجھے اپنا دماغ کسی آہنی شکنجے میں ہی جکڑا ہوا محسوس ہو تا تھا۔

اس کے بعد میرے اندر یا مجھ میں جو بھیانک اور شیطانی تبدیلی پیدا ہوئی اس کو الفاظ میں بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ اس کی سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ کنکھجورے کی سوئیوں کی جکڑن نے میری نفسیات اور میرے ذہن کی سوچ پر اثر انداز ہونا شروع کر دیا تھا اور میرا انسانیت کا شعور ماند پڑتا جا رہا تھا۔ میری یادداشت میرے ذہن کی تختی سے غائب ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ چونکہ اس وقت میرا انسانی شعور آدھے سے زیادہ ختم ہو چکا تھا اس لئے میں پوری وضاحت اور تفصیل سے بیان نہیں کر سکتا کہ میری ذہنی اور نفسیاتی کیفیات کیسی تھیں۔ جو کچھ مجھے دھندلا دھندلا یاد رہ گیا ہے میں وہی کچھ بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔

سب سے پہلے تو میرے ذہن اور میرے تحت الشعور سے میری گزشتہ زندگی کی اچھی بری یادیں غائب ہو گئیں۔ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے سیاہ پوش شیطانوں کے نرغے میں دیوان پر لیٹے لیٹے سیاہ پوش لڑکیوں کے منتر پڑھنے کی آوازوں اور موم بتیوں کی مدھم روشنی اور کمرے میں پھیلی ہوئی ناگوار بُو کے ماحول میں یاد کرنا چاہا کہ میں اس آسیبی ماحول میں کیسے پہنچ گیا تو مجھے کچھ یاد نہ آیا۔ مَیں نے اپنی گزشتہ زندگی کے

شب و روز کو یاد کرنا چاہا‘ مجھے وہ بھی یاد نہ آئے‘ یہاں تک میں اپنا نام بھی بھول گیا۔ اس وقت جبکہ میں اپنی داستان اَلم آپ کو سنا رہا ہوں تو مجھے باقاعدہ یاد ہے کہ میرا نام سلیم ہے۔ مَیں لاہور کا رہنے والا ہوں اور میری فلاں فلاں غلطی اور مجھ سے فلاں گناہ سرزد ہو جانے کی وجہ سے میں ناقابلِ تلافی عذاب میں پھنس گیا تھا لیکن اُس وقت نہ تو مجھے اپنا نام یاد رہا تھا‘ نہ یہ یاد رہا تھا کہ مَیں لاہور کا رہنے والا ایک مسلمان نوجوان ہوں۔ مجھے اپنے گناہ بھی یاد نہیں رہے تھے بلکہ گناہ ثواب کی تمیز کا احساس بھی نہیں رہا تھا۔ اس سے زیادہ تباہ کن بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ میرے اندر سے گناہ اور ثواب میں تمیز کرنے کی صلاحیت ختم ہو گئی تھی۔ یہی وہ بھیانک تبدیلی تھی‘ جس کا ان شیطانی سیاہ پوشوں یا سیاہ پوش شیطانوں کو انتظار تھا۔

جب میری یادداشت ہی ختم ہو گئی اور میرے ذہن سے نیکی برائی اور گناہ ثواب کا احساس ہی جاتا رہا تو پھر مجھ میں اور ان سیاہ پوش شیطانوں میں فرق ہی کیا رہ گیا تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ پرانے شیطان تھے اور میں نیا نیا شیطان بن رہا تھا۔ میرے اندر ایک شیطانی انقلاب برپا ہو چکا تھا۔ اب مجھے سیاہ پوش شیطانوں سے کوئی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ مجھے اپنے دوست اور بھائی بند لگنے لگے تھے۔ کنکھجورے کے پاؤں کی سوئیوں کی چبھن میں مجھے لذت محسوس ہونے لگی تھی۔ کنکھجورا میرے سر پر سے نیچے اترنے لگا تو میں اس لذت سے محروم ہو گیا‘ جو مجھے اس کے پاؤں کی سوئیوں کی چبھن سے آرہی تھی۔ میں نے کنکھجورے کو پکڑ کر دوبارہ اپنے سر پر رکھ دیا۔ جیسے ہی میں نے کنکھجورے کو بڑی محبت اور پیار سے پکڑ کر اپنے سر پر رکھا سیاہ پوش شیطانوں نے بیک آواز ہو کر اپنے حلق سے چیخ کی آواز نکالی۔ یہ چیخ فتح مندی‘ فتح یابی کی چیخ تھی۔ شیطانوں کا سردار فوراً تخت سے اتر کر میرے پاس آ گیا۔ اس نے کنکھجورے کو پکڑ کر ڈبے میں بند کر دیا اور اپنی عجیب و غریب زبان میں مجھ سے مخاطب ہوا۔

"آج سے تم میرے جانشین ہو۔ میرے بعد یہ تخت تمہارا ہو گا۔ یہ سب سے بڑ

ں درجہ ہے۔ اس درجے پر پہنچنے کے لئے تمہیں ایک امتحان میں سے گزرنا ہو گا۔ یہ ایک آزمائش ہے۔ آخری آزمائش ہے۔ اگر تم اس آزمائش پر پورے اترے تو تم ے تخت کے مالک ہو گے اور شیطانی دنیا کی مخفی طاقتیں تمہاری غلام بن جائیں گی۔"

ں نے بڑے پرعزم لہجے میں کہا:

یں ہر آزمائش میں پورا اتروں گا۔"

جھے خود حیرت ہوئی کہ یہ جملہ میرے منہ سے کیسے نکل گیا تھا۔ دوسری حیرت اس پر ہے کہ میں ان شیطانی سیاہ پوش فرقے کی مہمل زبان کیسے سمجھنے اور بولنے لگا تھا۔ ب اسی کالے جادو اور طلسمی طاقتوں اور آسیب کا اثر تھا‘ جس نے سر سے پاؤں تک ے جسم اور میری روح کو اپنے قبضے میں کر لیا ہوا تھا۔ اب میرا آپ کے سامنے اپنے پیدا ہو چکی شیطانی تبدیلی کا کوئی عذر پیش کرنا یا اس کی مزید وضاحتیں کرنا بالکل بیکار ۔ میں بھی اس وقت بھول گیا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہو گیا ہے اور آپ بھی بھول ں کہ میں کیا سے کیا بن گیا تھا اور کیوں بن گیا تھا۔ آپ صرف یہ دیکھیں کہ اس ی تبدیلی نے ان سیاہ پوش شیطانوں کی مرضی کے مطابق مجھ سے کیسے کیسے مکروہ اور آلود کام کرائے۔ مجھ پر جو گزر چکی تھی اور گزر رہی تھی‘ اس کو بھی آپ تھوڑی دیر لئے بھول جائیں اور یہ دیکھیں کہ میری وجہ سے اب دوسرے لوگوں پر کیا گزرنے تھی۔ میں اس وقت کا تصور کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ میرے دو وجود ہو گئے تھے۔ میرا وہ وجود تھا جو شیطانی طاقتوں کے قبضے میں تھا‘ دوسرا میرا اپنا نارمل وجود تھا۔ ے اپنے وجود کا میرے شیطانی وجود پر کوئی اختیار نہیں رہا تھا۔ میری اچھائی برائی کی تمیز نے والے وجود کا میرے شیطانی وجود پر اب کوئی حکم نہیں چلتا تھا۔ میرا شیطانی وجود ں طور پر سیاہ پوش شیطانی طاقتوں کے تصرف میں تھا۔ میں خود کو گھناؤنا سے گھناؤنا گناہ تے دیکھتا تھا مگر اپنے آپ کو روک نہیں سکتا تھا۔ میری حالت اس تماشائی کی سی ہو گئی ا جو سینما کے پردے پر کسی بدمعاش کو ہر قسم کا برا کام کرتے دیکھ رہا ہو لیکن اسے برائی

کے کسی بھی فعل سے روک نہ سکتا ہو۔ مَیں اپنا آپ تماشائی بن گیا تھا۔

اپنے گناہوں کا آپ گواہ بن گیا تھا۔

سیاہ پوش شیطانوں کا سردار تخت سے اتر کر میرے پاس کھڑا تھا۔ اس نے اپنی کھوپڑی سیاہ نقاب میں ڈھانپ لی تھی۔ شاید اس لیے کہ اب اسے مجھے خوف زدہ کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اس کا ہاتھ اِس طرح تھام لیا جیسے کوئی بچھڑا ہوا شخص اچانک اپنے کسی گہرے دوست کو دیکھ کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ میں دیوان پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ تمام سیاہ پوش دو دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑے تھے۔ شیطانی سردار نے خوش شکل لڑکیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ان میں سے ایک لڑکی میری طرف بڑھی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک سیاہ پیالہ تھا۔ شیطانی سردار نے پیالہ لے کر میرے ہاتھوں میں دیتے ہوئے اپنی زبان میں کہا:

"چلکاش! اسے پی جاؤ۔"

پیالے میں کالے رنگ کا کوئی مشروب تھا۔ جس میں سے سفید بھاپ کی بجائے کالے رنگ کے دھوئیں کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ مَیں نے پیالہ اپنے ہونٹوں کے ساتھ لگایا تو مجھے تیزاب ایسی تیز اور دماغ کو چڑھ جانے والی بُو محسوس ہوئی، مگر مجھے وہ بڑی اچھی لگی۔ میں نے سیاہ مشروب کا ایک گھونٹ بھرا۔ کڑوا اور بدذائقہ مشروب تھا مگر میں اسے خوشی خوشی ایسے پی گیا جیسے وہ میٹھا دودھ ہو۔ اس مشروب نے میرے شیطانی وجود کے رگ پے میں اتر کر اسے جرائم اور گناہوں کی انتہائی گہرائیوں میں پہنچا دیا۔ میرے شیطانی وجود میں برائی کی اگر کوئی کسر باقی رہ گئی تھی تو اسے اس شیطانی مشروب نے پورا کر دیا۔

سیاہ پوش شیطانوں کے سردار نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا:

"چلکاش! میں کون ہوں؟"

میں نے بڑے اعتماد سے کہا:

"تم ہمارے سردار ہو۔"

سردار نے دوسرا سوال کیا:

"جو میں چاہوں گا کیا تم وہ کرو گے؟"

یں نے دل و جان سے کہا:

"یں تمہارے حکم کا پابند ہوں سردار۔"

شیطانی سردار بولا:

"شاباش! مجھے تم ایسے معمول کی ضرورت تھی۔ مَیں نے اپنی ساری طاقت تمہیں دی ہے' جو کام میں نہیں کر سکتا وہ کام اب تم کرو گے۔"

یں نے کہا۔ "مجھے حکم کرو' مَیں تمہارا ہر کام کروں گا۔"

یہ جملے میں نہیں بول رہا تھا، یہ وہ منحوس عفریت بول رہا تھا جو ان لوگوں نے میرے میں تحلیل کر دیا تھا۔ میں تو اپنے وجود سے الگ ہو کر اپنے آپ کو ایک ایسے انسان روپ میں دیکھ رہا تھا جو شیطان کا چیلا بن چکا تھا اور کسی طرح سے بھی انسان کہلانے کا ر نہیں تھا۔ افسوس کہ میں بے بس تھا اور اپنے ہم شکل انسان نما عفریت کو نہ سمجھا تھا اور نہ کسی کام سے روک سکتا تھا۔ میری حیثیت بالکل ایک سائے کی طرح تھی جو ں کے ساتھ تو چل سکتا تھا لیکن نہ اس کو چھو سکتا تھا' نہ اس سے بات کر سکتا تھا۔

نی سردار نے دونوں بازو اوپر اٹھا دیئے۔

یہ ایک اشارہ تھا جس کو دیکھتے ہی موم بتیوں کے پاس کھڑی خوش شکل لڑکیوں میں سے لڑکی آگے بڑھی۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کا ہاتھ کسی مردے ہاتھ کی طرح ٹھنڈا تھا' شیطانی سردار نے لڑکی کو حکم دیا۔

"چلکاش کو اس کی منزل پر چھوڑ آؤ۔"

سیاہ پوش لڑکی مجھے لے کر دروازے کی طرف چل پڑی۔ میں اس کے ساتھ بڑا خوش ں چل رہا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ دروازے کی دوسری ف ایک سرنگ نما تنگ و تاریک راستہ تھا مگر میری آنکھیں اب اندھیرے میں بھی

بالکل صاف دیکھ سکتی تھیں۔ سرنگ نما تاریک راستہ ایک کیبن کے بند دروازے کے پاس جاکر ختم ہوگیا۔ سیاہ پوش لڑکی نے دروازے کو ہاتھ لگایا تو وہ کھل گیا۔ ہم کیبن میں داخل ہو گئے۔ یہاں دو بتیاں روشن تھیں۔ ایک سرخ اور ایک زرد ——— کیبن زیادہ بڑا نہیں تھا۔ دیوار پر مختلف رنگوں کی ایک تصویر بنی ہوئی تھی' جس میں ایک خوش پوش مرد نے ایک عورت کے پیٹ میں تلوار گھونپ رکھی تھی۔ عورت کے پیٹ سے تازہ سرخ خون بہہ رہا تھا۔ سیاہ پوش لڑکی نے مجھے اسی دیوار کے ساتھ کھڑے ہونے کو کہا۔ میں دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ سیاہ پوش لڑکی نے ایک تابوت کا ڈھکن اٹھا کر اس کے اندر سے سیاہ رنگ کا کوٹ' سیاہ رنگ کی پتلون' سیاہ رنگ کی قمیض اور سیاہ رنگ کے جوتوں کا جوڑا باہر نکالا اور اپنی سرخ آنکھوں سے میری طرف دیکھ کر کہا:

"اپنے کپڑے اتار دو۔"

میں نے خوش ہو کر سارے کپڑے اتار دیئے۔ سیاہ پوش لڑکی تابوت میں سے نکالے ہوئے کپڑے مجھے پہنانے لگی۔ مجھے نہ کوئی تعجب ہو رہا تھا' نہ کوئی ڈر خوف محسوس ہو رہا تھا۔ میں ایسے مطمئن تھا جیسے سیاہ پوش لڑکی کو ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ اس نے میرے گلے میں سیاہ ٹائی لگا دی۔ پھر جھک کر تابوت میں سے کھوپڑی کی شکل کی ایک کالی بوتل نکالی اور اس کو نیچے سے دبا کر میرے کپڑوں پر کوئی عطر چھڑک دیا۔ اس عطر کی بو یا خوشبو نے میرے دماغ میں چڑھ کر میرے اندر ایک وحشیانہ ہیجان پیدا کر دیا۔ سیاہ پوش لڑکی نے اپنی طلسمی زبان میں کہا:

"چلکاش! میرے ساتھ آکر لگ جاؤ۔"

میں تو حکم کا غلام بن گیا تھا۔ فوراً آگے بڑھ کر سیاہ پوش لڑکی کے ساتھ لگ گیا۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ لگا کر تین بار اتنی زور سے بھینچا کہ مجھے اپنا دم گھٹتا محسوس ہوا۔ اس نے مجھے الگ کر دیا اور بولی:

"میں نے طلسم کشا منتر تمہارے جسم میں تحلیل کر دیا ہے۔ یہ ہمارے لوگوں کا سب

سے طاقتور طلسمی منتر ہے۔ مگر ہم اس منتر کو اپنے طور پر انسانوں کی دنیا میں استعمال نہیں کر سکتے۔ اب ہماری جگہ تم اسے ہمارے لئے استعمال کرو گے اور وہ سب کچھ کرو گے جو ہم چاہتے ہیں۔ ہم جو کچھ چاہتے ہیں وہ بھی اس منتر کے ساتھ ہی تمہارے خون میں داخل کر دیا ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے ہم کیا چاہتے ہیں؟"

میں نے فوراً جواب دیا:

"ہاں ——— مجھے وہ سب کچھ معلوم ہو گیا ہے' جو آپ لوگ چاہتے ہیں۔"

سیاہ پوش لڑکی نے اپنے بازو کھول دیئے اور بولی:

"اب ایک بار پھر میرے ساتھ لگ جاؤ۔"

میں اس کے حکم کی تعمیل میں اس کے ساتھ لگ گیا۔ اس نے کہا:

"آنکھیں بند کر لو۔"

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے ہی میں نے آنکھیں بند کیں' میرے پاؤں زمین سے اوپر اٹھ گئے۔ پھر مجھے لگا کہ میں لڑکی کے سرد جسم کے ساتھ لپٹا ہوا میں اڑتا چلا جا رہا ہوں۔ میرے کانوں میں سمندر کی طوفانی موجوں کا شور گونج رہا تھا۔ میں جیسے طوفانی سمندر کے اوپر برق رفتاری سے پرواز کر رہا تھا۔ پھر سمندر کی طوفان خیز موجوں کا شور آہستہ آہستہ مدہم پڑتے پڑتے غائب ہو گیا۔ اب میرے کانوں میں سناٹا طاری تھا۔ مجھے ایسی بو محسوس ہونے لگی جیسے کسی نے تازہ دفن کئے ہوئے مردے کی قبر کھول دی ہو۔ میں آنکھیں نہیں کھول سکتا تھا۔ میں سیاہ پوش لڑکی کے حکم کا پابند تھا۔ اس نے مجھے آنکھیں بند رکھنے کا حکم دیا تھا۔ ہماری پرواز کی رفتار ہلکی ہونے لگی۔ پھر میرے پاؤں زمین کے ساتھ لگ گئے۔ سیاہ پوش لڑکی نے کہا:

"آنکھیں کھول دو۔"

میں نے آنکھیں کھول دیں اور دیکھا کہ ہم ایک قبرستان میں آ گئے ہیں۔ ہمارے ارد گرد قبریں ہی قبریں تھیں۔ ان قبروں پر سوکھی شاخوں والے درخت جھکے ہوئے تھے۔

ان کے اوپر زرد چاند نکلا ہوا تھا' جس کی ماتمی اداس روشنی میں قبرستان کی فضا اور زیادہ ڈراؤنی ہو رہی تھی مگر مجھے ذرا سا بھی ڈر محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ سیاہ پوش لڑکی میرے آگے آگے قبروں میں چلی جا رہی تھی۔ قبرستان کے نیم شکستہ گیٹ پر پہنچ کر وہ رک گئی۔ اس کی چمکتی ہوئی سرخ آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھی۔ کہنے لگی:

"ہمارے طاقتور منتر کے طلسمی اثر سے تم دنیا کی ہر زبان میں بات کر سکو گے۔ تم جیب میں ہاتھ ڈال کر جو نکالنا چاہو گے وہ نکل آئے گا۔ تم اپنے گوشت پوست کے جسم کے ساتھ بند دروازوں سے بھی گزر جاؤ گے۔ تم جہاں چاہو گے جا سکو گے مگر ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا، کسی گرجا گھر' کسی مسجد میں ہرگز ہرگز داخل نہ ہونا۔ اگر تم کسی مسجد یا گرجا گھر میں داخل ہو گئے تو تمہارا جو خوفناک انجام ہو گا اس سے تمہیں ہمارا طاقتور منتر بھی نہیں بچا سکے گا۔ ایک اور بات یاد رکھنا میں تمہیں دیکھ رہی ہوں گی' مگر تم مجھے نہیں دیکھ سکو گے۔ تم اس وقت پیرس کے شہر میں ہو۔ اگرچہ آدھی رات گزر چکی ہے مگر پیرس کا شہر راتوں کو بھی جاگتا ہے۔ جاؤ اور ہمارے سردار کے حکم کی تعمیل کرو۔"

میں قبرستان کے گیٹ سے نکل کر چھوٹی سی سڑک پر چل پڑا۔ میں نے تین چار قدم چلنے کے بعد مڑ کر قبرستان کے گیٹ کی طرف دیکھا۔ سیاہ پوش لڑکی غائب ہو چکی تھی۔

میرے سامنے پُراسرار زرد چاندنی میں ڈوبی ہوئی ایک ویران سڑک تھی جو لگتا تھا جن بھوتوں کے گاؤں کو جا رہی ہے۔ میں ایسے خوش خوش سڑک پر چلا جا رہا تھا' جیسے کسی شاندار پارٹی میں شرکت کرنے جا رہا ہوں۔ میں ایک بڑی سڑک پر آ گیا جو ذرا بلندی پر تھی۔ میں نے سڑک پر آ کر دوسری طرف نگاہ ڈالی تو حدِ نگاہ تک پیرس شہر کی روشنیاں ایسے جگمگا رہی تھیں' جیسے آسمان کے سارے ستارے زمین پر اتر آئے ہوں۔ یہ منظر اتنا دل فریب تھا کہ میں اس میں کھو گیا۔ مجھے ایک کار کے مدھم ہارن کی آواز سنائی دی۔ میں نے سڑک پر مڑ کر دیکھا۔ کسی کار کی روشنیاں میری طرف بڑھ رہی تھیں۔ یہ کار میرے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ سیاہ رنگ کی بڑی قیمتی کار معلوم ہوتی تھی۔ سفید وردی میں

س ڈرائیور اپنی سیٹ پر خاموش بیٹھا تھا۔ میرے کان میں سیاہ پوش لڑکی کی آواز آئی۔

"یہ تمہیں لینے آئی ہے، اس میں بیٹھ جاؤ۔" میں پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر کار ں بیٹھ گیا۔

میرے بیٹھتے ہی کار آہستہ سے آگے بڑھ گئی۔ کار بڑی سڑک پر سے گزرنے کے بعد رس شہر کی روشن فضاؤں میں داخل ہو گئی۔ کار عالی شان عمارتوں کے درمیان سے رتی چلی جا رہی تھی۔ پھر وہ ایک بہت بڑی عمارت کے سامنے بڑے آرام سے رک ئی۔

"یہ پیرس کا سب سے بڑا ہوٹل ہے۔ یہاں تمہیں سرخ بالوں والی ایک ارب پتی رت ملے گی' تم اسے پسند آ جاؤ گے۔ وہ تم سے محبت کا اظہار کرے گی۔ تم بھی اس ے محبت کا اظہار کرو گے۔ وہ تمہیں اپنے بنگلے پر لے جائے گی، تم اس کا شکار ہو گے۔ رہ تمہارا شکار نہیں ہو گی، تمہارا شکار اس عورت کی نوجوان لڑکی فینی ہو گی۔ تم فینی کو نے منتر کی مدد سے اپنے دام میں لے لینا۔ وہ رات کے پچھلے پہر تمہیں اپنے کمرے میں نے کو کہے گی۔ تم اس کے کمرے میں جاؤ گے۔ آگے تمہیں جو کچھ کرنا ہے وہ تمہیں ہاں بتاؤں گی۔"

یہ سیاہ پوش لڑکی نے میرے دل میں بات ڈالی تھی۔ مجھے اب اس کی آواز نہیں آئی ی بلکہ اس نے اپنے دل کی بات میرے دل میں ڈال دی تھی اور میرے دل نے ں بات کو میرے ذہن نشین کروایا تھا۔ ہوٹل کے باہر فٹ پاتھ پر سرخ قالین بچھا ہوا ۔ ایک دراز قد وردی پوش ملازم نے آگے بڑھ کر میری گاڑی کا دروازہ کھولا اور جھک ر میری تعظیم کی۔ میں مسکراتا ہوا ہوٹل کے شیشے کے دروازے میں داخل ہو گیا۔

ہوٹل کے ہال میں کوئی پارٹی ہو رہی تھی۔ ایسی ایسی خوش لباس اور خوبصورت ئی زیورات اور ہیرے جواہرات سے سجی بنی عورتیں موجود تھیں کہ میں نے ایسی رتیں پہلے کبھی نہیں دیکھیں تھیں۔ کچھ جوڑے بانہوں میں بانہیں ڈالے ڈانس کر رہے

تھے۔ ہلکی ہلکی موسیقی کی دھن بج رہی تھی۔ بیرے مشروبات کے طشت لئے اِدھر اُدھر چل پھر رہے تھے۔ بڑے قیمتی عطریات اور اعلیٰ سگریٹوں کی خوشبوؤں اور مشروبات کی بُو سے فضا بوجھل ہو رہی تھی۔ میں سیاہ سوٹ میں ملبوس تھا۔ میں ایک طرف ستون کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ میرا دل سگریٹ پینے کو چاہا۔ حالانکہ اس سے پہلے میں نے کبھی سگریٹ نہیں پیا تھا۔

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو جیب میں سگریٹ کہیں پہلے سے موجود تھا۔ میں نے اسے باہر نکال کر دیکھا۔ یہ بڑا قیمتی سگریٹ کیس تھا' جس کے ساتھ سنہری لائیٹر لگا ہُوا تھا۔ میں نے سگریٹ کیس کھول کر ایک سگریٹ سلگا لیا۔ میں عادی سگریٹ پینے والے کی طرح کش لگانے لگا۔ میری متلاشی نگاہیں ارب پتی سرخ بالوں والی عورت کو تلاش کر رہی تھیں لیکن اس عورت نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ ایک بیرا بڑے ادب سے میرے قریب آ کر ذرا سا جھکا اور اس نے میرے کان کے قریب ہو کر فرنچ زبان میں کہا:

"مادام سپنوزما آپ کو یاد کر رہی ہیں۔"

بیرے نے جس طرف اشارہ کیا میں نے اس طرف دیکھا کہ سنگِ مرمر کے دو ستونوں کے درمیان ایک سنہری صوفے پر ایک سرخ بالوں والی بھاری بھرکم عورت بیٹھی سگریٹ ہولڈر انگلیوں میں دبائے ایک بازو صوفے پر پھیلائے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے سر کی ہلکی سی جنبش سے مجھے اپنی طرف بلایا۔ سفید ریشمی دستانے اس عورت کی کہنیوں تک چڑھے ہوئے تھے۔

سیاہ پوش لڑکی نے جس طرح کہا تھا' اسی طرح ہو رہا تھا۔ یہ سیاہ پوش سردار کے سب سے طاقتور طلسم کا اثر تھا' جس نے اس ارب پتی عورت کو میری طرف متوجہ ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں اس کے پاس چلا آیا۔ اس نے مجھے اپنے پاس صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور مجھ سے پوچھا کہ کیا میں مراکش کے کسی قبیلے کا سردار ہوں۔ وہ میرا چہرہ جانے کس انداز میں دیکھنے پر مجبور تھی۔ مَیں کیا تھا اور اسے کیا نظر آ رہا تھا، یہ طلسم کا کھیل تھا۔ اِس

میرے اور اس عورت کے ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا۔ ایک دو لمحوں میں ہم نے
تی کے سب ابتدائی مراحل طے کر لئے اور اس نے سیاہ پوش لڑکی کے کہنے کے مطابق
ے اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دے دی۔ مَیں خود اس کے ساتھ جانے کو بے تاب تھا'
ونکہ میں جانتا تھا کہ اس کی جس خوبصورت نوجوان بیٹی تک مجھے پہنچنا ہے وہ اس کے
ل پر موجود ہوگی۔

اس ارب پتی عورت کا بنگلہ ایک عالی شان محل کی طرح تھا۔ اس نے مجھے ایک سجے
ے پُر تکلف ڈرائینگ روم میں بٹھایا' یہ کہہ کر کہ میں ابھی آتی ہوں چلی گئی۔ مَیں بیٹھا
یٹ پیتا رہا۔ سامنے قد آدم آئینہ تھا۔ مَیں نے اٹھ کر اس میں اپنا عکس دیکھا۔ مجھ سے
چہرہ پہچانا نہ گیا۔ میرا رنگ گہرا سانولا اور بال حبشیوں کی طرح گھنگھریالے ہو گئے تھے۔
ے گال پر زخم کا ایک گہرا نشان بن گیا تھا جو میری بائیں آنکھ سے لے کر نیچے جبڑے
چلا گیا تھا۔ مَیں شکل ہی سے جرائم پیشہ آدمی لگتا تھا۔ ارب پتی عورت آ گئی۔ اس
لمبا ریشمی گاؤن پہنا ہُوا تھا۔ وہ مجھ سے فرنچ میں باتیں کرنے لگی۔ یہ علمی منتر کا اثر تھا
مَیں بھی فرنچ زبان بڑی روانی سے بول رہا تھا۔ مَیں نے اسے بتایا کہ مَیں مراکش کے
قبیلے کے سردار کا اکلوتا بیٹا ہوں اور سیر و سیاحت کے لئے پیرس آیا ہوا ہوں۔ وہ
ئی لے کر بولا:

"مجھے نیند آ رہی ہے۔ کیا تمہیں نیند نہیں آ رہی؟"

اور وہ مجھے لے کر اپنے بیڈ روم میں آ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے بستر پر گہری نیند سو
ی تھی۔ یہ سب کچھ مشروبات کا اثر تھا اور زیادہ میرے طلسم کا اثر تھا۔ میں اسے سوتا چھوڑ
کمروں کی تلاشی لینے لگا۔ مجھے اس کی بیٹی فینی کی تلاش تھی۔ آخر ایک کمرے میں مجھے
ن شکل نوجوان لڑکی ریشمی بستر پر سوتی ہوئی نظر آ گئی۔ مَیں نے اسے جھک کر دیکھا۔
ے دل میں سیاہ پوش عورت کی آواز خیال بن کر بیدار ہوئی کہ یہ فینی ہے۔ فینی ایک
ٹ پہلو کر کے سو رہی تھی۔ سیاہ پوش عورت کی دبی ہوئی آواز آئی۔

"اسے سیدھا کر دو۔ یہ اب نہیں جاگے گی۔"

مَیں نے اسے سیدھا کر دیا۔ اس کا ریشمی شب خوابی کا لباس اس کے سینے سے ہٹا ہُوا تھا۔ مَیں اسے ٹکٹکی باندھ کر تکنے لگا۔ میرے دماغ میں اس وقت سوائے مجرمانہ خیالات کے اور کچھ نہیں تھا۔ سیاہ پوش لڑکی نے بتایا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ مَیں اس کے کہنے کے مطابق ایک روبوٹ کی طرح عمل کر رہا تھا۔ مَیں نے لڑکی کے سینے پر سے کپڑا ہٹا کر اسے کافی نیچے تک کر دیا۔ میرے دماغ پر اس وقت ایک وحشت سی سوار ہو چکی تھی۔ مَیں نے سیاہ پوش لڑکی کی ہدایت کے مطابق لڑکی کے سینے اور پیٹ کے درمیان اپنی ایک انگلی رکھ کر اسے دبایا۔ میری انگلی لڑکی کے جسم میں اس طرح بڑے آرام سے اندر تک چلی گئی جیسے اس کا جسم آٹے کی طرح گندھا ہُوا ہو۔ مَیں نے دوسری اور پھر تیسری انگلی اور پھر اپنے پورا پنجہ لڑکی کے سینے میں اتار دیا۔ میرا ہاتھ کلائی تک لڑکی کے سینے کے اندر چلا گیا تھا اور نہ وہاں زخم کا کوئی نشان اُبھرا تھا اور نہ خون کا ایک قطرہ بہا تھا۔ مَیں نے اس کے جسم کے اندر کوئی دھڑکتی ہوئی شے محسوس کی۔ یہ اس لڑکی کا دل تھا۔ مَیں نے اسے اپنی ہتھیلی میں پکڑ لیا۔ اس کا دل میری ہتھیلی میں دھڑک رہا تھا۔ مَیں لڑکی کے دل کو اپنی ہتھیلی میں پکڑے، اپنا ہاتھ اس کے سینے کے اندر ڈالے اسی طرح اس کے اوپر جھکا رہا کہ سیاہ پوش لڑکی کی آواز آئی:

"رک کیوں گئے؟ اس کے دل کو ایک جھٹکے سے باہر نکال لو۔"

مَیں نے فوراً جھٹکے سے لڑکی کا دل باہر نکال لیا۔ لڑکی کا دل میرے ہاتھ میں تھا۔ دل خون میں لتھڑا ہُوا تھا اور ابھی تک دھڑک رہا تھا۔ لیکن لڑکی کا سینہ میرے ہاتھ نکالنے کے ساتھ ہی بند ہو گیا تھا اور ایسے لگ رہا تھا کہ وہاں کسی نے ایک خراش تک نہیں ڈالی

سیاہ پوش لڑکی کی آواز آئی:

"لڑکی کے دل کو اپنی جیب میں ڈال کر اس سے کہو۔ "فینی' اٹھو! میرے ساتھ چلو۔ تمہارے چلنے کا وقت ہو گیا ہے۔"

مَیں نے لڑکی کا خون میں لتھڑا ہُوا دل اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا اور پلنگ کے قریب ہی چپ چاپ کھڑا رہا۔ اتنے میں لڑکی نے پہلو بدلتے ہوئے مجھے دیکھا تو اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میری طرف غصے کی نگاہوں سے دیکھا اور بولی:

میرا دل مجھے واپس کر دو۔ میرا دل مجھے واپس کر دو۔"

مَیں اس کی طرف دیکھتا رہا اور شیطانوں کی طرح ہنستا رہا۔ لڑکی کا جیسے دم گھٹنے لگا۔ اس
دو تین بار ہچکی لی اور پلنگ پر اپنا آپ گرا دیا۔ سیاہ پوش لڑکی کی آواز آئی۔۔۔

"تم دیر کیوں لگا رہے ہو۔ کہیں مارے نہ جاؤ۔ اس لڑکی کو اٹھاؤ اور قبرستان لے آؤ۔
تمہیں قبرستان کے گیٹ پر ملوں گی۔"

مَیں نے ایک سدھائے ہوئے عفریت کی طرح لڑکی کو کندھے پر ڈالا اور کمرے سے
آیا۔ آگے زینہ نیچے جاتا تھا۔ مَیں زینہ اتر کر نیچے جنگلے کی لابی میں آیا تو سامنے اچانک
فوجی وردی والا گارڈ آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس نے پستول کا رخ میری
کر کے کہا۔ "کون ہو تم؟ لڑکی کو فوراً نیچے اتارو۔"

مَیں نے اس کی بات سنی اَن سنی کر دی۔ اس نے میری ٹانگوں کا نشانہ لے کر سامنے
فائر کر دیا۔ ایک دھماکہ ہُوا۔ مجھے محسوس ہُوا کہ کوئی لوہے کی گرم شے میری ٹانگ
ٹکرا کر نکل گئی ہے۔ مجھ پر کچھ اثر نہ ہُوا۔ گارڈ تنومند اور تربیت یافتہ تھا۔ اس نے
ڈ کراٹے والوں کی طرح لپک کر اپنی کہنی میرے منہ پر ماری۔ مجھے غصہ آ گیا۔
وش لڑکی کو مَیں نے اسی طرح اپنے بائیں کندھے پر ڈالے رکھا اور سیدھے ہاتھ
گارڈ کی گردن پکڑ لی۔ مجھے خود محسوس ہُوا کہ میرے پنجے کی گرفت ہزاروں شکنجے جیسی
ئی ہے۔ خدا جانے میری گرفت میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی کہ مَیں نے پکڑے
ے باڈی بلڈر قسم کے گارڈ کو اوپر اٹھا لیا۔ مَیں اس کی شہ رگ کو بدستور دبائے ہوئے

مجھے نہیں پتہ کہ مجھ میں اتنی طاقت کہاں سے آگئی تھی۔

یہ ضرور طلسمی منتروں کا ہی اثر تھا۔ تومند ٹارزن قسم کا گارڈ میرے ہاتھ میں زمین
سے ایک فٹ بلند مردہ چوہے کی طرح لٹک رہا تھا۔ میں نے اسے نیچے گرا دیا۔ وہ مرچکا
تھا۔ مَیں بڑے آرام کے ساتھ کسی خوف و ہراس کا مظاہرہ کئے بغیر بنگلے کی ویران لابی سے
نکل کر پورچ میں آیا تو وہاں وہی سیاہ کار کھڑی تھی جو مجھے قبرستان والی سڑک سے ہوٹل
میں لے گئی تھی۔ ڈرائیور اسی طرح اپنی سیٹ پر پتھر کے بت کی طرح بیٹھا ہُوا تھا۔ مَیں
نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر بے ہوش لڑکی کو سیٹ پر گرا دیا اور خود بھی بیٹھ گیا۔
گاڑی خاموشی سے بنگلے کے گیٹ سے نکلی اور پیرس کی سڑکوں پر آگئی۔ ہر سڑک روشن
تھی' ٹریفک بہت کم تھا۔ کسی کسی وقت کوئی گاڑی گزر جاتی تھی۔ کار جس راستے سے مجھے
لائی تھی' اسی راستے سے واپس جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ قبرستان کے پاس سے گزر۔
والی بڑی سڑک آگئی۔ یہاں سے کار چھوٹی سڑک پر ہو گئی اور پھر قبرستان کے گیٹ میں
داخل ہونے کے بعد ایک طرف رک گئی۔ وہاں سیاہ پوش لڑکی پہلے سے موجود تھی۔ اس
کے پیچھے دو سیاہ پوش بھی کھڑے تھے۔ کار رُکی۔ مَیں کار سے باہر آیا۔ سیاہ پوش لڑکی۔
اپنے پیچھے کھڑے سیاہ پوشوں کو اشارہ کیا۔ وہ کار کی طرف بڑھے اور ایک سیاہ پوش۔
لڑکی کو نکال کر اپنے کاندھے پر ڈال لیا۔

وہ لڑکی کو اٹھائے قبروں کی طرف چل پڑے۔ مَیں سیاہ پوش لڑکی کے ساتھ ساتھ چل
تھا۔ یہاں ایک گنبد نما پرانی عمارت تھی۔ اس کی دیوار میں اندر جانے کا راستہ تھا۔
بھی ان سیاہ پوش شیطانوں کے ہمراہ عمارت کے اندر داخل ہو گیا۔ اندر گھپ اندھیرا
۔ مگر اُن سیاہ پوش شیطانوں کی طرح اب میری آنکھیں بھی اندھیرے میں سب کچھ دیکھ
ی تھیں۔ یہ ایک غار کی طرح کا راستہ تھا۔ میرا پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا۔ میں نے دیکھا
۔ یہ ایک انسانی کھوپڑی تھی جو زمین سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ مجھے کوئی خوف محسوس نہ
ا' نہ عبرت کا احساس ہُوا۔ میرے لئے جیسے انسانی کھوپڑی اور پتھر اینٹ ایک برابر تھے۔
ایک کمرے میں آگئے جس کی دیواروں میں انسانی کھوپڑیاں آدھی باہر نکلی ہوئی
یں۔ یہاں مردہ جسموں اور ہڈیوں کی بُو پھیلی ہوی تھی جو مجھے بڑی اچھی لگ رہی تھی۔
ں لڑکی کو ایک تختے پر ڈال دیا گیا۔ دونوں سیاہ پوش مرد ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو
ے۔ سیاہ پوش لڑکی مجھے ساتھ لے کر دوسری طرف کھڑی ہو گئی۔ ایک سیاہ پوش نے
ں سے عجیب سی آواز نکالی۔ یہ آواز ایسی تھی جیسے کوئی مر رہا ہو اور جان کنی کی حالت
ں ہو۔

ان آوازوں کے بعد دو تین منٹ تک اس مردہ کھوپڑیوں والے کمرے میں موت
ی خاموشی چھائی رہی۔ پھر گڑگڑاہٹ کی آواز کے ساتھ ایک دیوار کی سِل اپنی جگہ سے
ٹ گئی اور وہی سیاہ پوش سردار جس نے مجھ پر منتر پھونکا تھا بڑی شان سے قدم اٹھاتا'
ا انگارہ ایسی آنکھوں سے بالکل سیدھ میں دیکھتا اندر آگیا۔ اس نے مجھے دیکھا اور پوچھا:
"لڑکی کا دل نکالو۔"

مَیں نے جیب میں سے لڑکی کا دل نکال کر سیاہ پوش شیطانی سردار کی طرف بڑھایا۔ دل
ا تک آہستہ آہستہ دھڑک رہا تھا اور اس کے اوپر خون کی ایک تہہ جم چکی تھی۔
طانی سردار نے لڑکی کا دھڑکتا ہوا دل اپنے ہاتھ میں لے کر ہاتھ اوپر اٹھا لیا۔ پھر اپنا
وپڑی والا منہ اس کے نیچے کر کے کھوپڑی کا منہ کھول دیا۔ اس کے ہڈیوں والے ہاتھ

میں پکڑے ہوئے دل میں سے خون کے قطرے کھوپڑی کے جبڑوں میں ٹپکنے لگے۔ کھوپڑی کا جبڑا اس طرح اوپر نیچے ہو رہا تھا جیسے وہ خون کو پی رہی ہو۔ شیطانی سردار نے ہاتھ نیچے کر لیا اور اشارہ کیا۔ اس کے پیچھے کچھ فاصلے پر دو سیاہ پوش سیاہ رنگ کا ایک چھوٹا بکس جس کی شکل تابوت کی طرح تھی لئے کھڑے تھے۔ اشارہ پا کر وہ بکس لے کر آگے بڑھے۔ شیطانی سردار نے لڑکی فینی کا دل بکس میں ڈال کر اس کا ڈھکنا بند کر کے سیاہ پوشوں سے کہا:

"اسے لے چلو۔"

سیاہ پوش تابوت کی شکل کا سیاہ بکس لے کر چلے گئے۔ سردار نے اب میری طرف اپنی انگارہ آنکھوں سے دیکھا۔ اس کی کھوپڑی کے جبڑے پر خون لگا ہوا تھا۔ وہ اپنی جناتی زبان میں بولا:

"چلاکاش! اب میں تمہیں ایک اور مہم پر بھیج رہا ہوں۔۔۔ یاد رکھو' یہ مہم پہلی مہم سے زیادہ اہم بھی ہے اور خطرناک بھی ہے۔ یونان کے شہر ایتھنز سے ایئر فرانس کی ایک فلائیٹ سیون تھری وَن دو سو مسافروں کو لے کر پیرس آ رہی ہے۔ اس فلائیٹ میں دنیا کی حسین ترین لڑکی مس یونیورس بھی اپنے باڈی گارڈ کے ساتھ پیرس آ رہی ہے۔ وہ پیرس کے گرینڈ ہوٹل میں ٹھہرے گی۔ ہوٹل میں اس کے لئے تین کمروں کا فلیٹ پہلے سے بک ہو چکا ہے۔ اس حسین لڑکی مس یونیورس کا نام جیولانی ہے۔ تمہیں اس لڑکی کا دل نکال کر اسے اسی طرح ہمارے پاس لانا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے تم پہلے اس سے تھوڑی بہت جان پہچان پیدا کرو اور اسے اپنی باتوں اور اپنے طلسمی اثرات سے متاثر کرو۔ چنانچہ تم ایتھنز سے مس یونیورس کے ساتھ جہاز میں سوار ہو گے۔ اس فلائیٹ کی فسٹ کلاس میں لوئیس ڈنیٹے نام سے تمہاری ایک سیٹ ہم نے بک کرا دی ہے' ہم تمہیں یہاں سے ایتھنز کے ایئرپورٹ پر پہنچا رہے ہیں۔ یہ لفافہ اپنے پاس رکھو۔ اس میں تمہارے نام کا پاسپورٹ' پچاس ہزار امریکی ڈالر اور ویزے وغیرہ کے دوسرے ضروری

کاغذات ہیں۔ مس یونیورس اٹالین ہے اور ہمارے طلسمی منتروں نے تمہارے اندر یہ صلاحیت پیدا کر دی ہے کہ تم سوائے جنات اور چڑیلوں اور بدروحوں کی زبان کے دنیا کی ہر زبان بول اور سمجھ سکتے ہو۔ تم مس یونیورس سے اٹالین زبان میں بات کرو گے اور اپنا نام لوئیس ڈانیٹے بتاؤ گے اور یہ ظاہر کرو گے کہ کولمبیا میں تمہارے تیل کے کنوئیں ہیں' جو کچھ میں کہہ رہا ہوں کیا تم اسے سمجھ رہے ہو؟"

میں نے فوراً جواب دیا:

"بالکل سمجھ رہا ہوں۔"

شیطانی سردار بولا:

"ہم نے جادو کے زور سے تمہارے اندر بہت زبردست طاقت پیدا کر دی ہوئی ہے۔ تم پر سامنے سے گولی کا اثر نہیں ہو سکتا لیکن اگر گولی تمہارے سر میں لگی تو تم مر جاؤ گے۔ تمہیں اپنے سر کی حفاظت کرنی ہوگی۔ اس بات کی میں تمہیں ایک بار پھر یاد دہانی کرانا ضروری سمجھتا ہوں کہ پیرس شہر میں آ کر ہرگز ہرگز کسی گرجا گھر یا کسی مسجد میں داخل مت ہونا۔"

پھر اس نے سیاہ پوش خوش شکل لڑکی سے کہا:

"چلاکاش کو اپنے ساتھ ایتھنز کے ایئرپورٹ پر لے جاؤ اور اسے ایئر فرانس کی فلائیٹ سیون تھری وَن میں سوار کرا کے پیرس میں آ کر اس کا انتظار کرو۔"

یہ وہی خوش شکل سیاہ پوش لڑکی تھی جو مجھے اپنے ساتھ قبرستان کے گیٹ پر لائی تھی۔ سیاہ پوش لڑکی نے آگے بڑھ کر مجھے اپنے ساتھ لگا کر زور سے بھینچا۔ میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ میں نے اس سے پہلے شیطانی سردار کے ہاتھ سے لفافہ لے کر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ پہلے کی طرح میرے پاؤں لڑکی سے بغل گیر ہوتے ہی زمین سے اوپر اٹھ گئے اور میں جیسے بڑی تیز رفتاری سے فضاؤں میں پرواز کرنے لگا۔ پہلے کی طرح اس دفعہ بھی میں اپنی آنکھیں نہیں کھول سکتا تھا اور میرے کانوں میں سمندری طوفانوں کا شور بلند ہو رہا

تھا۔ پھر یہ شور آہستہ آہستہ ماند پڑ گیا اور ایک سناٹا چھا گیا۔ اس کے بعد مجھے کوئی خبر نہ رہی کہ میں کہاں ہوں۔

کتنا وقت گزر گیا تھا؟ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میرے کانوں میں سیاہ پوش لڑکی کی دھیمی سرگوشی سنائی دی۔

"آنکھیں کھول دو۔"

میرے پاؤں زمین پر لگ چکے تھے۔ میں نے آنکھیں کھول دیں تو کیا دیکھتا ہوں کہ شیشوں کی ایک لمبی چوڑی دیوار کے پاس میں ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھا سونے کے سگریٹ ہولڈر میں سگریٹ لگائے پی رہا ہوں۔ میرے سامنے تپائی پر کافی کی چینک اور ایک پیالی پڑی ہے۔ فاصلے پر اس طرح کے کچھ اور صوفوں اور میزوں کے پاس گورے مرد اور عورتیں بیٹھی چائے کافی وغیرہ پیتے ہوئے ایک دوسرے سے دھیمی آواز میں مصروفِ گفتگو ہیں۔ مَیں نے اپنے سراپا پر ایک نظر ڈالی۔ مَیں انتہائی قیمتی سوٹ میں ملبوس تھا اور بڑی قیمتی ریشمی ٹائی لگا رکھی تھی۔ میرے شوز بھی بڑے قیمتی تھے۔ شیشے کی دیوار کی دوسری طرف ایئر پورٹ کے رَن وے دکھائی دے رہے تھے۔ مَیں ایئر پورٹ کے وی آئی پی لاؤنج میں تھا اور یہ ایتھنز کا ایئرپورٹ ہی ہو سکتا تھا۔ مَیں نے جیب سے لفافہ نکال کر کھولا۔ اس میں ایک اور لفافہ تھا' اس دوسرے لفافے میں پچاس ہزار ڈالر کے نوٹ تھے۔ اسی لفافے میں میرا پاسپورٹ تھا اور ویزے کے کاغذات وغیرہ تھے۔ پاسپورٹ پر میری تصویر بھی لگی تھی' مجھے اطالوی باشندہ ظاہر کیا گیا تھا اور میرا نام لوئیس ڈانٹے لکھا ہوا تھا۔ ایک وردی پوش بیرے نے آ کر مجھ سے بڑے ادب سے یونانی زبان میں پوچھا کہ مجھے کچھ اور تو نہیں چاہیے۔ شیطانی طلسم کے اثر سے یونانی زبان بھی پوری طرح میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ میں نے یونانی زبان میں ہی اسے کہا کہ مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔ پھر اس سے پوچھا کہ پیرس جانے والی ایئر فرانس کی فلائیٹ ایتھنز پہنچ چکی ہے یا نہیں۔ اس نے میز کے شیشے کو سفید رومال سے صاف کرتے ہوئے کہا:

"سر! یہ فلائیٹ پہنچنے ہی والی ہے۔"

مجھے سیاہ پوش لڑکی نے جب ایتھنز کے ایئرپورٹ لاؤنج میں پہنچایا اس وقت سہ پہر ہو تھی۔ اتنے میں ایک نہایت حسین و جمیل لڑکی بڑے قیمتی لباس میں لاؤنج میں داخل ی۔ اس کے دائیں بائیں دو عورتیں اور پیچھے چار باڈی گارڈ تھے جو اس کے سیکورٹی ڈ بھی تھے۔ یہ مس اطالوی نژاد حسینۂ عالم مس جیولانی ہی ہو سکتی تھی۔ مس حسینہ عالم ی شان اور وقار کے ساتھ چلتی ہوئی اور وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں پر اپنی مسکراہٹوں کے ل نچھاور کرتی صوفے پر بیٹھ گئی۔ دونوں عورتیں اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئیں۔ ایک رت نے میک اپ بکس اٹھا رکھا تھا۔ باڈی گارڈ جو مسلح نہیں تھے' اس کے پیچھے کھڑے گئے۔ ایئر پورٹ اور ایئر فلائیٹ میں اسلحہ ساتھ لے کر سفر کرنے کی کسی کو اجازت نہیں تی۔

لاؤنج کے سپیکر پر یونانی زبان میں اعلان کیا گیا کہ ایتھنز ایئرپورٹ کا عملہ مس نیورسل مس جیولانی کو خوش آمدید کہتا ہے۔ وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں نے تالیاں بجا کر اعلان کا خیر مقدم کیا۔ میری نگاہیں حسینہ عالم پر جمی ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے زیادہ دور یں تھی۔ صوفوں کے دوسرے سیکشن میں بیٹھی تھی۔ اس کا رخ میری طرف ہی تھا۔ نے محسوس کیا کہ مس حسینہ عالم ہی تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد میری طرف دیکھ ہے۔ یہ اس طلسم کا اثر تھا جو مجھ پر پڑھ کر پھونکا گیا تھا۔ طلسم نے جسے میں کالا جادو وں تو زیادہ مناسب ہوگا' میرے چہرے کو عورتوں کے لئے اور خاص طور پر مس حسینہ لم کے لئے زیادہ پرکشش بنا دیا تھا۔ اس طرح سے میرا کام آسان ہو گیا تھا۔ ایک دفعہ حسینہ عالم نے میری طرف دیکھا تو میں نے مسکرا کر اسے سلام کر دیا۔ اس نے میری کراہٹ کا جواب مسکراہٹ میں دیا اور دوسری طرف منہ کر کے عورتوں سے باتیں رنے لگی۔

اس دوران فلائیٹ نمبر سیون تھری وَن کے لینڈ کرنے کا اعلان ہو گیا۔ میں اپنی جگہ

بیٹھا سوچتا رہا کہ اس لڑکی کو اغوا کرنا میری طلسمی طاقتوں کے ہوتے ہوئے بھی اتنا آسان نہیں ہے۔ اس کے سیکورٹی گارڈ کے پاس اس وقت اسلحہ نہیں ہے لیکن لازمی طور پر جب یہ پیرس کے ایئر پورٹ سے باہر نکلیں گے تو ان کو اسلحہ مل جائے گا۔ اگر پیرس کے گرینڈ ہوٹل سے رات کے وقت مس حسینہ عالم کو اٹھا کر لے جاتے ہوئے یا اس کے گرینڈ ہوٹل والے فلیٹ میں داخل ہوتے وقت سیکورٹی گارڈ سے مڈبھیڑ ہو گئی اور انہوں نے مجھ پر فائرنگ کر دی تو میرے لئے اپنا سر بچانا مشکل ہو جائے گا۔ شیطانی سردار نے مجھے خبردار کر دیا تھا کہ گولی کا اثر میرے جسم کے کسی حصے پر نہیں ہو گا' لیکن اگر سر میں گولی لگی تو کھوپڑی اڑ جائے گی۔ بس مجھے اسی کی فکر تھی۔ تھوڑی دیر بعد اعلان ہُوا کہ فلائیٹ سیون تھری وَن کے مسافر جہاز پر تشریف لے چلیں۔ فسٹ کلاس کے گیٹ سے گزرنے والے مسافر بہت تھوڑے تھے۔ مَیں نے ذرا تیز قدم چل کر مِس حسینہ عالم جیولانی کے قریب ہونے کی کوشش کی تو سیکورٹی گارڈ کے آدمی میرے اور حسینہ عالم کے درمیان آ گئے۔ مَیں خاموشی سے دوسری طرف ہٹ گیا۔ اس وقت میں کسی سے لڑائی جھگڑا مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس طرح میرا مشن خراب ہو سکتا تھا۔

فسٹ کلاس کے مسافروں کو لے کر آرام دہ ویگن جہاز کے فسٹ کلاس والے دروازے کی سیڑھی سے چند قدموں کے فاصلے پر رک گئی۔ سب سے پہلے حسینہ عالم نیچے اتری۔ ایئر ہوسٹسوں نے تالیاں بجا کر اس کا استقبال کیا۔ مَیں قطار میں کافی پیچھے تھا۔ فسٹ کلاس کے مسافر پندرہ سولہ ہی تھے۔ فسٹ کلاس کی نشستیں صوفہ ٹائپ کی تھیں اور مسافر ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے۔ یہاں بھی مِس یونیورس کا صوفہ اتفاق سے میرے قریب ہی تھا۔ مَیں نے سوچا کہ اب مجھے پہل کر ہی دینی چاہیے۔ مَیں نے جیب سے اپنا ایئر ٹکٹ نکالا اور سنہری قلم لے کر مِس یونیورس کے پاس جا کر اطالوی زبان میں بڑی شائستگی کے ساتھ اس سے اس کا آٹو گراف مانگا۔ قریب سے دیکھنے پر مِس یونیورس زیادہ حسین معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے ایئر ٹکٹ اور قلم میرے ہاتھ

ے لیا اور اطالوی زبان میں بولا:

"سینور! کیا تم اٹالین ہو؟"

یں نے کہا: "یس سینوریتا! مَیں اطالوی ہوں۔ میرا نام لوئیس ڈانٹے ہے اور کولمبیا میں ے تیل کے کنوئیں ہیں۔ مس حسینہ عالم میرا قیمتی لباس اور سونے کی گھڑی اور میری پر لگے ہوئے ہیرے کے پن سے بھی میری امارت کا اندازہ لگا چکی تھی۔ یورپ امریکہ عالمی مقابلہ حسن میں اول آنے والی لڑکیاں عام طور پر حسینہ عالم بن جانے کے بعد ب پتی لوگوں کی تلاش میں ہوتی ہیں کہ جن کے پاس کچھ وقت گزار کر زیادہ سے زیادہ اپنے نام بینک میں جمع کرا سکیں۔ دوسرے میڈیا کے مقابلے میں وہ ارب پتی تاجروں یادہ ترجیح دیتی ہیں۔

حسینہ عالم نے میرے ٹکٹ پر اپنا آٹو گراف دے کر کہا: "آپ پیرس جا رہے ہوں ؟"

یں نے کہا۔ "جی ہاں! میں کاروباری مصروفیات کے سلسلے میں پیرس ہی جا رہا ہوں۔"

حسینہ عالم نے مسکراتے ہوئے کہا:

"میں گرینڈ ہوٹل میں ہوں گی۔ مجھے ضرور فون کیجئے گا۔"

میں یہی چاہتا تھا۔ کالا جادو اپنا کام کر گیا تھا۔ میں نے کہا:

"مجھے بڑی خوشی ہو گی۔"

اور میں اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ جہاز ایتھنز کے ایئر پورٹ سے ٹیک آف کر گیا۔ کافی ا پر جانے کے بعد جہاز سیدھا ہو گیا اور ایک طے شدہ رفتار کے ساتھ پیرس کی جانب نہ ہو گیا۔ ایئر ہوسٹسیں مسافروں کی دیکھ بھال کرنے لگیں۔ مسافروں کو مختلف قسم کے بات دیئے جانے لگے۔ فسٹ کلاس کے مسافروں کی کچھ زیادہ ہی آؤ بھگت ہوتی ۔ اس دوران میرا اور حسینہ عالم مِس جیولانی کا آپس میں مسکراہٹوں کا تبادلہ برابر جاری جہاز کو اپنی معمول کی پرواز پر روانہ ہوئے پندرہ بیس منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ

اکانومی کلاس میں کچھ آوازیں سنائی دیں۔ پھر کوئی تیز تیز قدموں سے فسٹ کلاس کی طرف بڑھا' پردہ ایک دم سے ہٹا اور ایک نوجوان نے پستول مسافروں پر تان کر کہا:

"ہمیں مسافروں سے کوئی کام نہیں لیکن اگر کوئی مسافر اپنی جگہ سے ہلا تو اسے گولی سے اڑا دیا جائے گا۔ جہاز کو ہم نے ہائی جیک کر لیا۔"

اس کے پیچھے سے دو کمانڈو ٹائپ کے نوجوان تیزی سے نکل کر کاک پٹ کی طرف بڑھے۔ جہاز کے کاک پٹ کا دروازہ اندر سے لاک کیا ہوا ہوتا ہے۔ دونوں نوجوانوں کے ہاتھوں میں برین گنیں تھیں۔ وہ برین گنوں کا رخ مسافروں کی طرف کر کے دروازے کی دونوں جانب کھڑے ہو گئے اور پستول والے ساتھی کو اشارہ کیا' وہ لپک کر کاک پٹ کے دروازے کے پاس آ گیا اور اس نے دروازے کی تالے والی جگہ پر نیچے رخ پر فائر کر دیا۔ دھماکہ ہوا اور دروازہ کھل گیا۔ برین گنوں والے دونوں نوجوان کاک پٹ میں گھس گئے۔ انہوں نے اندر جاتے ہی کاک پٹ کے عملے کو اپنے قابو میں کر لیا۔ فسٹ کلاس کے مسافر اپنی اپنی جگہ پر سہم کر بیٹھے تھے۔ میں نے حسینہ عالم کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس کے باڈی گارڈ اس کے پیچھے کھڑے ہو گئے تھے۔ جیسے ہی ان میں سے ایک باڈی گارڈ نے ذرا آگے آنے کے لئے حرکت کی تو برین گن والے نوجوان نے دوڑ کر اس کی کنپٹی کے ساتھ گن کی نالی لگا دی اور کہا:

"اپنی جگہ پر واپس چلے جاؤ۔ اب کوئی حرکت کی تو کھوپڑی اڑا دوں گا۔"

باڈی گارڈ نہتے تھے' کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے پاس اسلحہ بھی ہوتا تو صورتِ حال ایسی تھی کہ وہ فائرنگ کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ پورے جہاز کے مسافروں کی زندگیوں کا مسئلہ تھا۔ حسینہ عالم نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھا تو میں نے ہاتھ کے ہلکے سے اشارے سے اسے مطمئن رہنے کی ہدایت کی اور سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے' کیونکہ اس وقت جہاز کا واحد میں ایک ایسا مسافر تھا جو جہاز کو تباہی سے بچا سکتا تھا۔ اس کی وجہ صرف وہ کالا جادو تھا جس کا منتر مجھ پر پھونکا گیا تھا اور جس کے اثر

سے میرے جسم پر سوائے میری کھوپڑی کے اور کسی جگہ گولی یا خنجر کا اثر نہیں ہو سکتا تھا۔ میں صرف یہ سوچ رہا تھا کہ کونسی ایسی تدبیر کروں کہ اگر فائرنگ شروع ہو گئی تو میری کھوپڑی اور مسافروں کی زندگیاں محفوظ رہیں۔

وہاں حالات ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ مجھے پہلا قدم اپنے جادو پر بھروسہ کر کے نہیں بلکہ اپنی عقل سے کام لے کر اٹھانے کی ضرورت تھی۔ اس وقت ایک ہائی جیکر کاک پٹ میں تھا جس نے گن پوائنٹ پر دونوں ہوا بازوں کو قابو کیا ہوا تھا اور اپنی مرضی کے روٹ پر جہاز کو ڈال دیا تھا۔ فسٹ کلاس یعنی ہماری کلاس میں دو ہائی جیکر تھے' جن میں سے ایک کاک پٹ کے دروازے کے باہر ہم پر برین گن تان کر کھڑا تھا۔ جہاز کے دوسرے حصے میں بھی ہائی جیکر موجود تھے' معلوم نہیں تھا کہ ان کی تعداد کتنی تھی۔ میں سب سے پہلے فسٹ کلاس کے دونوں ہائی جیکروں کو قابو کرنا چاہتا تھا۔ مگر سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ اگر میں ایک ہائی جیکر کو پکڑ لیتا ہوں تو دوسرا مسافروں پر یا مجھ پر فائر کر سکتا تھا اور مجھے یہی خطرہ تھا کہ کہیں گولی میرے سر پر نہ لگ جائے۔ ایسی صورت میں میرا کام تمام ہو سکتا تھا۔ خوش قسمتی کی بات یہ ہوئی کہ عین اس وقت اکانومی کلاس میں سے ایک ہائی جیکر نے اپنے ساتھی کو آواز دی اور برین گن والا ہائی جیکر ہماری کلاس سے نکل کر اکانومی کلاس میں چلا گیا۔ ان دونوں کلاسوں کے درمیانی دروازے پر پردہ گرا ہوا تھا۔ اب ہماری کلاس والا ہائی جیکر اکیلا رہ گیا۔ وہ پستول ہاتھ میں تھامے کاک پٹ کے دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ یہی موقع تھا کہ میں اسے قابو کر سکتا تھا۔ ہائی جیکر آپس میں ہسپانوی زبان میں باتیں کرتے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ سپین کے رہنے والے تھے۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لئے اور کھڑے ہو کر ہائی جیکر سے ہسپانوی زبان میں کہا:

"میں باتھ روم جانا چاہتا ہوں۔"

اس نے قہر بھری نظروں سے میری طرف دیکھا اور پستول کا رخ میری طرف کر دیا اور خاموش رہا۔ میں نے دوبارہ کہا۔

"میں ہسپانوی ہوں۔ تمہیں اپنے ہم وطن کا خیال کرنا چاہیے۔"

اس نے کہا:

"جاؤ! مگر ایک منٹ سے زیادہ دیر نہیں لگاؤ گے۔"

میں نے یہ پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ فسٹ کلاس کے باتھ روم میں جانے کے لئے ہائی جیکر کے قریب سے گزرنا پڑتا تھا۔ مجھے اس سے زیادہ اور کسی چیز کی ضرورت نہیں تھی کہ میں ہائی جیکر کے کسی طرح قریب پہنچ جاؤں۔ میں ہاتھ اوپر اٹھائے باتھ روم کی طرف چلا۔ میں نے محسوس کیا کہ دوسرے مسافر میری طرف سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ جیسے ہی میں ہائی جیکر کے قریب سے گزرنے لگا۔ میں نے ایک ہاتھ سے اس کی گردن کو پکڑ کر اس کے نرخرے کو دبا دیا۔ میں اپنی اس طاقت کو پہلے آزما چکا تھا۔ مجھ میں اور بھی کئی جادوئی طاقتیں ڈال دی گئی تھیں' مگر اس طاقت کا مجھے تجربہ ہو چکا تھا۔ مجھے اپنے ہاتھ کی انگلیاں لوہے کی طرح سخت محسوس ہو رہی تھیں۔ ہائی جیکر کا یہ حال تھا کہ ایک سیکنڈ میں اس کا سانس بند ہو گیا تھا۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کا پستول چھین لیا تھا' وہ دونوں ہاتھوں سے میرے ہاتھوں اپنی گردن چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن دوسرے سیکنڈ میں اس کے دونوں ہاتھ بے جان ہو چکے تھے۔ میرے ہاتھ کے فولادی پنجے نے ہائی جیکر کے نرخرے کو دبانے کے ساتھ ہی ساتھ اس کی گردن کی ہڈی کے دو مہرے بھی توڑ دیئے تھے۔ مجھے ان کے ٹوٹنے کی آواز سنائی دی تھی۔ یہ سب کچھ زیادہ سے زیادہ تین منٹ میں ہو گیا تھا۔ میں نے مردہ ہائی جیکر کو نیچے گرا دیا اور کاک پٹ کے بند دروازے پر دستک دے کر ہسپانوی زبان میں اندر والے ہائی جیکر کو کہا:

"باہر آنا' ہمیں ایک مصیبت پڑ گئی ہے۔"

اندر والا ہائی جیکر سمجھا کہ باہر سے اس کا ساتھی بلا رہا ہے۔ فوراً دروازہ کھلا اور جیسے ہی دوسرے ہائی جیکر نے قدم باہر رکھا، میں نے جھپٹ کر سب سے پہلے اس کی برین گن اس کے ہاتھ سے چھین کر مسافروں کی طرف پھینک دی' جہاں مس حسینہ عالم کے ایک

ڈی گارڈ نے جلدی سے اسے اٹھا کر پوزیشن سنبھال لی۔ یہ منظر میں نے ایک سانحے میں
کھ لیا تھا۔ ہائی جیکر کی برین گن گراتے ہی میں نے اس کی گردن کو اپنے سیدھے ہاتھ
ے پنجے میں جکڑ کر ایک فٹ اوپر اٹھا کر صرف تین جھٹکے دیئے اور اتنے میں ہی اس کی
ردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ اس سے مجھے یاد آ گیا تھا کہ انڈیا کے جنگلوں میں شیر بھی
ب اپنے شکار کو منہ میں دباتا ہے تو اسے بھی اسی طرح دو تین جھٹکے دیتا ہے تا کہ شکار کی
ردن کی ہڈی ٹوٹ جائے۔ میں نے اسے نیچے گرا دیا اور مسافروں کو دبی زبان میں
اموش رہنے کے لئے کہا۔ حسینہ عالم میری طرف فخریہ انداز میں دیکھ رہی تھی۔ اس کا
ڈی گارڈ برین گن ہاتھ میں لئے صوفے کے پیچھے مورچہ بنا کر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اسے
ہستہ سے اطالوی زبان میں کہا:

"خبردار! فائر مت کرنا۔"

اور خود پردے میں سے جھانک کر اکانومی کلاس میں دیکھا۔ جہاز کی نشستوں کے
رمیان دو ہائی جیکر ایک دوسرے کی طرف منہ کئے ٹہلتے ہوئے لوگوں کی نگرانی کر رہے
ھے۔ ان کے ہاتھوں میں پستول تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہو گیا کہ ان میں سے کسی
ے بھی پاس ہینڈ گرینڈ نہیں تھا۔ میں پردے سے ہٹ کر کاک پٹ میں گیا۔ کاک پٹ کے
روازے میں ایک ایئر ہوسٹس گھبرائی ہوئی کھڑی دونوں مردہ ہائی جیکروں کو تک رہی
ی۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا اور میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر دونوں ہاتھ اوپر اٹھا
لئے۔ میں نے اسے یونانی زبان میں کہا:

"میں مسافر ہوں جہاز کا، ہائی جیکر نہیں ہوں۔ جہاز کے پائیلٹ سے کہو کہ اپنے
ل روٹ پر چل پڑے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔"

ایئر ہوسٹس جلدی سے کاک پٹ کے اندر چلی گئی۔ میں نے پردہ ذرا سا اٹھا کر اکانومی
اس میں جھانک کر دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ سارے چار ہائی جیکر تھے' جنہوں نے جہاز
اغوا کر لیا تھا۔ یہ تجربہ کاری کی بات ہوتی ہے۔ ہائی جیکر تجربہ کار اور تربیت یافتہ ہو تو وہ

صرف ایک بھرے ہوئے ریوالور سے ہی جہاز کو اغوا کر سکتا تھا' کیونکہ جہاز اور اس کے
مسافروں کی سلامتی کی خاطر جہاز کے عملے کا کوئی بھی آدمی مزاحمت نہیں کرتا۔

میں پردے سے ذرا ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔ فسٹ کلاس کے تمام مسافر مجھے
حیرت اور فخر کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ میں نے ان کی طرف دیکھ کر
انگلی ہونٹوں کے قریب لا کر یونانی زبان میں کہا:

"کوئی اپنی جگہ سے نہ اٹھے۔ سب خاموش رہو۔"

مَیں نے کاک پٹ میں سے ایئر ہوسٹس کو باہر نکالا اور اسے کہا کہ وہ اکانومی کلاس میں
جا کر ڈری ہوئی آواز میں اس طرف والے ہائی جیکر سے کہے کہ اس کا ساتھی اسے بلا رہا
ہے۔ ایئر ہوسٹس پردہ اٹھا کر اکانومی کلاس میں چلی گئی۔ میں اسے ذرا سا پردہ ہٹا کر دیکھ رہا
تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے ہوئے تھے۔ اس وقت ایک ہائی جیکر ٹہلتا ہوا فسٹ
کلاس کے قریب آ چکا تھا۔ ایئر ہوسٹس نے اسے یونانی اور انگریزی زبان میں کہا: "وہ
تمہیں بلاتا ہے، تمہارا ساتھی۔"

ہائی جیکر نے ایئر ہوسٹس کو ہاتھ سے ایک طرف دھکا دیا اور پستول سیدھی کر کے
فسٹ کلاس کے پردے کی طرف بڑھا اور قریب آ کر اس نے احتیاط کے طور پر ہسپانوی
میں اپنے ساتھی ہائی جیکر کا نام لے کر پوچھا کہ کیا بات ہے۔ مَیں نے ایسی آواز نکالی کہ
جیسے میں زخمی ہو گیا ہوں۔

"جلدی سے آؤ۔"

مَیں جلدی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ ہائی جیکر پردہ ہٹا کر تیزی سے اندر آ گیا۔ بس اس
کا اندر آنا اور اس کے پستول کی نالی کا دوسری طرف رخ کئے رکھنا ہی میرے لئے بہت
تھا۔ مَیں نے اس کی گردن پر پیچھے سے ایک ہاتھ مارا۔ مَیں حیران ہو گیا کہ میرے ہاتھ کی
ہڈیوں میں اتنی طاقت کب سے آ گئی تھی۔ میرا ہاتھ اس کی گردن پر اس طرح جا کر پڑا
جس طرح لوہے کا سب سے بڑا ہتھوڑا کسی بکرے کی گردن پر پڑتا ہے۔ پستول اس کا مَیں

ے پہلے ہی اس کے ہاتھ سے چھین لیا تھا۔ وہ اس طرح جھپ کھا کر گرا جیسے اس کی
ردن کی ہڈی ہی نہیں بلکہ وہ سارے کا سارا ٹوٹ گیا ہو۔ مَیں نے اسے بھی کھینچ کر
سرے دو ہائی جیکروں کی لاشوں کے پاس ڈال دیا۔ اس دوران کاک پٹ میں سے ایک
اباز اور دوسرا کوئی اس کا ساتھی باہر نکل کر حیرانی سے یہ سارا ڈرامہ دیکھ رہے تھے۔
ہیں یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ مَیں کوئی فوج کا سابق کمانڈو ہوں اور مَیں نے خطرہ مول
لے کر ان ہائی جیکروں کو ہلاک کر ڈالا ہے۔ مَیں نے انہیں دبی آواز میں یونانی میں سمجھایا
. مَیں فسٹ کلاس کا مسافر ہوں' اور مَیں نے ایک خطرہ مول لیا تھا' اب صرف ایک
جیکر رہ گیا ہے جو اکانومی کلاس میں ہے۔ ہوا باز نے یونانی زبان میں ہی کہا:

"پلیز سوچ سمجھ کر اگلا قدم اٹھائیں۔ ہمیں مسافروں کی جان زیادہ عزیز ہے۔"

مَیں نے کہا: "فکر نہ کرو! مجھے اپنی جان تم سب سے زیادہ عزیز ہے۔"

مَیں نے جلدی سے پردہ ذرا سا ہٹا کر اکانومی کلاس میں نگاہ ڈالی۔ مَیں نے دیکھا کہ چوتھا
جیکر تیزی سے فسٹ کلاس کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ مَیں نے جلدی سے پیچھے ہٹ
ران سب کو کہا: "چھپ جاؤ' چھپ جاؤ۔" مجھے یہی فکر لگا تھا کہ اگر کہیں ہائی جیکر نے
ز کر دیا اور گولی جہاز کی دیوار میں سے گزر گئی تو ہو سکتا ہے جہاز میں کوئی دھماکہ ہو اور
ں کا ایک حصہ اڑ جائے اور ہوا کا دباؤ کم ہونے کی وجہ سے اندر کی چیزیں باہر کی طرف
نا شروع ہو جائیں۔ مَیں نے فلموں میں ایسا ہوتا دیکھا تھا۔ ہو سکتا تھا ایسا نہ ہوتا لیکن
ے اس وقت یقین تھا کہ ایسا ہو جائے گا۔ یہی وجہ تھی کہ جب چوتھا ہائی جیکر پردہ ہٹا کر
سٹ کلاس میں داخل ہُوا تو سب سے پہلے ہاتھ مار کر مَیں نے اس کا پستول گرا دیا۔
تول گرا تو مَیں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اچانک ہائی جیکر نے جیکٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر
سرا چھوٹا پستول نکالا اور مجھ پر فائر کر دیا۔ گولی سیدھی میرے سینے پر آ کر لگی۔ مسافروں
ں سے عورتوں کی چیخیں نکل گئیں۔ لیکن مجھے کوئی تشویش نہ ہوئی، نہ گولی جسم سے پار
تی محسوس ہوئی۔ مگر میں ہائی جیکر کو دوسری بار فائر کرنے کی مہلت نہیں دے سکتا تھا۔

کیونکہ ہو سکتا تھا' دوسری گولی میرے سر میں لگے اور میری کھوپڑی اڑ جائے۔

مَیں نے جھپٹ کر ہائی جیکر کی گردن دبوچ لی۔ مجھے اس پر سخت طیش بھی تھا کہ اس نے مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ فرض کریں اگر مجھ پر شیطانی سردار کے کالے جادو کا اثر نہ ہوتا اور میرے جسم کے گرد ایک طلسمی دیوار نہ ہوتی تو مَیں مرچکا تھا۔ مَیں نے غصے میں آ کر ہائی جیکر کو ایک ہی ہاتھ سے اوپر اٹھا کر اتنی زور سے نیچے پٹخا کہ فسٹ کلاس کی ایک کرسی اور ایک چھوٹا صوفہ ٹوٹ کر چکنا چور ہو گیا۔ پائیلٹ یہ سارا منظر کاک پٹ کے دروازے کے پیچھے سے دیکھ رہا تھا وہ فوراً باہر نکل آیا۔ اکانومی کلاس سے دو ایئر ہوسٹس بھی جو گھبرائی ہوئی تھیں اندر آ گئیں۔ کیپٹن پائیلٹ نے ان سے پوچھا کہ اُدھر کتنے ہائی جیکر ہیں؟ ایئر ہوسٹس نے بتایا کہ اکانومی کلاس میں کوئی ہائی جیکر نہیں ہے۔

مَیں اپنے صوفے پر بیٹھ کر اپنی ٹائی کی گرہ درست کرنے لگا۔ سب لوگ اُٹھ اُٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملانے اور مجھے مبارک باد دینے لگے۔ حسینہ عالم مِس جیولانی بھی اُٹھ کر میرے پاس آ گئی۔ اس نے میرا منہ چوم لیا اور اطالوی زبان میں کہا:

"سینور! تم ہمارے ہیرو ہو۔"

فسٹ کلاس کے مسافر خوش خوش اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ حسینہ عالم میرے پہلو میں ہی بیٹھ گئی۔ پائیلٹ نے ایئر ہوسٹسوں سے کہا: "فوراً جا کر مسافروں کی خبر گیری کرو اور انہیں یہ خوشخبری دو کہ ہائی جیکروں پر قابو پا لیا گیا ہے۔"

پائیلٹ اور اس کا ساتھی کاک پٹ میں واپس چلے گئے۔ اس کے فوراً بعد جہاز کے سپیکر پر پائیلٹ کی آواز بلند ہوئی۔

"خواتین و حضرات! جہاز میں ایک ناخوشگوار صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی، مگر ہم نے اس پر قابو پا لیا ہے اور اب ہم معمول کی پرواز پر پیرس کی طرف جا رہے ہیں۔"

جہاز میں مسافروں نے خوش ہو کر نعرے لگائے۔ ہمیں فسٹ کلاس میں ان کے نعروں کی آوازیں سنائی دیں۔ جہاز کے عملے کے آدمی اسی وقت چاروں ہائی جیکروں کی

ـشوں کو اٹھا کر فسٹ کلاس سے لے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد جہاز کی فضا معمول کے طابق ہو گئی اور خاموشی چھا گئی۔ صرف جہاز کے انجنوں کی دھیمی دھیمی گونج ہی سنائی ے رہی تھی۔

مِس حسینہ عالم جیولانی مجھ پر بڑی ہی مہربان ہو گئی تھی۔ مَیں نے سگریٹ ہولڈر میں گریٹ لگایا تو اس نے جلدی سے اپنے پرس میں سے ماچس نکال کر میرے سگریٹ کو سلگا ا۔ مَیں نے اطالوی میں اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ حیران ہو رہی تھی کہ مجھ میں اتنی طاقت ماں سے آ گئی تھی کہ مَیں نے ایک ہاتھ سے ہائی جیکر کو اوپر اٹھا کر پٹخ دیا۔ مَیں نے اسے ا کہ مَیں اطالوی فوج کی کمانڈو فورس میں بھی رہ چکا ہوں اور یہ ساری تربیت مَیں نے ہیں سے حاصل کی تھی۔ اس کے باڈی گارڈ بھی مجھ سے بڑے متاثر نظر آ رہے تھے۔ وہ ب ہمارے صوفے کے پیچھے آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک باڈی گارڈ کے ہائی جیکر کی جو برین گن تھی وہ کیبن پائیلٹ نے اس سے واپس لے کر پلاسٹک کے فے میں ڈال کر ہائی جیکروں کے دوسرے اسلحہ کے ساتھ ہی جمع کرا دی تھی۔

شام ہو چکی تھی اور پیرس کی روشنیاں ستاروں کی طرح جہاز کے نیچے جھلملا رہی ں۔ جب ہمارا جہاز پیرس کے ایئرپورٹ پر لینڈ کر گیا، جہاز کے پائیلٹ نے تمام رتحال سے پیرس کی پولیس کو وائرلیس پر آگاہ کر دیا تھا۔ چنانچہ ایئرپورٹ پر پولیس اور رٹی فورس اور فوج کی کمانڈو فورس موجود تھی اور اس نے سارے ایئرپورٹ کو رے میں لے رکھا تھا۔ حسینہ عالم کے استقبال کرنے والے میڈیا کے لوگ اور اخباری نگار بھی بھاری تعداد میں آئے ہوئے تھے۔ مَیں حسینہ عالم کے ساتھ ہی ایئرپورٹ سے آیا۔ پریس فوٹوگرافر دھڑا دھڑ ہماری تصویریں لینے لگے۔ حسینہ عالم مِس جیولانی نے لہ مَیں اس کے ساتھ ہی گرینڈ ہوٹل چلوں۔ مگر مَیں اس ہجوم میں اس کے ساتھ جانا چاہتا تھا۔ مَیں نے کہا:

سینوریتا! مَیں رات کو تمہیں فون کروں گا۔"

اس نے کہا: "تو پھر ڈنر کی میری طرف سے تمہیں دعوت ہے۔"

مَیں ڈنر کے شور اور ہنگامے سے بھی گریز کرنا چاہتا تھا۔ مَیں نے کہا:

"مجھے افسوس ہے کہ آج کا ڈنر پہلے سے ہی پیرس کے صنعت کاروں کی ایسوسی ایشن کے ساتھ طے ہو چکا ہے۔ مَیں ڈنر سے فارغ ہوتے ہی تمہیں فون کروں گا۔"

حسینہ عالم نے کہا: "تو پھر رات کا سپر اور کافی تم میرے ساتھ پیئو گے۔"

مَیں یہی چاہتا تھا۔ مَیں نے حامی بھرلی اور حسینہ عالم سے رخصت ہو کر اس طرف چل پڑا جدھر پرائیوٹ گاڑیوں کا ٹیکسی اسٹینڈ تھا۔ وہاں ایک سے ایک نئے ماڈل کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ وردی پوش شوفر گاڑیوں کے سامنے بڑے ادب سے کھڑے تھے۔ یہاں دوسرے ملکوں سے آنے والے امیر کبیر صنعت کار اور اونچی سوسائٹی کے لوگ گاڑیاں لے کر اپنے اپنے ہوٹلوں کی طرف جاتے تھے۔

مَیں ایک نئے ماڈل کی بیوک کار کی طرف بڑھا۔ وردی پوش شوفر نے آگے بڑھ کر کار کا دروازہ کھول دیا۔ مَیں نے شوفر سے پیرس کے ایک اونچے درجے کے ہوٹل میں جانے کو کہا اور کار کی پچھلی آرام دہ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کار پیرس کی روشن اور بارونق سڑکوں کی طرف روانہ ہو گئی۔ مَیں نے شہر کے ایک ماڈرن ہوٹل میں کمرہ لے لیا اور رات کے ایک بجنے کا انتظار کرنے لگا۔ یورپ کے بعض قدیم اور صاحبِ ثروت گھرانوں میں رات کو رسمی طور پر ہی سہی لیکن سپر کھانے کا اب بھی رواج ہے۔ یہ ہلکا پھلکا کھانا ہوتا ہے جس کے ساتھ وائین پی جاتی ہے۔ اس کا وقت رات کے ایک بجے شروع ہو کر رات کے دو ڈھائی بجے تک رہتا ہے۔ مجھے حسینہ عالم کے بارے میں کسی منصوبہ بندی کی ضرورت نہیں تھی۔ جہاز میں میرے ساتھ جو ایکشن ہوا تھا' اس نے اس مہم کو میرے لئے آسان بنا دیا تھا۔ حسینہ عالم مِس جیولانی میرا ایک آسان شکار تھا اور یہ شکار میرے جال میں پھنس چکا تھا۔

مَیں نے رات کے ٹھیک پونے ایک بجے حسینہ عالم کو اس کے ہوٹل فون کیا۔ وہ پہلے

سے میرے فون کا انتظار کر رہی تھی۔ کہنے لگی:

"ڈانئے! پلیز آ جاؤ۔ مَیں تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں۔"

مَیں نے کہا: "مَیں آ رہا ہوں۔"

آدھی رات کے بعد پیرس کی سڑکوں پر دن والا رش نہیں ہوتا۔ مَیں گاڑی لے کر کے ہوٹل پہنچ گیا۔ اس کے سویٹ یا تین کمروں والے فلیٹ کے دروازے پر کاریڈور باڈی گارڈ موجود تھے۔ حسینہ عالم مِس جیولانی نے انہیں میرے بارے میں کہہ دیا تھا مَیں جس وقت آؤں مجھے اندر بھیج دیا جائے۔ یہ باڈی گارڈ میری دلیری اور شجاعت ز میں دیکھ چکے تھے' وہ مجھے کوئی بڑا زبردست کمانڈو سمجھ رہے تھے۔ انہوں نے مسکرا کر سے باری باری ہاتھ ملایا اور دروازہ کھول دیا۔ مَیں سوچنے لگا کہ مِس جیولانی کو مَیں ں سے نکالوں گا کیسے؟ دروازے پر تو سیکورٹی گارڈ کے چار جوان کھڑے ہیں۔ بہرحال پہلے ان سے نمٹنے کی ضرورت پیدا ہو گئی تھی۔ مِس جیولانی رات کے دلکش لباس ملبوس ڈرائینگ روم میں میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اُٹھ کھڑی ہوئی اور پ والوں کی رسم کے مطابق مجھے گلے لگا کر میرا خیر مقدم کیا۔۔۔ سمجھ دار لڑکی تھی' دیکھ چکی تھی۔ اس قسم کے کئی تجربات میں سے گزر چکی تھی۔ اس نے سپر پر کسی ا کو نہیں بلا رکھا تھا' وہ مجھے ڈائننگ ٹیبل پر لے گئی۔ انواع و اقسام کے کھانے اور بات موجود تھے۔

میرا ذہن صرف ایک ہی بات پر غور کر رہا تھا کہ اس لڑکی کو بے ہوش کرنے اور اس ا نکالنے کے بعد مَیں اسے یہاں سے نکالوں گا کس طرف سے۔ فلیٹ کے دروازے پر گارڈ پہرہ دے رہے تھے۔ ایک ایک کر کے ان چاروں سے نمٹنا دقت طلب کام تھا ر چاروں مسلح تھے۔ وہاں فائرنگ شروع ہو سکتی تھی اور اس کے شور سے سارا ہوٹل جمع ہو سکتا تھا اور پولیس بھی پہنچ سکتی تھی۔ پولیس ان ملکوں میں جائے واردات پر پہنچ جاتی ہے۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ یورپ امریکہ کے ملکوں میں بڑی بڑی عمارتوں

اور ہوٹلوں کے پیچھے ایسی آہنی سیڑھیاں ضرور بنائی جاتی ہیں جو آگ لگنے یا دوسرے ہنگامی حالات میں استعمال کی جاتی ہیں۔ اِس ہوٹل میں بھی ایسی سیڑھی ضرور ہوگی۔ مَیں اسے ایک نظر دیکھ کر تسلی کرنا چاہتا تھا۔ کھانے پر مِس جیولانی مجھ سے میرے کولمبیا والے تیل کے کنوؤں اور دوسرے کاروباری پراجیکٹ کے بارے میں باتیں کرتی رہی۔ ظاہر ہے اسے اِن ساری معلومات کی اشد ضرورت تھی۔ ورنہ وہ محض اس وجہ سے مجھے اپنے بیڈروم میں آنے کی دعوت نہیں دے سکتی تھی کہ مَیں کوئی ٹارزن ہوں یا بڑا بہادر کمانڈو ہوں۔ اِن عورتوں کی سب سے اہم ضرورت دولت ہوتی ہے۔ اپنے حسن و جمال کے تیر چلا کر وہ ارب پتی تاجروں اور صنعت کاروں کا شکار کرتی ہیں اور یوں اپنے حسن و جمال کے ڈھل جانے سے پہلے پہلے اپنے مستقبل کو ہر طرح سے محفوظ کر دینا چاہتی ہیں۔

مَیں بھی اس پر بڑھ چڑھ کر اپنی امارت کا رعب جما رہا تھا۔ میرا کیا لگتا تھا۔ ہوٹل کا بیل بوائے، حسینہ عالم کے لئے آدھی رات کو ایک نوری گریٹنگ کارڈ لے کر آیا تو مَیں نے جیب سے سو سو ڈالر کے پانچ نوٹ نکال کر اسے ٹپ میں دے دیئے۔ حسینہ عالم مِس جیولانی پر اس کا بہت اثر پڑا۔ اسے یقین ہو گیا ہوگا کہ میں واقعی تیل کے کنوؤں کا مالک ہوں۔ مجھ پر اس کے لطف و عنایات میں اضافہ ہو گیا۔ کھانا کھانے کے بعد مَیں نے سگریٹ سلگا لیا اور ڈائننگ روم کی لمبی کھڑکی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا جس پر پردہ گرا ہوا تھا۔ مِس جیولانی ریکارڈ پلیئر پر میوزک کا کوئی نیا ریکارڈ لگانے میں مصروف ہو گئی۔ اس زمانے میں ابھی یورپ میں ریکارڈ پلیئر کا کافی رواج تھا۔ مَیں نے پردہ ذرا سا ہٹا کر نیچے جھانک کر دیکھا۔ میرا اندازہ بالکل درست تھا۔ ساتھ والے کمرے کا ایک دروازہ باہر کی طرف کھلتا تھا جس کے آگے لوہے کی چکر دار سیڑھی نیچے ہوٹل کی عقبی سڑک تک چلی گئی تھی۔ یہ ہنگامی سیڑھیاں تھیں۔ اب مجھے یہ دیکھنا تھا کہ ساتھ والے کمرے میں کیا ہے۔ کہیں وہ سٹور روم تو نہیں۔ اس مسئلے کو بھی مِس جیولانی نے فوری حل کر دیا۔

ساتھ والا کمرہ اس کا بیڈروم تھا اور اسی کمرے کا ایک دروازہ باہر کی سیڑھیوں کی

طرف کھلتا تھا۔ اس طرف سے پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد میں نے اپنے کالے جادو کا عمل شروع کر دیا۔ مِس جیولانی پہلے ہی تیار تھی۔ اس نے بڑا قیمتی ریشمی سلیپنگ سوٹ پہن لیا تھا۔ وہ میرے لئے بھی سلیپنگ سوٹ نکالنا چاہتی تھی مگر میں نے اسے منع کر دیا اور کہا:

"مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے مِس جیولانی۔ مَیں رات کو کچھ نہیں پہن کر سوتا۔"

مِس جیولانی مسکرا دی۔ وائین کا گلاس اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ شاندار بیڈ پر نیم دراز تھی۔ اس نے مجھے بھی اپنے پاس بلا لیا۔ مَیں اس کے قریب ہو گیا اور اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ مِس جیولانی کچھ اور تیاریاں کر رہی تھی اور مَیں کچھ اور تیاری کر رہا تھا۔ مجھے صرف مِس جیولانی کے کان کی لَو کو اپنے دانتوں سے ذرا سا کاٹنا ہی تھا۔ بیڈروم میں بڑی مدھم ارغوانی روشنی ہو رہی تھی۔ مَیں نے اپنا کوٹ اتار کر ایک طرف رکھ دیا تھا اور مِس جیولانی کو آغوش میں لے کر پیار کر رہا تھا۔ یہ میں نہیں تھا' میرے اندر کا عفریت اسے پیار کر رہا تھا۔ مَیں نے پیار کرتے کرتے حسینہ عالم کے کان کی لَو اپنے منہ میں لے لی اور پھر اسے اپنے دانتوں میں ذرا سا دبایا۔ مِس جیولانی کے منہ سے ہلکی سی چیخ کی آواز نکلی۔

یہ اس کی آخری آواز تھی۔

اس کے بعد وہ میری بانہوں میں بے ہوش ہو گئی اور اس کا سنہری بالوں والا خوبصورت سر نیچے لٹکنے لگا۔ میں نے اسے سیدھا کر کے بستر پر لٹا دیا اور اپنا کوٹ پہن لیا۔ پھر مَیں اُس کے اوپر جھک کر بیٹھ گیا اور اس کے سینے پر سے کپڑا کافی نیچے تک ہٹا دیا۔ مَیں نے کالے جادو کا منتر پڑھ کر مِس جیولانی کے سینے پر پھونکا اور انگلی سے اس کے سینے اور پیٹ کے درمیانی حصے کو دبایا۔ میری انگلی اس کے نرم بدن میں نیچے تک چلی گئی۔ مَیں نے اپنے ہاتھ کا پورا پنجہ مِس جیولانی کے سینے میں ڈال دیا۔ میری انگلیاں اس کے دھڑکتے ہوئے دل سے ٹکرانے لگیں۔ مَیں نے اس کے دل کو اپنی مٹھی میں لے کر ایک جھٹکے

سے دل الگ کر کے ہاتھ باہر نکال لیا۔ مس جیولانی کا دل میری مٹھی میں بھی دھڑک رہا تھا اور اس میں سے خون کے قطرے نیچے ٹپک رہے تھے۔ لیکن اس کا سینہ بند ہو گیا تھا اور معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ مَیں نے اس کے اندر ہاتھ ڈال کر اس کا دل باہر نکال لیا ہے۔

میں نے مس جیولانی کے دل کو اپنے کوٹ کی جیب میں ڈالا اور پردہ ہٹا کر ہنگامی زینے والا دروازہ کھول دیا۔ میں نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ یہ فلیٹ ہوٹل کی تیسری منزل پر واقع تھا۔ نیچے بلڈنگوں کے پچھواڑے لگتے تھے اور ایک تنگ سی گلی تھی جو آدھی رات کے بعد اندھیرے میں سنسان تھی۔ میں نے جیولانی کو اٹھا کر اپنے کاندھے پر ڈالا اور سیڑھیاں اتر کر گلی میں آ گیا۔ یہاں سے مجھے شہر کے مشرقی علاقے والے قبرستان جانا تھا۔ اس دوران ایک لمحے کے لئے بھی سیاہ پوش لڑکی نے مجھ سے کسی قسم کا رابطہ پیدا نہیں کیا تھا۔ اس کی آواز بھی میرے کانوں میں نہیں آئی تھی۔ شاید وہ اس لئے خاموش تھی کہ ہر کام اس کی مرضی کے مطابق ہو رہا تھا اور مجھے کسی جگہ اس کی مدد کی ضرورت بھی نہیں پڑی تھی۔ مگر اب مجھے کسی گاڑی کی ضرورت تھی اور ہوٹل کے پچھواڑے آدھی رات کے بعد کسی گاڑی کا ملنا آسان نہیں تھا۔ میں نے مس جیولانی کو کاندھے پر اٹھا رکھا تھا۔ اس کا سنہری بالوں والا سر اور ایک بازو میری پشت پر لٹک رہے تھے۔ مجھے اس کا بوجھ بالکل محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

تاریک اور سنسان گلی سے نکل کر میں ذرا کھلی سڑک پر آیا تو ایک بلڈنگ کے باہر مجھے ایک گاڑی کھڑی دکھائی دی۔ میں اس کی طرف بڑھا۔ یہ کوئی ٹیکسی تھی مگر اس کا ڈرائیور گاڑی بند کر کے آرام کرنے جا چکا تھا۔ گاڑی کے شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ دروازے بند تھے اور لاک کئے ہوئے تھے۔ میں نے اگلی سیٹ والے دروازے کے ہینڈل کو پکڑ کر ایک جھٹکا دیا تو ہینڈل میرے ہاتھوں میں آ گیا اور دروازہ بھی کھل گیا۔ مَیں نے مس جیولانی کو پچھلی سیٹ پر لٹا دیا اور خود ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ انجن کو چابی لگی ہوئی تھی مگر میرے لئے اس چابی کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ مَیں نے انجن سٹارٹ کیا اور گاڑی

کا رخ قبرستان کی طرف کر دیا۔ اگرچہ مجھے قبرستان کا راستہ معلوم نہیں تھا۔ کیونکہ گرینڈ ہوٹل پیرس شہر کے سینٹر سے مغرب کی طرف کافی فاصلے پر واقع ہے مگر میرے اندر کی طلسمی طاقت مجھے راستہ بتا رہی تھی۔ قبرستان کے گیٹ تک پہنچتے پہنچتے مجھے پون گھنٹہ لگ گیا۔ گیٹ پر سیاہ پوش لڑکی قبرستان کی آسیبی بلا کی طرح ہاتھ میں موم بتی لئے کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ اپنی جگہ پر بدستور کھڑی رہی۔ مَیں نے گاڑی میں سے بے ہوش جیولانی کو کاندھے پر ڈال کر باہر نکالا تو سیاہ پوش لڑکی بولی:

"میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔"

وہی عمل ایک بار پھر دہرایا گیا اور مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد آخر میں شیطانی سردار کے سامنے پہنچ گیا۔ سردار نے مس جیولانی کے چہرے کو غور سے دیکھا' پھر پیچھے کھڑے سیاہ پوشوں کو اشارہ کیا جو حسینہ عالم کے بے ہوش یا بے جان جسم کو اٹھا کر لے گئے۔ ظاہر ہے حسینہ عالم کے بے جان جسم کو بھی انہوں نے وہیں لے جا کر رکھ دیا تھا' جہاں اس سے پہلے ارب پتی عورت کی بیٹی مس فینی کی لاش پڑی تھی۔ مجھے اس جگہ سے بے خبر رکھا گیا تھا۔ اتنا مجھے اندازہ تھا کہ اس قبرستان کے نیچے کوئی تاریک سرنگ تھی جو زمین کے اندر ہی اندر سے گزرتی ہوئی سمندر میں ان چٹانوں میں جا نکلتی تھی جس کے قریب ان شیطانی سیاہ پوشوں کا آسیبی جہاز لنگر انداز تھا۔

سیاہ پوشوں کے سردار کا چہرہ بے نقاب تھا۔ چہرے کی جگہ صرف کھوپڑی ہی نظر آ رہی تھی' جس کی آنکھوں کے سوراخ انگاروں کی طرح دہک رہے تھے۔ سیاہ پوش لڑکی میرے قریب ہی سر جھکائے ادب سے کھڑی تھی۔ شیطانی سردار نے اپنی انگاروں ایسی آنکھیں مجھ پر جما رکھی تھیں۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا:

"چلکاش! اب میں تمہیں آخری مہم پر بھیج رہا ہوں۔ اگر اس میں بھی تم کامیاب رہے تو پھر تم میرے جانشین بننے کے حق دار بن جاؤ گے اور میرے بعد میرے تخت پر بیٹھ کر ہماری سلطنت پر حکمرانی کرو گے۔"

میں اپنے پورے جسم اور پوری روح اور روح کی تمام نفسیات اور خیالات کے ساتھ ان کے زیر اثر تھا۔ میں خود کو بھی ان لوگوں کا ایک شیطان سمجھنے لگا تھا۔ میں نے خوش ہو کر کہا:

"سردار! میں تمہارے ہر حکم پر پورا اتروں گا۔۔۔ مجھے بتاؤ' کونسی مہم سر کرنی باقی رہ گئی ہے۔"

شیطانی سردار نے کہا:

"یہ مہم ایسی ہی خطرناک ہے جیسے کہ ایک آدمی تلوار کی دھار پر چلنے کی کوشش کرے۔ اس میں ہر قدم پر موت منہ کھولے کھڑی ہو گی' تمہاری ذرا سی بے احتیاطی تمہارے جسم کے پرزے اڑا دے گی۔"

میں شیطانی گناہوں کے ارتکاب کرنے میں بڑا دلیر ہو چکا تھا۔ ان لوگوں کے ہلاکت خیز آسیبی طلسم نے میرے اندر کی ساری انسانیت کو شاید موت کی نیند سلا دیا تھا۔ میں نے کہا:

"سردار! تم مجھے بتاؤ کہ مجھے کہاں جانا ہے اور کیا کرنا ہے۔ یقین کرو' میرے اندر اتنی طاقت پیدا ہو چکی ہے کہ میں موت کو بھی شکست دے سکتا ہوں؟"

شیطانی سردار نے اپنے ہڈیوں کے ڈھانچ حلق میں سے ایک ڈراونی آواز نکالی اور کہا:

"چلکاش! چلکاش! مجھے تم ایسے جانشین ہی کی ضرورت تھی۔ تمہاری راہنمائی کرنے والی سیاہ پوش لڑکی تمہیں سب کچھ بتا دے گی۔ اب تم سے اس وقت ملاقات ہو گی جب تم اپنی زندگی کی تیسری اور آخری مہم سر کر کے میرے پاس آؤ گے۔ جاؤ! تمہیں شیطان کے حوالے کیا۔"

میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا:

"شیطان میری حفاظت کرے گا۔"

اس وقت میں یہ بھول چکا تھا کہ شیطان انسان کی حفاظت پر نہیں بلکہ اس کی تباہی

ری چاہتا ہے اور جو انسان ایک بار اس کے جال میں پھنس جاتا ہے پھر ذلت و ہلاکت کا مقدر بن جاتی ہے۔ شیطان کا چیلا سردار اپنے سیاہ پوش ساتھیوں کے ہمراہ وہاں سے گیا۔ اس کے جانے کے بعد سیاہ پوش لڑکی جو میرے پہلو میں کھڑی تھی میرے قریب آ ے۔ کہنے لگی:

"چلکاش! میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں بتاتی ہوں کہ تمہیں کیا کرنا ہو گا۔"

وہ مجھے ایک چھوٹی سی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں لے آئی۔ کالے جادو کی وجہ سے میں یرے میں چیزوں کو پہچان لیتا تھا۔ کوٹھڑی میں ایک گرد آلود میز پڑی تھی۔ سیاہ پوش ی نے ایک موم بتی جلا کر میز پر لگا دی۔ اس کی پُراسرار دھیمی روشنی میں کوٹھڑی کی ت سے لٹکے ہوئے جالے نظر آنے لگے۔ ایک چمگادڑ دیوار کے کسی سوراخ میں سے ل کر پھڑپھڑاتی ہوئی کوٹھڑی سے باہر نکل گئی۔ میز کے ساتھ دو شکستہ کرسیاں لگی تھیں۔ یاہ پوش لڑکی کرسی پر بیٹھ گئی۔ کرسی اس طرح چرچرائی جیسے ابھی ٹوٹ جائے گی۔ میں اتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میری کرسی نے بھی بڑی ڈراونی آوازیں نکالیں۔ سیاہ پوش لڑکی پنی لال لال آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی:

"چلکاش! تمہیں شہر کے سب سے بڑے لاٹ پادری کی اکلوتی بیٹی سانتافی کا دل نکال کر لانا ہے۔"

میں نے ہنس کر کہا:

"یہ کوئی اتنی خطرناک مہم نہیں ہے۔ پھر اس کے بارے میں مجھے اتنا کیوں ڈرایا گیا ہے؟"

سیاہ پوش لڑکی نے کہا:

"یہ تم خیال کرتے ہو کہ یہ مہم خطرناک نہیں ہے' لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ مہم کس قدر ہلاکت خیز ثابت ہو سکتی ہے تمہارے لئے ــــــ تمہیں یاد ہے جب تم پہلی بار سردار کے سامنے پیش ہوئے تھے' اور تمہیں پہلی مہم پر روانہ کرنے کے لئے تیار کیا جا

رہا تھا، تو سردار نے تمہیں خبردار کیا تھا کہ سب جگہ چلے جانا مگر کسی مسجد اور کسی گرجا گھر کے نزدیک بھی نہ جانا۔ اگر تم کسی مسجد یا کسی گرجا گھر کے قریب گئے یا اس کے اندر داخل ہونے کی غلطی کر بیٹھے تو تم وہاں سے زندہ واپس نہیں آسکو گے اور بہت ممکن ہے کہ تمہارے جسم کے پرزے اڑ جائیں۔"

میں نے کہا: "ہاں! مجھے یاد ہے۔ لیکن مجھے گرجا گھر میں داخل ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ لاٹ پادری کی اکلوتی بیٹی تو ضرور شہر میں رہتی ہوگی۔ وہ کسی ماڈرن اسکول یا کالج میں پڑھ رہی ہوگی۔ میں اس کے ہوسٹل یا اس کے کالج میں جا کر اس کا دل نکال کر لے آؤں گا۔"

سیاہ پوش لڑکی بولی:

"پادری کی بیٹی سانتافی ایک نن ہے۔ یعنی راہبہ ہے اور وہ راہباؤں کے اسکول میں پڑھتی ہے۔ یہ اسکول گرجا گھر کے اندر ہی ہے۔ اس اسکول کا اصول ہے کہ جو لڑکیاں وہاں مذہبی تعلیم حاصل کرتی ہیں وہ گرجا گھر کی حدود سے باہر نہیں جاسکتیں۔ وہ وہاں گرجا گھر کے اندر ہوسٹل میں ہی رہتی ہیں۔ پادری کی بیٹی بھی گرجا گھر کے ہوسٹل میں رہتی ہے۔ اس مہم کی سب سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ تمہیں اس لڑکی کا دل نکالنے کے لئے گرجا گھر کے احاطے میں داخل ہونا پڑے گا جو تمہاری ہلاکت کا باعث ہو سکتا ہے۔"

میں نے پوچھا: "تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے۔ کیونکہ میں اس مہم میں کامیاب ہو کر اپنے سردار کے تخت کا جانشین بننا چاہتا ہوں۔ کیا تم لوگوں کا کوئی جادو یہاں نہیں چلتا؟"

سیاہ پوش لڑکی بالکل میرے سامنے بیٹھی تھی۔ ہمارے درمیان موم بتی جل رہی تھی۔ لڑکی کی سرخ آنکھوں میں بھی موم بتی کی لو لہرا رہی تھی۔ وہ کہنے لگی:

"سردار نے اسی لئے تمہیں میرے ساتھ بھیجا ہے کہ میں تمہیں وہ ترکیب بتا سکوں جس پر عمل کر کے تم گرجا گھر میں داخل ہونے کے بعد بالکل محفوظ رہو گے اور تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔"

میں نے کہا: "مجھے بتاؤ! وہ کون سی ترکیب ہے۔ میں اس پر ضرور عمل کروں گا۔"

سیاہ پوش لڑکی ایک لمحے کے لئے مجھے گھورتی رہی۔ پھر گہرا سانس بھر کر بولی:

"تمہیں ہم نے اس لئے اپنے گروہ میں شامل کیا تھا کہ تم اس دنیا کے وہ اکیلے آدمی ہو جس نے شمالی ہندوستان کے پہاڑی علاقے میں گوروں کے قبرستان میں ایک ایسے انگریز کی قبر میں ساری رات گزارنے کی جرائت کی جو کالے جادوگروں کے گروہ کا سردار تھا۔ اس کے ساتھ ہی تم وہ واحد آدمی ہو جس کو مدھو سورن جنگل کی پاتالی چڑیل نے اپنے ہیبت ناک آسیب میں جکڑا اور تم اس کی وحشیانہ پیاس کی خاطر میٹھے خون والی نوجوان لڑکیوں کا خون پیتے رہے۔ ہمارے سردار کو تم ایسے آدمی کی ایک مدت سے تلاش تھی۔ کیونکہ تمہاری مدد کے بغیر وہ کالے جادو کا وہ مقام حاصل نہیں کر سکتا تھا جہاں وہ زمین اور زمین کے اندر کے تمام جادوگروں کا بادشاہ کہلاتا۔ اس کی اس کمی کو صرف تمہارے ایسا آدمی ہی پورا کر سکتا تھا۔ ہم ہر کام کر سکتی ہیں، مگر جو کام تم کر سکتے ہو وہ ہم میں سے کوئی نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہمیں پتہ چلا کہ شہید کی روح کی تلاش میں فرانس کے جنوبی ساحل پر پہنچ چکے ہو تو سردار کے حکم سے ہم لوگ تمہیں وہاں سے اٹھا کر لے آئے۔"

میں نے کہا: "تم جو کچھ کہہ رہی ہو، مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں سردار کے حکم کا پابند ہوں اور مجھے سردار کی خاطر گناہ کرتے ہوئے لذت محسوس ہوتی ہے۔"

سیاہ پوش لڑکی نے میرا منہ چوم لیا۔ اس کے ہونٹ کڑوے تھے اور عجیب بات تھی کہ اس کا اوپر والا ہونٹ ٹھنڈا تھا اور نیچے والا ہونٹ گرم تھا۔ کہنے لگی:

"میں یونہی تم سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی تھی، جو کچھ میں نے کہا اسے بھول جاؤ۔ اب میں تمہیں وہ طریقہ بتاتی ہوں جس پر عمل کر کے تم پادری کی بیٹی سانتافی تک پہنچ سکو گے اور تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

میرا وہ وجود جو اس وقت سیاہ پوش لڑکی کے سامنے آسیب زدہ کوٹھڑی میں بیٹھا تھا ایک شیطان صفت گروہ کے طلسم کے زیرِ اثر تھا اور اس جسم میں شیطانی عفریت تحلیل کر چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے پاتالی چڑیل اور راولپنڈی کے شمال میں پہاڑی قبرستان میں گورے کی قبر بھی یاد نہیں رہی تھی' جہاں مَیں نے ساری رات گزاری تھی اور یہ سب کچھ مَیں نے اپنی بیمار بہن کے سر سے منحوس چڑیل کا آسیب اتارنے کے لئے کیا تھا۔ مگر مَیں جو اپنے عفریت زدہ وجود کے ساتھ سائے کی طرح سفر کر رہا تھا' مجھے ان ساری باتوں کا علم تھا' مگر مَیں بولنے اور کسی چیز کو چھونے سے محروم تھا۔ مَیں ایک خاموش تماشائی کی طرح اپنے سے الگ رہ کر اپنے ہی عفریت زدہ' آسیب زدہ جسم کے ساتھ پیش آنے والے عبرت ناک واقعات دیکھنے پر مجبور تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میرا وجود ان خبیث شیطانوں کے مکروہ جادو کے اثر سے کب آزاد ہو گا اور مَیں کب اپنے شہر لاہور واپس جا سکوں گا۔ اُس وقت بھی مَیں بے بسی کی حالت میں اپنے وجود سے الگ کھڑا تھا اور یہ سننا چاہتا تھا کہ یہ سیاہ پوش لڑکی جو شیطانی سردار کی آلۂ کار تھی پادری صاحب کی معصوم بچی پر قاتلانہ حملہ کرنے کی کونسی ترکیب میرے عفریت زدہ' آسیب زدہ وجود کو بتانے والی ہے۔

اس وقت اگر مجھ میں اتنی طاقت ہوتی کہ مَیں بول سکتا تو مَیں اپنے آسیب زدہ اور اپنے سے الگ وجود کو چیخ چیخ کر کہتا کہ سلیم احمد! سلیم احمد خدا کا خوف کرو، تم ایک المناک موت کی طرف بڑھ رہے ہو، یہاں سے بھاگ جاؤ بھاگ جاؤ۔ اپنی زندگی اور اپنا ایمان بچا کر یہاں سے بھاگ جاؤ مگر میں اپنے وجود کا محض ایک سایہ تھا۔ نہ مَیں چھو سکتا تھا' نہ بول سکتا تھا۔ صرف سن سکتا تھا اور سیاہ پوش لڑکی کی باتیں سننے پر مجبور تھا۔ سیاہ پوش لڑکی کہنے لگی:

"پادری کی بیٹی صرف اتوار کی صبح کو گرجا گھر کے ہوسٹل سے نکل کر شہر کے ایک

قبرستان میں جاتی ہے' جہاں اس کی والدہ کی قبر ہے۔ وہ قبر پر پھولوں کا گلدستہ رکھ کر دعا مانگتی ہے اور یہیں سے گاڑی میں بیٹھ کر گرجا گھر واپس آ جاتی ہے۔"

مَیں نے کہا: "یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ مَیں اتوار کی صبح کو پادری کی بیٹی کو دبوچ لوں گا اور گاڑی کے اندر ہی اس کا دل نکال کر اس کی لاش کو اٹھا کر لے آؤں گا۔"

سیاہ پوش لڑکی کہنے لگی:

"پادری کی بیٹی نے اپنے گلے میں چاندی کی ایک چھوٹی سی صلیب ڈال رکھی ہے۔ جب تک یہ صلیب اس کے گلے میں لٹکتی ہے' تم اس کے قریب بھی نہیں جا سکتے۔ اگر اس کے قریب جانے کی کوشش کرو گے تو تمہارا جسم پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔

مَیں نے پوچھا: "تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

اتوار کے روز جب پادری کی بیٹی قبرستان جاتی ہے تو اس کا پادری باپ بھی اس کے ساتھ ہوتا ہے' وہ بھی اپنی بیوی کی قبر پر پھول رکھتا اور دعا کرتا ہے۔ قبرستان سے واپسی پر اس کی بیٹی گرجا گھر آ جاتی ہے اور اس کا پادری باپ وہیں قبرستان کی ایک خانقاہ میں رک جاتا ہے جہاں وہ رات بھر عبادت میں مصروف رہتا ہے۔ اس پادری کے گلے میں ایک چھوٹا سا لاکٹ ہوتا ہے' جس کو وہ خانقاہ میں جاتے ہی اتار کر لکڑی کی ایک صندوقچی میں بند کر دیتا ہے۔ تمہیں اس لاکٹ کو اپنے قبضے میں کرنا ہے۔ جب لاکٹ تمہارے قبضے میں آ جائے گا تو پھر تم بے دھڑک اس کی بیٹی سانتافی کے قریب جا سکو گے اور تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔"

مَیں نے پوچھا۔ "کیا اس لاکٹ پر بھی کوئی طلسم کیا ہُوا ہے؟"

سیاہ پوش لڑکی نے کہا۔ "یہ جاننے کی تمہیں ضرورت نہیں ہے' جو مَیں کہتی ہوں وہ کرو۔ پادری کا لاکٹ تمہارے پاس آ گیا تو پھر اس کی بیٹی کے گلے میں پڑی ہوئی صلیب کا تم پر کوئی اثر نہیں ہو گا۔"

لاکٹ کو اپنے قبضے میں لیتے ہی تمہیں فوراً گرجا گھر کے ہوسٹل میں پہنچ کر پادری کی بیٹی کا دل نکال کر اس کی لاش اٹھا کر اس قبرستان میں آ جانا ہوگا' میں تمہیں اسی جگہ ملوں گی۔ یاد رکھو، تمہیں بڑی ہوشیاری سے کام لینا ہوگا۔ پادری کا لاکٹ اٹھاتے وقت تم سے ذرا سی بھی بے احتیاطی ہو گئی تو وہیں تمہاری موت واقع ہو جائے گی۔ کل اتوار کا دن ہے، پادری کی بیٹی اپنے باپ کے ساتھ شام کے وقت قبرستان جائے گی۔ تم ان کا دور رہ کر پیچھا کرو گے اور اس کے بعد وہی کچھ کرو گے جیسا میں نے تمہیں کہا ہے۔ میں جا رہی ہوں۔ تم آج کی رات کا باقی حصہ اور کل کا سارا دن اسی کوٹھڑی میں گزارو گے۔ میں کل شام کو تمہیں یہاں سے آ کر لے جاؤں گی۔"

سیاہ پوش لڑکی چلی گئی۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔ موم بتی میز پر میرے سامنے جل رہی تھی۔ میں منفی قوتوں کے قبضے میں تھا۔ میں نارمل انسان نہیں رہا تھا۔ میرے لئے سونا جاگنا' کھانا پینا یا نہ کھانا پینا ایک برابر تھا۔ اب خیال کرتا ہوں تو لگتا ہے کہ میں نے اسی کوٹھڑی میں بیٹھے بیٹھے پتھر کے بت کی طرح رات اور دوسرا سارا دن گزار دیا تھا۔

جب سیاہ پوش لڑکی دوبارہ کوٹھڑی میں نمودار ہوئی تو اس نے مجھے بتایا کہ پیرس میں اتوار کی شام کا وقت ہے اور وہ مجھے لینے آئی ہے۔ میں اس کے ساتھ چلنے کے لئے فوراً تیار ہو گیا۔ اس نے بازو کھول کر مجھے اپنے ساتھ لگا لیا اور مجھے آنکھیں بند کرنے کا حکم دیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور پھر میرے کانوں میں آندھیاں چلنے لگیں۔ میرے پاؤں زمین سے بلند ہو گئے اور طوفانی ہواؤں کا شور میرے ساتھ ساتھ پرواز کرنے لگا۔ جب یہ شور تھما اور میرے پاؤں زمین کے ساتھ لگ گئے تو سیاہ پوش لڑکی نے مجھے آنکھیں کھولنے کا حکم دیا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میں قبرستان کے گیٹ کے پاس تھا مگر یہ کوئی دوسرا قبرستان تھا۔ اس کا دروازہ بھی مختلف تھا۔ سیاہ پوش لڑکی کہنے لگی:

"میں تمہیں اس قبرستان میں لے آئی ہوں' جہاں پادری کی بیٹی کی ماں کی قبر ہے اور

پادری کی بیٹی اپنے باپ کے ساتھ تھوڑی دیر میں پہنچنے والی ہے۔ تم پادری کی بیٹی سے کم از کم دس گز دور رہو گے اور اس فاصلے کو قائم رکھو گے۔ جب پادری اپنی بیٹی سے ہو کر قبرستان کے پیچھے خانقاہ کی طرف جائے گا تو تم اس کے پیچھے جاؤ گے اور خانقاہ اس کا لاکٹ اپنے قبضے میں لینے کی کوشش کرو گے۔ باقی باتیں اس وقت ہوں گی جب دری کی بیٹی کا دل اور اس کی لاش لے کر پرانے قبرستان کے گیٹ پر پہنچو گے۔"

یہ کہہ کر سیاہ پوش لڑکی غائب ہو گئی۔ یہ ویران ساختہ حال قبرستان تھا۔ شام کا ہلکا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ قبروں کی بیلیں اور کتبے دھندلے دھندلے نظر آ رہے تھے۔ کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں گیٹ کی ایک طرف ہو کر جھاڑیوں کی اوٹ میں گیا اور پادری کی بیٹی کا انتظار کرنے لگا۔ سیاہ پوش لڑکی نے مجھے پادری کی بیٹی کا حلیہ ادیا تھا۔

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔

مَیں قبرستان کے گیٹ کے قریب ہی ایک درخت کی اوٹ میں بیٹھا تھا۔ اتنے میں ایک گاڑی قبرستان کے گیٹ کے پاس آکر رکی۔ اس میں سے ایک بوڑھا آدمی جس نے سیاہ لبادہ پہن رکھا تھا' گاڑی سے نکلا۔ اس کے بعد ایک دراز قد نوجوان لڑکی باہر نکلی جس نے راہباؤں والا لباس پہنا ہوا تھا۔ مَیں نے اسے پہلی نظر میں ہی پہچان لیا۔ یہ پادری کی بیٹی اور میرا شکار ساناتافی تھی۔ مَیں جلدی سے دس پندرہ قدم پیچھے ہٹ کر قد آدم جھاڑیوں کی آڑ لے کر کھڑا ہو گیا۔ مَیں پادری کی بیٹی سے دور دور رہنا چاہتا تھا۔ لڑکی کے ساتھ اس کا پادری باپ ہی ہو سکتا تھا۔ دونوں باپ بیٹی قبروں کے درمیان سے گزر کر ایک قبر کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔ دونوں کے ہاتھوں میں پھولوں کے گلدستے تھے۔ انہوں نے قبر پر پھول رکھے اور سر جھکا کر دعا پڑھنے لگے۔ مَیں کچھ فاصلے پر کھڑا انہیں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ دعا سے فارغ ہونے کے بعد پادری اپنی بیٹی کو ساتھ لے کر قبرستان کے گیٹ کی طرف واپس آگیا۔ اس نے لڑکی کو گاڑی میں بٹھانے سے پہلے اس کا ہاتھ چوما اور دروازہ بند کر دیا۔ گاڑی واپس روانہ ہو گئی۔ جب تک گاڑی دور نہیں چلی گئی پادری وہیں کھڑا رہا۔ پھر وہ پُرسکون قدم اٹھاتا قبرستان کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ مَیں نے اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ قبرستان کے کونے میں ایک کوٹھڑی تھی۔ پادری اس کوٹھڑی میں داخل ہو

ا۔ یہی وہ خانقاہ تھی' جہاں پادری نے ساری رات عبادت میں گزارنی تھی اور جہاں مجھے ں کے لاکٹ کو اپنے قبضے میں لینا تھا۔ اس وقت اندھیرا ہو گیا تھا۔

مَیں کوٹھڑی کے پاس ہی اندھیرے میں چھپا رہا۔ پادری کچھ دیر کے بعد خانقاہ کی کوٹھڑی ے نکل کر قبروں کی طرف چل دیا۔ میرے لئے یہ بڑا اچھا موقع تھا۔ مَیں دبے پاؤں ٹھڑی میں گھس گیا۔ چھوٹی سی تنگ کوٹھڑی تھی۔ کارنس پر دو موم بتیاں روشن تھیں۔ ے طرف میز پر لکڑی کی صندوقچی رکھی ہوئی تھی۔ مَیں نے جلدی سے صندوقچی کو کھول ر دیکھا۔ اس میں چاندی کا ایک تکونا لاکٹ پڑا تھا۔ مجھے اسی لاکٹ کی تلاش تھی۔ مَیں ے لاکٹ اٹھایا ہی تھا کہ پیچھے سے کسی نے بڑی شفقت بھرے لہجے میں کہا:

"میرے بیٹے! یہ کیا کر رہے ہو؟"

مَیں نے پلٹ کر دیکھا تو موم بتیوں کی روشنی میں مجھے ساناتافی کا باپ یعنی پادری کھڑا نظر ا۔ اس کے چہرے پر ایک پُرسکون روشنی کی کرنیں سی نکل رہی تھیں۔ مجھے روشنی کی کرنیں اپنے جسم میں سرایت کرتی محسوس ہو رہی تھیں۔ مَیں نے لاکٹ کو پُراسرار ت کے زیرِ اثر صندوقچی میں رکھ دیا۔ مَیں بت بنا پادری صاحب کے چہرے کو دیکھ رہا ا۔ پادری صاحب آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے میرے قریب آ گئے۔ انہوں نے اپنا ہاتھ رے سر پر رکھا اور کہا:

"میرے بچے! مَیں تمہیں عذاب سے نجات کی خوشخبری دیتا ہوں۔ خداوند کریم نے ارے گناہ معاف کر دیئے ہیں۔ لیکن اب کبھی گناہ کا خیال بھی دل میں نہ لانا۔ ورنہ پھر ابوں کے ایسے جہنم میں ڈال دیئے جاؤ گے کہ جہاں قیامت تک جلتے رہو گے۔"

مَیں جو اب تک اپنے آسیب زدہ وجود کا سایہ بن کر اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا ک دم سے جیسے اپنے وجود کے اندر واپس آگیا۔ اب مَیں اپنے اصلی وجود کا مالک تھا۔ پنے اصلی وجود کی روح تھا۔ مجھے اپنے سارے گناہ یاد آنے لگے تھے۔ مجھے گناہوں میں ت کی بجائے کراہت محسوس ہونے لگی تھی۔ مَیں پادری صاحب کے آگے دو زانو ہو گیا

اور مَیں نے اپنا سر جھکا دیا۔ اس وقت میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ پادری صاحب نے مجھے اٹھا کر گلے سے لگا لیا اور کہا:

"میرے بچے! شاید ان آنسوؤں نے تمہیں بخشوا دیا ہے۔ تم جن بدروحوں کے قبضے میں تھے ان سے الگ ضرور کر دیئے گئے ہو، مگر ابھی تک ان کے چنگل سے آزاد نہیں ہوئے۔"

مَیں اب اپنے آپ میں تھا۔ میری انسانیت واپس آ چکی تھی۔ مَیں نے پادری صاحب سے کہا:

"مَیں صدق دل سے اپنے گناہوں سے توبہ کرتا ہوں، مجھے نجات کی راہ بتایئے کہ مَیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بدی کی منحوس طاقتوں کی گرفت سے آزاد ہو کر نیک زندگی بسر کر سکوں۔"

پادری صاحب نے مجھے اپنے سامنے کرسی پر بٹھا دیا اور خود سٹول پر بیٹھ گئے۔ کہنے لگے:

"مَیں جانتا ہوں تم یہاں کیوں آئے تھے۔ مگر قدرت کا یہی منشا تھا کہ تم یہاں آؤ اور مجھ سے ملو۔ کیونکہ خداوندِ کریم کے حکم سے مَیں ہی تمہیں وہ راستہ بتا سکتا ہوں کہ جس پر چل کر تم بدروحوں سے ہمیشہ کے لئے نجات پا سکتے ہو۔"

میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ مَیں نے کہا:

"پادری صاحب! حکم کیجئے کہ مجھے کیا کرنا ہوگا۔ مَیں اپنی جان پر کھیل کر آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا۔ مَیں نے اپنے آپ کو دیکھ لیا ہے۔ مَیں نے اپنے آپ کو پہچان لیا ہے اور مَیں نے ان بدروحوں کو بھی پہچان لیا ہے جو مجھے اپنا غلام بنا کر مجھ سے ہر قسم کے گناہوں کا ارتکاب کروا رہے تھے۔" پادری صاحب کہنے لگے:

"میرے بچے! تمہیں فوراً ملک ہندوستان میں جانا ہوگا۔ تم اگرچہ ہندوستان کے ہی رہنے والے ہو، لیکن اب یہ ملک تقسیم ہو چکا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے

ے ایک الگ ملک پاکستان بنا لیا ہے، جہاں وہ ہندوؤں کی غلامی سے آزاد ہو کر اپنے دینِ
لام کے مطابق امن و سکون سے زندگی بسر کر سکیں گے۔ اگرچہ اس وقت ہندوستان
دات کی آگ کی لپیٹ میں ہے۔ لیکن جہاں مَیں تجھے بھیج رہا ہوں وہ اس آگ سے
ں تک محفوظ ہے۔ یہ ریاست حیدر آباد دکن ہے۔ تم اس ریاست کے دوسرے بڑے
اورنگ آباد جاؤ گے۔ اورنگ آباد میں مغلیہ سلطنت کے آخری خدا پرست شہنشاہ
نگ زیب عالمگیر" کا مزار ہے۔ تم اس کے مزار پر جا کر فاتحہ پڑھنا۔ اس کے بعد تم وہاں
، سات میل کے فاصلے پر اجنٹا نام کے قصبے سے گزرو گے۔ جس کے آگے وسطی
وستان کے گھنے جنگل شروع ہو جاتے ہیں۔ جیسے ہی تم اس جنگل میں داخل ہو گے
ں ایک پرانی بارہ دری دکھائی دے گی۔ اس بارہ دری کے پہلو میں ایک قدیم کنواں
۔ تم اس بارہ دری میں جا کر بیٹھ جاؤ گے۔ آدھی رات کے بعد کنوئیں کے پاس ایک
ح کا ہیولا نمودار ہوگا۔ وہ تم سے پانی مانگے گی۔ ڈر مت جانا۔ تم کنوئیں میں سے پانی
ں کر اسے پلانا۔ پھر جو کچھ ہوگا تمہیں خود معلوم ہو جائے گا۔"

مَیں نے عرض کی: "مجھے ڈر ہے کہ جن بدروحوں نے اپنی شیطانی طاقتوں سے مجھے
، قبضے میں کر رکھا ہے وہ مجھے وہاں تک نہیں پہنچنے دیں گی۔"

پادری صاحب نے لکڑی کے ایک پیالے میں سے چاندی کا چھوٹا سا لاکٹ نکال کر مجھے
ے ہوئے کہا:

"اسے اپنے گلے میں پہن لو۔ تم پر کسی بدروح کے کالے جادو کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔
بدروحوں کا منحوس آسیب تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ اس لاکٹ کی حفاظت کرنا، یہ
ستان میں پہنچنے کے بعد بھی تمہارے کام آئے گا۔ کیونکہ وہاں تمہاری دشمن پاتالی
ح تمہارا انتظار کر رہی ہے۔"

ئیں نے پادری صاحب سے پوچھا:

"لگتا ہے آپ کو بہت سے خفیہ رازوں کا علم ہے۔ یہ فرمائیں کہ مجھ پر جو ڈراؤنے

دورے پڑتے تھے کیا ہندوستان کی سرزمین میں پہنچ کر پھر سے شروع ہو جائیں گے؟"

پادری صاحب کہنے لگے۔ "اس بارے میں مَیں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا۔ کیونکہ ان دوروں کا تعلق براہِ راست تمہارے اعمال کے جزا و سزا سے ہے۔ مَیں تمہیں اسی لئے اورنگ زیبؒ بادشاہ کے مزار پر بھیج رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری سب بلائیں خداوندِ کریم کی مدد سے دور ہو جائیں گی۔"

مَیں نے پوچھا: "کیا اس وقت پیرس سے کوئی ایسا ہوائی جہاز مل جائے گا جو مجھے اس ملک سے باہر پہنچا دے۔ مَیں جتنی جلدی ممکن ہو سکے اس ملک سے نکل جانا چاہتا ہوں۔"

پادری صاحب کہنے لگا:

"پیرس بہت بڑا انٹرنیشنل ایئرپورٹ ہے' یہاں سے کسی نہ کسی ملک کی طرف ہر وقت جہاز جاتے ہی رہتے ہیں۔ کیا تمہارے پاسپورٹ پر کسی ملک کا ویزا لگا ہُوا ہے؟"

مجھے معلوم تھا کہ میرے پاسپورٹ پر یونان اور ترکی کا ویزا لگا ہُوا تھا۔ جب مَیں نے پادری صاحب کو اس سے آگاہ کیا تو وہ بولے:

"مجھے یقین ہے تمہیں ان ملکوں میں سے کسی ایک ملک کو جانے والی فلائیٹ مل جائے گی۔ ٹکٹ بھی تمہیں ایئرپورٹ پر ہی مل جائے گا۔ کیا تمہارے پاس یہاں کی کرنسی ہے؟"

مَیں نے کہا: "میرے پاس بہت سے ڈالر ہیں۔ امریکی ڈالر۔"

پادری صاحب بولے: "پھر فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ تم اسی وقت ٹیکسی پکڑ کر ایئرپورٹ روانہ ہو جاؤ۔ اگرچہ میرا دیا ہوا لاکٹ تمہاری ضرور حفاظت کرے گا' لیکن اس کے باوجود ان بدروحوں کا خطرہ ضرور ہے۔"

مَیں نے پادری صاحب کا دیا ہُوا لاکٹ اپنے گلے میں پہن لیا۔ پادری صاحب کا بڑے ادب سے جھک کر ہاتھ چوما اور اس خانقاہ سے نکل آیا۔ قبرستان میں سناٹا چھایا ہُوا تھا۔ اب مجھے ڈر لگنے لگا تھا کہ کہیں شیطانی سردار کے سیاہ پوش شیطان مجھ پر حملہ نہ کر دیں۔ خاص

ور پر مجھے سیاہ پوش لڑکی کا خطرہ تھا کیونکہ وہ سائے کی طرح میرے ساتھ لگی ہوئی ی۔ قبرستان سے ایک سڑک شہر کی روشنیوں والے علاقے کی طرف جاتی تھی۔ مَیں ں سڑک پر چل پڑا۔ ابھی رات کا پہلا پہر ہی تھا۔ پیرس ایسا شہر ہے کہ وہاں کسی بھی ت کہیں سے بھی کوئی نہ کوئی ٹیکسی مل جاتی ہے۔ مجھے بھی ایک خالی ٹیکسی مل گئی اور ں ایئرپورٹ پہنچ گیا۔ وہاں مَیں نے پاسپورٹ نکال کر دیکھا۔ میرے پاسپورٹ پر ترکی اور نان کا ویزا لگا ہُوا تھا۔ ایئرپورٹ پر کئی ایئر سروسز کی ایجنسیوں کے کاؤنٹر تھے۔ ایک کاؤنٹر مَیں نے اپنا پاسپورٹ اور ویزا دکھا کر پیرس سے ایتھنز کی فلائیٹ کا ٹکٹ لے لیا۔ معلوم وا کہ جہاز آدھ گھنٹے میں فرینکفرٹ سے پیرس پہنچنے والا ہے جو یہاں سے مسافروں کو لے کر یونان کی طرف پرواز کر جائے گا۔

مَیں ایئرپورٹ کے لاؤنج کے کونے میں بیٹھ گیا۔ مَیں اپنے آپ کو سیاہ پوش شیطانی لڑکی کی نظروں سے چھپانا چاہتا تھا۔ حالانکہ وہ مجھے کسی بھی جگہ کسی بھی وقت دیکھ سکتی تھی۔

اور ایسا ہی ہُوا۔ جیسے ہی مَیں ایئرپورٹ کے لاؤنج میں بیٹھا! میرے کانوں میں تیز ہواؤں کا شور اٹھنے لگا۔ ساتھ ہی مجھے ایک دھکا سا لگا۔ مَیں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا اور کلمہ شریف پڑھتے ہوئے مشروبات والے کاؤنٹر کی طرف آ گیا۔ کلمہ شریف پڑھنے کے بعد مجھے کوئی دھکا تو نہ لگا لیکن میرے کانوں کا شور بڑھتا گیا۔ پھر ایسے دھماکے سنائی دینے لگے' جیسے کہیں بمباری ہو رہی ہو۔ مَیں سمجھ گیا کہ شیطانی طاقتوں کو میرے فرار کا علم ہو گیا ہے اور انہوں نے مجھ پر حملہ کر دیا ہے' مگر میرے گلے میں پڑے ہوئے لاکٹ اور کلمہ شریف پڑھنے کی وجہ سے مجھ پر ان کے حملے بے اثر ہو رہے تھے۔

اچانک میرے کانوں میں سیاہ پوش لڑکی کی چیخ بلند ہوئی۔ یہ چیخ اتنی اچانک اور اتنی بھیانک تھی کہ مَیں نے بے اختیار ہو کر اپنے کانوں پر دونوں ہاتھ رکھ دیئے۔ میرے ساتھ کھڑے ایک آدمی نے تعجب سے میری طرف دیکھا اور فرانسیسی زبان میں مجھ سے کچھ

پوچھا۔ لیکن اس کی فرانسیسی زبان میری سمجھ میں نہ آئی۔ اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ مَیں شیطانی سیاہ پوشوں کے کالے جادو کے اثر سے نکل آیا ہوں۔ یہ ان کے جادو اور کالے منتروں کا اثر تھا کہ مَیں دنیا کی ہر زبان بول اور سمجھ سکتا تھا۔ ان کا منحوس اثر ختم ہوتے ہی میرے لئے فرانسیسی زبان ایک اجنبی زبان ہو گئی تھی اور مَیں نہ اسے سمجھ سکتا تھا' نہ بول سکتا تھا۔ مَیں کاؤنٹر سے ہٹ کر واپس اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ مَیں نے کلمۂ پاک کا ورد تیز کر دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد دھماکوں کی آوازیں اور تیز ہواؤں کا شور غائب ہو گیا۔

مَیں نے وہیں بیٹھے بیٹھے کافی کا ایک پیک خریدا اور اسے پینے لگا۔ مَیں نے اپنی انگلی کو دیکھا۔ کامنی نرتکی کی دی ہوئی چاندی کی انگوٹھی بدستور میری انگلی میں تھی۔ میرے کانوں میں اب صرف ایئرپورٹ کی آوازیں ہی آ رہی تھیں۔ اتنے میں سپیکر پر فرانسیسی زبان اور انگریزی زبان میں اعلان ہُوا کہ یونان جانے والی فلائیٹ فرینکفرٹ سے پیرس کے ایئرپورٹ پر پہنچ گئی ہے۔ مجھے کچھ اطمینان ہُوا کہ اس ملک سے مجھے جلد چھٹکارا مل جائے گا' جہاں ان بدروحوں کا ہیڈکوارٹر ہے۔ مَیں برابر کلمۂ پاک کا ورد کر رہا تھا۔ میرا لباس وہی تھا جو مجھے سیاہ پوش لڑکی نے پہنایا تھا' میری جیب میں وہ لفافہ بھی موجود تھا جس میں سو سو کے کتنے ہی امریکی ڈالروں کے نوٹ اب بھی موجود تھے۔ مجھے خطرہ تھا کہ یہ جادو کے زور سے پیدا کئے گئے نوٹ ہیں اور کسی بھی وقت غائب ہو سکتے ہیں۔ مجھے سب سے زیادہ یہ خطرہ تھا کہ میرے قیمتی کپڑے بھی شیطانی سیاہ پوش لڑکی کے طلسمی منتروں کی کارستانی ہے اور یہ بھی کسی وقت غائب ہو سکتے ہیں اور مَیں عین لوگوں کے درمیان ننگا ہو جاؤں گا۔ مَیں دل میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ یا اللہ پاک میری لاج رکھ لینا۔

آخر سپیکر پر یہ اعلان ہُوا کہ ایتھنز جانے والے مسافر انٹرنیشنل لاؤنج میں پہنچ جائیں۔ مَیں بھی دوسرے مسافروں کے ساتھ اٹھ کر کاؤنٹر پر گیا۔ بورڈنگ کارڈ لیا۔ چیکنگ کرائی اور انٹرنیشنل لاؤنج میں آکر بیٹھ گیا۔ عین اس وقت میرے کانوں میں سیاہ پوش لڑکی کی

از گونج اٹھی۔ اس کی آواز میں غیض و غضب اور سخت غصہ تھا۔ اس نے کہا:

"تم کچھ بھی کر لو۔ لیکن ہم سے بچ کر نہ جا سکو گے۔ ہم تمہارے سر پر منڈلا رہے ں۔ کسی بھی جگہ تمہاری گردن دبوچ لیں گے۔"

مَیں سخت گھبرایا اور آنکھیں بند کر کے خدا کے حضور دعا مانگی کہ یا اللہ پاک! مجھے ان وں سے محفوظ رکھنا۔ مجھے اپنی حفاظت میں لے لینا اور ان بدروحوں سے بچانا۔ آخر وہ ت آ گیا جب مسافر لاؤنج سے نکل کر رن وے پر کھڑے جہاز کی طرف جا رہے تھے۔ ں بھی ان کے ساتھ ہی بس میں بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مَیں جہاز کے اندر اپنی سیٹ پر ٹھا تھا اور جہاز رن وے پر پوری رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ پھر جہاز ٹیک آف کر گیا۔

مَیں کھڑکی والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ کھڑکی کے بیضوی شیشے میں سے نیچے پیرس کی روشنیاں ر آ رہی تھیں۔ اچانک دور نیچے ان روشنیوں میں سے ایک سیاہ ہیولا سا تیزی سے اوپر ھتا ہُوا میری کھڑکی کے شیشے کے سامنے آکر گردش کرنے لگا۔ مَیں ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔ یاہ ہیولے نے شیطانی سیاہ پوش لڑکی کی شکل اختیار کر لی۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل ہے تھے۔ مجھے اس کے غرانے اور غیض و غضب کی آوازیں سنائی دینے لگی۔ وہ شیشے کے بالکل قریب آکر مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ مَیں نے لاکٹ پر ہاتھ کھ دیا۔ سیاہ ہیولا غائب ہو گیا۔

میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ ہماری سیٹ کے قریب سے ایئرہوسٹس گزری۔ مَیں نے سے آواز دے کر بلایا کہ کوکا کولا یا کوئی ٹھنڈا مشروب منگوا کر پیئوں۔ ایئرہوسٹس نے لٹ کر میری طرف دیکھا اور میری طرف جھک گئی۔ میری چیخ نکل گئی۔ وہ ایئرہوسٹس نہیں تھی بلکہ وہی شیطانی سیاہ پوش لڑکی تھی۔ ایئرہوسٹس ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔ میرے ساتھ والے مسافر نے فرنچ زبان میں کچھ کہا۔ یہی کہا ہو گا کہ کیا بات ہے موسیو؟ ایئر ہوسٹس نے انگریزی میں پوچھا:

"سر! مَیں آپ کے لئے کیا لاؤں؟"

سیاہ پوش لڑکی کی شکل غائب ہو چکی تھی اور اس کی جگہ خوبصورت شکل والی واپس آ چکی تھی۔ مَیں اسے کیا بتاتا کہ میرے ساتھ کیا گزری ہے اور کیا کچھ گزر چکی ہے اور نہ جانے آگے کیا کیا گزرنے والی تھی۔ مَیں نے تھکی ہوئی آواز میں کہا:

"ہاں! کافی پلیز۔"

ایئرہوسٹس چلی گئی۔ مَیں خوف کے مارے جہاز کی کسی بھی کھڑکی کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ جہاز ایتھنز کے ایئرپورٹ پر اتر رہا تھا۔ تھوڑی سی رات باقی رہ گئی تھی۔ مَیں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر تسلی کرلی۔ میری جیب میں ابھی تک ڈالر موجود تھے۔ مَیں نے بڑی عقل مندی سے کام لیتے ہوئے ایئرپورٹ پر ہی ایکسچینج کے کاؤنٹر پر سارے امریکی ڈالر دے کر کمیشن کٹوا کر اس کے عوض ٹریولرز چیک بک لے لی۔ تاکہ اگر سیاہ پوش لڑکی انتقامی کارروائی کرتے ہوئے اپنے دیئے ہوئے ڈالر غائب بھی کردے تو مجھے کوئی فرق نہ پڑے۔ خطرہ اگر تھا تو یہ تھا کہ کہیں اچانک میرا سوٹ میرے جسم پر سے غائب نہ ہو جائے۔ کیونکہ یہ سوٹ ہی بدروحوں کے طلسم کے اثر سے میرے پاس آیا تھا۔ خدا کا شکر تھا کہ ابھی تک ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔

مَیں نے ایک بار پھر اپنے پاسپورٹ کا جائزہ لیا کہ اس پر جادو کے زور سے کن کن ملکوں کے ویزے لگے ہوئے ہیں۔ یہ دیکھ کر میں بہت خوش ہُوا کہ اِن میں انڈیا کا ویزا بھی تھا۔ گویا مَیں انڈیا جا سکتا تھا۔ ایئرپورٹ پر ہی مَیں نے معلوم کرلیا کہ برطانیہ کی ایک ایئرویز کا جہاز لندن سے ایتھنز ہوتا ہُوا دن کے وقت انڈیا جائے گا۔ مَیں وہیں ایئرپورٹ پر ہی بیٹھا رہا۔ وہیں دن کا ناشتہ کیا اور نو بج کر پچیس منٹ پر برطانیہ کی ایک کمپنی کے جہاز میں سوار ہو کر انڈیا کی طرف پرواز کر گیا۔ جہاز بمبئی جا رہا تھا' جہاں سے آگے اُسے سنگاپور جانا تھا۔ جہاز میں انڈین مسافروں کی تعداد کافی تھی۔ میرے ساتھ والی سیٹ پر ایک انڈین بیٹھا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ مَیں کہاں جا رہا ہوں۔ جب میں نے اسے بتایا کہ مَیں لاہور جا رہا ہوں تو وہ بولا:

"پنجاب میں تو آگ لگی ہوئی ہے۔ لوگ ایک دوسرے کا خون بہا رہے ہیں۔"

مجھے پادری صاحب نے بھی بتا دیا تھا کہ پاکستان بن جانے کے بعد مشرقی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کا قتلِ عام شروع کر دیا ہے۔ کئی خیال میرے دل میں آ رہے تھے لیکن ابھی مجھے حیدر آباد دکن جانا تھا۔ جہاں حالات اتنے خراب نہیں ہوئے تھے شاید اس لئے بھی کہ وہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور یہ اسلامی ریاست تھی۔ مَیں بمبئی پہنچ گیا۔ بمبئی میں حالات معمول کے مطابق تھے۔ ایئرپورٹ سے میں نے انگریزی اردو کے اخبارات دیکھے۔ فسادات کی خبریں بڑی بڑی سرخیوں کے ساتھ چھپی ہوئی تھیں۔

بمبئی سے ایک گاڑی حیدر آباد جایا کرتی تھی جس کا نام دکن کوئین تھا۔ یہ بڑی تیز رفتار گاڑی ہُوا کرتی تھی۔ مَیں اسی گاڑی میں بیٹھ کر حیدر آباد (دکن) پہنچ گیا۔ وہاں مَیں نے ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ ٹریولرز چیک میرے پاس تھے۔ پیسے کی مجھے کمی نہیں تھی۔ میرے پاس صرف ایک چھوٹا اٹیچی کیس تھا۔ ابھی تک طلسمی سوٹ جو مَیں نے پہن رکھا تھا اور جو بڑا قیمتی تھا' میرے پاس ہی تھا اور غائب نہیں ہُوا تھا۔ لیکن اس کا کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ مَیں نے حیدر آباد شہر میں ہی نئی بھورے رنگ کی پتلون اور جیکٹ خرید کر پہن لی۔ وہاں سردی بالکل نہیں تھی۔ یہ اگست ۱۹۴۷ء کے دن تھے۔ برسات اس علاقے میں زوروں پر تھی، بمبئی سے لے کر حیدر آباد تک بارش ہوتی رہی تھی۔ حیدر آباد میں رات کو بارش ہوئی تھی مگر اب موسم صاف تھا۔ مَیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پادری صاحب کا دیا ہُوا لاکٹ میرے گلے میں تھا۔ ان کے کہنے کے مطابق مَیں سیاہ پوش شیطانوں کے منحوس اثرات سے محفوظ ہو گیا تھا۔ مگر اب پاتالی چڑیل کے حملے کا ہر قدم پر خطرہ تھا۔ مَیں پاتالی کے حملے سے خوف زدہ تھا۔ پاتالی چڑیل کا آسیب میرے جسم میں تحلیل ہو کر مجھے انسان سے خونخوار حیوان بنا دیتا تھا جو بڑی ڈراؤنی اور لرزہ خیز بات تھی اور جس سے مَیں گھبرایا ہُوا تھا۔ پادری صاحب نے کہا تھا کہ ان کا لاکٹ بھی مجھے پاتالی چڑیل کے آسیب سے نہ بچا سکے گا' اس لئے مجھے احتیاط سے ہر قدم اٹھانا ہو گا اور جتنی جلد ممکن ہو

سکے شہنشاہ اورنگ زیب" کی قبر پر دعائے فاتحہ کے بعد اجنٹا کے جنگل میں پیاسی روح سے ملاقات کرنی ہوگی۔

حیدر آباد دکن میں دوپہر تک مینہ برستا رہا۔ تیسرے پہر بارش تھمی تو میں ٹرین میں سوار ہو کر اورنگ آباد پہنچ گیا۔ وہاں سے سیدھا اورنگ زیب عالمگیر" کے مزار پر آ گیا۔ اتنے بڑے بادشاہ کی قبر کچی تھی، گنبد بھی کچا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ اس درویش صفت بادشاہ نے وصیت کی تھی کہ اس کی قبر کچی رکھی جائے۔ میں نے فاتحہ پڑھا اور وہیں سے ایک یکے میں دوسری سواریوں کے ساتھ بیٹھ کر مزار سے سات میل کے فاصلے پر اجنٹا کے قصبے میں پہنچ گیا۔ یہ وہی اجنٹا قصبہ ہے، جہاں کی غاروں کی مورتیاں مشہور ہیں اور جنہیں دیکھنے کے لئے سیاح دور دور سے آتے ہیں۔ اجنٹا سے آگے ایک گاؤں تک یکے جاتے تھے، جس جنگل میں مجھے جانا تھا وہ راستے میں پڑتا تھا۔ میں نے ایک سالم یکہ لے لیا اور دوسرے گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب جنگل کی حد شروع ہوئی تو میں نے یکے والے کو واپس کر دیا۔ یہاں سے مجھے پیدل ہی جنگل میں اس بارہ دری کے کھنڈر تک جانا تھا جس کے پہلو میں وہ پُراسرار کنواں تھا، جہاں آدھی رات کو ایک روح نمودار ہو کر پانی مانگتی تھی۔

بڑی غنیمت تھی کہ ابھی تک دوبارہ بارش شروع نہیں ہوئی تھی۔ آسمان بادلوں سے ضرور ڈھکا ہُوا تھا مگر بارش نہیں ہو رہی تھی۔ جنگل کے کنارے تک پہنچتے پہنچتے شام کا اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ پادری صاحب کا لاکٹ ابھی تک میرے گلے میں ہی تھا۔ میں نے پتلون اور جیکٹ پہن رکھی تھی۔ کچھ روپے اور ٹریولرز چیک میں نے ساتھ ہی رکھ لئے تھے۔ کامنی نرتکی کی چاندی کی انگوٹھی بھی میری انگلی میں ہی تھی۔ ابھی تک مجھ پر پاتالی چڑیل کا حملہ نہیں ہُوا تھا۔ مجھے ہر قدم پر اس کا ڈر لگ رہا تھا۔ اس منحوس چڑیل کا کسی بھی وقت حملہ ہو سکتا تھا۔ ابھی تک میں اس کے آسیب کی زد میں ہی تھا۔ جنگل کے درخت شام کے اندھیرے میں سیاہ پوش ہونے لگے تھے۔ میں جنگلوں میں چلنے پھرنے کا

ی ہو چکا تھا۔ مجھے اندھیرے میں بھی جنگلوں میں راستہ تلاش کرنے میں کوئی خاص ت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ یہ جنگل کچھ زیادہ ہی گھنے اور ڈراؤنے تھے۔ درختوں کی نیں نیچے تک جھکی ہوئی تھیں، جنہیں ہاتھوں سے اِدھر اُدھر ہٹا کر راستہ بنانا پڑتا تھا۔ ری صاحب نے مجھے بتا دیا تھا کہ اس جنگل میں داخل ہونے کے بعد مجھے کس سمت کو نا ہے۔ میں اُن کی ہدایت کے مطابق چل رہا تھا۔

میں جنگل میں کافی دور نکل آیا تھا مگر مجھے کسی پرانی عمارت یا بارہ دری کا کھنڈر کہیں ر نہیں آ رہا تھا۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ مجھے پوری آنکھیں کھول کر اور رک رک کر لنا پڑتا تھا۔ یہ دھڑکا بھی لگا تھا کہ اگر اس وقت مجھ پر پاتالی کا آسیب نازل ہو گیا تو کیا روں گا۔ میرا سارا پروگرام اور میرا سارا مشن دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔ لیکن شاید یہ رنگزیب" کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کا اثر تھا کہ ابھی تک میں پاتالی چڑیل کے حملے سے فوظ تھا۔ آخر مجھے جنگل میں ایک جگہ کسی کھنڈر کا خاکہ سا دکھائی دیا۔ میں جلدی جلدی ں کی طرف بڑھا۔ یہ کسی قدیم تاریخی بارہ دری کا کھنڈر تھا۔ یہی میری منزل مقصود ی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ جلدی سے اس کی دوسری طرف جا کر اندھیرے میں ور سے دیکھا تو وہاں ایک کنواں بھی تھا۔ کنوئیں کی منڈیر پر ٹین کا ایک ڈول پڑا تھا، جس کے ساتھ رسی بندھی ہوئی تھی۔ یہی وہ جگہ تھی، جہاں آدھی رات کے بعد پیاسی روح نے ظاہر ہونا تھا۔ میں بارہ دری میں جا کر بیٹھ گیا اور آدھی رات ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ گھڑی میری کلائی پر بندھی ہوئی تھی، جس کی سوئیاں اندھیرے میں بھی نظر آ جاتی تھیں۔ یں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ رات کے پونے آٹھ بج رہے تھے۔ ابھی آدھی رات ہونے یں کافی دیر تھی۔ دل میں بار بار خیال آ رہا تھا کہ اگر اس وقت پاتالی چڑیل نے حملہ کر دیا ؤ میں کچھ نہیں کر سکوں گا۔ بس کلمۂ پاک کا ورد کرتا رہا اور خدا سے اپنی بخشش کی دعائیں انگتا رہا۔ جنگل کی رات بڑی سنسان تھی۔ جنگلی جانوروں شیر اور چیتے وغیرہ کا بھی ڈر تھا۔ ان جنگلوں میں شیر چیتے عام ہوتے ہیں اور رات کو شکار کرنے جنگل میں نکلتے ہیں۔

بارہ دری زمین سے ڈیڑھ دو فٹ ہی اونچی تھی۔ میں جس رخ پر بیٹھا تھا' وہاں سے کنواں مجھے اندھیرے میں دھندلا دھندلا سا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی منڈیر پر رکھا ہوا ڈول بھی دکھائی دے رہا تھا۔

میری نظریں کنوئیں کے عقب میں جو درخت تھے' ان پر لگی ہوئی تھیں۔ میرے خیال میں روح کو ان درختوں میں نمودار ہونا تھا۔ وہاں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کبھی لگتا کہ وقت گزر رہا ہے۔ کبھی لگتا کہ وقت ایک جگہ رک گیا ہے۔ کسی کسی وقت جنگل کے سناٹے میں دور کسی جنگلی جانور کے بولنے کی آواز تھوڑی دیر کے لئے گونج کر خاموش ہو جاتی تھی۔ مجھے جنگل کے سناٹے سے اتنا خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا' جتنا اس خیال سے خوف لگ رہا تھا کہ کہیں مجھے پاتالی چڑیل کا دورہ نہ پڑ جائے۔ پادری صاحب نے مجھے واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ لاکٹ مجھے پاتالی کے آسیب سے نہیں بچا سکے گا۔ اس وقت سوائے خدا کی ذات کے میرا کوئی حامی و مددگار نہیں تھا اور میں اسی کو یاد کر رہا تھا۔

تھوڑی تھوڑی دیر بعد میں گھڑی کی سوئیوں پر نظر ڈال لیتا تھا۔

بڑے کربناک انتظار کے بعد گھڑی نے رات کے دس بجائے۔ ابھی آدھی رات میں دو ڈھائی گھنٹے باقی تھے۔ اس وقت اگر کوئی جنگل جانور مجھ پر حملہ کر دیتا تو اس سے بچاؤ کے لئے میرے پاس پستول تو دور کی بات ہے کوئی چاقو تک نہیں تھا۔ بارہ دری کے شکستہ ستون کے ساتھ لگ کر بس اللہ کے بھروسے سمٹ کر بیٹھا تھا۔ کبھی کبھی سر باہر نکال کر درختوں میں تھوڑے سے نظر آتے آسمان کے خلا کو دیکھ لیتا تھا۔ ایک بھی تارا نظر نہیں آ رہا تھا۔ آسمان پر بادل ہی بادل تھے۔ کسی بھی وقت بارش شروع ہو سکتی تھی۔ رات کے گیارہ اور پھر ساڑھے گیارہ کا وقت ہو گیا۔ میری منزل قریب آ رہی تھی۔ پیاسی روح پر میں نے ساری امیدیں لگا رکھی تھیں کیونکہ اس نے مجھے پاتالی کے آسیب سے نجات حاصل کرنے کا کوئی طریقہ بتانا تھا۔ کم از کم پادری صاحب نے مجھے یہی یقین دلایا تھا۔ یہ بھی سوچتا کہ اگر روح نمودار نہ ہوئی تو پھر کیا کروں گا۔

اسی امید و بیم کے عالم میں رات کے بارہ بج گئے۔ آدھی رات گزر گئی تھی۔ اب کسی بھی وقت نیک دل روح ظاہر ہو سکتی تھی۔ میں کنوئیں کے پیچھے درختوں کے اندھیرے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ کسی وقت لگتا کہ اندھیرے میں سفید روشنی سی ہونے لگی ہے' آنکھیں جھپکا کر دیکھتا تو پھر اندھیرا چھا جاتا۔ آخر خدا نے میری سن لی اور اندھیرے میں روشنی کا دھندلا غبار سا ظاہر ہونے لگا۔ روشنی کا غبار آہستہ آہستہ سمٹنا شروع ہو گیا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ پیاسی روح نمودار ہو رہی تھی۔ روشنی کے غبار نے سمٹتے سمٹتے انسانی ہیولے کی شکل اختیار کر لی۔ اب ایسے معلوم ہو رہا تھا کہ کنوئیں کے پاس ایک سفید رنگ کا انسانی سایہ کھڑا ہے۔ عجیب بات یہ ہوئی تھی کہ روح کے نمودار ہونے کے بعد میرے دل سے سارا ڈر خوف دور ہو گیا تھا اور مجھے ایک گہرے سکون کا احساس ہو رہا تھا۔ میری نظریں روح پر جمی ہوئی تھیں۔ اتنے میں ایک گونجدار انسانی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی:

"مجھے پیاس لگی ہے' مجھے پانی پلاؤ۔"

پہلے تو میں بت سا بنا روح کی طرف مسلسل تکتا رہا۔ روح نے جب دوسری بار کہا:

"مجھے پیاس لگی ہے' مجھے پانی پلاؤ۔"

تو میں جلدی سے بارہ دری سے اتر کر کنوئیں کے پاس آ گیا۔ وہاں مجھے ایک خوشبو آئی جسے میں دنیا کی کسی زبان کے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ میں نے رسی پکڑ کر ٹین کا ڈول کنوئیں میں ڈال دیا اور اس میں سے پانی کا بھرا ہوا ڈول نکال کر اسے کنوئیں کی منڈیر پر رکھ لیا۔ روح کی طرف دیکھنے کی مجھے جرأت نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے نظریں جھکائی ہوئی تھیں۔ میں نے بڑی حلیمی سے کہا:

"پانی پی لیجئے۔"

روح پر ایک لمحے کے لئے خاموشی طاری رہی۔ میں نظریں اوپر نہیں اٹھا رہا تھا۔ روح کی آواز سنائی دی:

"پیچھے ہٹ جاؤ۔"

میں جلدی سے چار قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اب میں نے نظریں اٹھا کر روح کو دیکھا۔ ایک لمحے کے لئے سفید انسانی ہیولے میں سے چہرے کے دھندلے نقوش ابھرے اور دوسرے لمحے غائب ہو گئے۔ روح کا سفید ہیولا ذرا آگے بڑھا اور پھر وہ ہیولا پانی کے ڈول پر جھک گیا۔ سفید انسانی ہیولا دس پندرہ سیکنڈ تک اسی طرح پانی کے ڈول پر جھکا رہا۔ پھر سیدھا ہو گیا۔ میں دونوں ہاتھ سینے پر باندھے بڑے ادب سے کھڑا روح کو دیکھ رہا تھا۔ ساری فضا میں خوشبو ہی خوشبو تھی۔ روح کی آواز بلند ہوئی:

"تم نے میری صدیوں کی پیاس بجھائی ہے۔ تمہیں اس کا ثواب ضرور ملے گا۔ ہر انسان جو اس دنیا میں آتا ہے اپنے اچھے برے اعمال کا جواب دہ ہوتا ہے۔ کچھ جزا اور سزا اسے اس دنیا میں مل جاتی ہے' کچھ جزا اور سزا اسے آگے چل کر بھگتنی پڑتی ہے۔ مجھے بھی اپنی زندگی میں کئے ہوئے ایک برے عمل کی سزا مل رہی ہے۔ میری روح صدیوں کی پیاسی ہے، پھر کوئی اللہ کا بندہ آتا ہے اور میری پیاس بجھا دیتا ہے اور میں اس کے کام آتا ہوں اور پھر صدیوں تک پیاسا رہتا ہوں۔"

روح کی آواز میں بڑی طمانیت اور سکون تھا۔ یہ طمانیت اور سکون مجھے بھی اپنی روح میں تحلیل ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ روح کا بولا ہوا ایک ایک لفظ میرے دل میں اترتا جا رہا تھا۔ روح خاموش ہو گئی۔ جنگل کے تاریک سناٹے میں روح کی آواز کی بازگشت اب بھی گونج رہی تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ روح اسی طرح باتیں کرتی رہے' اور مجھے اچھائی اور برائی کے رموز سے آشنا کرتی رہے۔ روح کہنے لگی:

"تمہارے کام آنا اب مجھ پر فرض ہو گیا ہے۔ تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں تمہارے کیا کام آ سکتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارا کام کیا ہے اور تم اپنے ایک برے عمل کی وجہ سے کس اذیت ناک عذاب میں پھنسے ہوئے ہو۔ تمہاری اذیت کے ختم ہونے کا وقت آن پہنچا ہے' لیکن اس دلدل سے نکلنے کے واسطے تمہارا خود بھی ہمت سے

م لینا شرط ہے۔ خدا تمہاری مدد کر رہا ہے لیکن تمہیں مکمل کامیابی صرف اسی صورت
ں مل سکے گی' جب تم خود بھی اپنی مدد کرو گے۔ کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟"

میں نے بڑے عجز و نیاز سے کہا:

"میں تیار ہوں۔"

"تو پھر غور سے سنو!" یہ کہہ کر روح نے ایک لمحے کے لئے توقف کیا اور پھر کہا:

"سب سے پہلے اپنی مدد آپ' تم اس شکل میں کرو گے کہ صدقِ دل سے توبہ کرو گے
، آئندہ تم کبھی اللہ کے سوا کسی سے مدد نہیں مانگو گے۔ کبھی شرک نہیں کرو گے اور
ی کو اللہ کا شریک نہیں ٹھہراؤ گے۔ حالانکہ تم اپنے اسی گناہ کی سزا بھگت رہے ہو۔"

میرا ہاتھ خود بخود اپنے دل پر چلا گیا۔ اس وقت میری آنکھوں میں اپنے آپ آنسو آ
۔ میں نے کہا:

"میں اللہ پاک کو گواہ بنا کر عہد کرتا ہوں' اللہ کے سوا کسی سے مدد نہیں مانگوں گا۔
ی شرک نہیں کروں گا۔"

"اگر تم سچے دل سے توبہ کر رہے ہو تو یقین کرو کہ خدا نے تمہاری توبہ قبول کر لی
۔ لیکن تمہیں ثابت کرنا پڑے گا کہ تم اپنی توبہ پر ثابت قدم ہو۔ یہ تمہاری آزمائش
ی' کیا تم اس آزمائش کے لئے تیار ہو؟"

میں چونکہ سچے دل سے آئندہ گناہ نہ کرنے کا عہد کر چکا تھا، اس لئے میں نے
دھڑک کہہ دیا کہ میں ہر آزمائش کے لئے تیار ہوں لیکن ساتھ ہی میں نے ڈرتے
تے پوچھا:

"اے نیک روح! یہ آزمائش اتنی سخت اور کڑی تو نہیں ہے کہ میرے اندر اس پر
ا اترنے کی ہمت ہی نہ ہو۔"

اس پر نیک روح نے کہا:

"خدا کا وعدہ ہے کہ وہ کبھی اپنے بندوں کو ایسی کڑی آزمائش میں نہیں ڈالتا کہ جس

پر پورا اترنے کی ان میں استطاعت نہ ہو۔ کیا اب تم مطمئن ہو؟"

میں نے کہا: "میں بالکل مطمئن ہوں۔ حکم کیجئے کہ مجھے کیا کرنا ہو گا؟"

روح گویا ہوئی: "یہاں سے تم گوالیار جاؤ گے۔ گوالیار شہر کے جنوب میں رانی کی شمشان گھاٹ ہے جہاں ہندو مذہب کے ماننے والے اپنے مُردوں کو جلاتے ہیں۔ رانی کی شمشان گھاٹ کے پاس ایک ٹیلہ ہے' اس ٹیلے کے اوپر برج والا کھنڈر ہے۔ اس برج والے کھنڈر کے بارے میں مشہور ہے کہ جو کوئی ایک بار اس کھنڈر میں گیا واپس نہیں آیا۔ لوگ اس برج کو دور سے دیکھتے ہوئے بھی خوف سے تھر تھر کانپتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کھنڈر میں وہی منحوس چڑیل پاتالی صدیوں سے اپنی ساتھی چڑیلوں اور بدروحوں کے ساتھ رہ رہی ہے جس نے تمہیں اپنے آسیب میں جکڑا ہوا ہے۔ تمہیں اس برج والے کھنڈر میں ایک رات گزارنی ہو گی۔ تم اپنے اِرد گرد ایک دائرہ کھینچ کر اس کے اندر کلمہ شریف پڑھ کر بیٹھ جاؤ گے۔ اس کے بعد بڑے طوفان آئیں گے' بڑے بھونچال آئیں گے' لیکن تمہیں اس یقین کے ساتھ وہاں بیٹھے رہنا ہو گا کہ خدا کی نیک طاقتیں تمہارے ساتھ ہیں اور کوئی بدروح' کسی چڑیل کا طلسم تمہارے دائرے کی حدود کے اندر داخل نہیں ہو سکے گا۔ اگر تم نے پوری ثابت قدمی سے رات گزار دی اور جگہ سے بالکل نہ ہلے تو صبح تمہاری ساری بیماریاں' تمہارے سارے آسیب اور تم پر کئے گئے سارے کالے جادو اس طرح ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تم سے ڈر کر بھاگ چکے ہوں گے جس طرح سورج کے نکلنے کے بعد رات کا اندھیرا غائب ہو جاتا ہے۔ میں تمہیں کوئی وظیفہ نہیں بتاؤں گا۔ میں تمہیں کوئی نقش سلیمانی نہیں دوں گا۔ تمہیں صرف ایمان کی طاقت کے ساتھ اپنی جگہ پر ثابت قدم ہو کر بیٹھے رہنا ہو گا۔ بس یہی تمہارا سب سے بڑا وظیفہ ہو گا۔ یہی تمہارا نقش سلیمانی ہو گا اور یہی تمہاری سب سے بڑی طاقت ہو گی۔ اللہ تمہارا حامی و مددگار ہو۔ آمین! ثم آمین!"

اور میرے دیکھتے دیکھتے روح کی سفید روشنی سمٹنے لگی اور پھر آہستہ آہستہ غائب ہو

ئی۔ یہ نیک روح مجھے میری نجات کا راستہ دکھا کر واپس جا چکی تھی۔ اس کے چلے جانے ے بعد جنگل کی تاریکی کا جو خوف میرے دل پر تھا وہ ختم ہو گیا تھا۔ میں اپنے آپ میں نتہا درجے کا سکون اور اطمینان محسوس کر رہا تھا۔ میرے دل کو پختہ یقین ہو چکا تھا کہ میں للہ کے حکم سے اپنی طاقتِ ایمانی کے ساتھ آنے والی کٹھن آزمائش میں ضرور کامیاب وں گا۔ باقی کی رات میں نے بارہ دری میں بسر کی اور صبح کی روشنی ہوتے ہی واپس ہل پڑا۔ اجنتا کے قصبے سے میں نے ایک یکہ لے لیا اور اورنگ آباد پہنچ کر شہنشاہ اورنگ زیب" کے مزار کے قریب جو مسجد تھی وہاں وضو کر کے دو شکرانے کے نفل ادا کئے۔ اللہ ے دعا کا طالب ہوا کہ وہ مجھے اس امتحان میں کامیابی کی طاقت و استطاعت عطا فرمائے۔ زار پر فاتحہ پڑھا اور اورنگ آباد شہر میں آ کر ناشتہ کیا اور ٹرین میں بیٹھ کر حیدر آباد (دکن) واپس روانہ ہو گیا۔

حیدر آباد اپنے ہوٹل میں آ کر میں نے کامنی نرتکی کی دی ہوئی چاندی کی انگوٹھی کو دیکھا اور مجھے اس باوفا اور اپنے اصولوں کی پختہ عورت کامنی نرتکی کا خیال آ گیا۔ یہ عورت اگرچہ سر سے پاؤں تک ہندو تھی مگر وہ ایک خدا کی ماننے والی تھی اور ایک خدا پر یقین رکھتی تھی۔ میرے دل میں اسے بلانے کا خیال آیا تا کہ میں اسے ان تمام حالات سے آگاہ کروں۔ صرف اس کی دی ہوئی انگوٹھی کو اپنے جسم کے ساتھ تین بار رگڑنا ہی تھا اور وہ ظاہر ہو جاتی۔ اب جبکہ میرا دل بدل چکا تھا' میرے حالات بہتر سے بہتر ہو رہے تھے اور میرے دل میں ایمان کی شمع دوبارہ روشن ہو چکی تھی' مجھے یقین تھا کہ وہ ضرور ظاہر ہو جائے گی۔ لیکن میرا دل نہ مانا اور میں نے انگوٹھی کو اپنے جسم کے ساتھ رگڑنے کا خیال دل سے نکال دیا۔ شام کے وقت ایک گاڑی دلی کی طرف جاتی تھی۔ میں نے وہی گاڑی پکڑی اور دلی روانہ ہو گیا۔ دلی میں فضا کشیدہ تھی۔ اگرچہ فسادات کی آگ پوری طرح سے ابھی نہیں بھڑکی تھی۔ دلی سے مجھے گوالیار جانا تھا۔ میرے لئے بمبئی میل بہتر ٹرین تھی۔ ایک تو وہ ایکسپریس تھی' دوسرے گوالیار کی طرف سے ہو کر جاتی تھی۔

گوالیار ایک ہندو ریاست تھی اور وہاں اس زمانے میں بھی بڑے مندر تھے۔ دن کے وقت دلی سے روانہ ہوا تھا' رات کو گوالیار پہنچا۔ ایک جدید طرز کے ہوٹل میں کمرہ لے لیا۔ کھانا کھا کر سو گیا۔ ابھی تک میرے ساتھ پاتالی چڑیل کی طرف سے کوئی ڈراؤنا واقعہ نہیں ہوا تھا۔ اس کا امکان ضرور تھا لیکن میرے اندر پاتالی چڑیل کے بڑے سے بڑے حربے کا مقابلہ کرنے کی روحانی طاقت پیدا ہو چکی تھی۔ میں نے عزم کر رکھا تھا کہ اگر پاتالی نے مجھ پر حملہ کیا تو میں ڈٹ کر مردانہ وار اس کا مقابلہ کروں گا اور اپنے اوپر اس کی بدی کی طاقتوں کو ہرگز غالب نہ آنے دوں گا۔ دوسرے دن میں ہوٹل کے ڈائننگ روم میں بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا کہ میں نے بیرے سے رانی کے شمشان گھاٹ کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہ شمشان بھومی شہر کے پچھم میں ندی کے دوسرے کنارے پر ہے۔ جب میں نے اس سے برج والے کھنڈر کے بارے میں پوچھا تو اس نے ایک ہاتھ اپنے کان کو لگا کر کہا:

"صاحب! کبھی بھول کر بھی ادھر مت جانا۔ وہاں بیم دوت کی چڑیلیں رہتی ہیں۔ کوئی قریب سے بھی گزرے تو اسے اٹھا کر لے جاتی ہیں اور پھر اس آدمی کا نشان بھی نہیں ملتا۔ صاحب! اُدھر مت جانا۔"

میں نے تصدیق کرنے کی غرض سے پوچھا:

"یہ برج والا کھنڈر ٹیلے کے اوپر ہے نا؟"

اس نے کہا: "ہاں صاحب وہیں ہے۔ بھگوان کے لئے میرے آگے اس کا نام نہ لیں صاحب۔"

اور وہ برتن ٹرے میں رکھ کر تیز قدم اٹھاتا دوسری طرف چلا گیا۔ میں نے ایک اور بیرے سے پوچھا' اس نے بھی شمشان گھاٹ کے برج والے کھنڈر کا سن کر یہی کہا کہ وہاں چڑیلوں نے ڈیرہ ڈال رکھا ہے اور بھولے بھٹکے مسافر کو اٹھا کر لے جاتی ہیں اور پھر اسے ہڑپ کر جاتی ہیں۔ مجھے اس منحوس ڈراؤنے کھنڈر میں پوری ایک رات گزارنی تھی۔ اس

میں کوئی شک نہیں کہ میرا جذبۂ ایمانی پہلے سے زیادہ بیدار ہو چکا تھا لیکن بندہ بشر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اندر سے میں بھی ڈرا ہُوا تھا۔ ایک تو اس آسیبی جگہ پر چڑیلوں کا بسیرا تھا، دوسرے یہ تمام چڑیلیں پاتالی چڑیل کے ماتحت تھیں اور پاتالی چڑیل میری دشمن نمبر ایک تھی اور اب تو وہ میری جان کی دشمن ہو گئی ہوگی اور جیسے ہی میں نے اس کے کھنڈر میں قدم رکھا وہ میرے ٹکڑے کر ڈالے گی۔ مگر مجھے جان پر کھیل کر اس امتحان میں سے' اس کڑی آزمائش میں سے ہر حالت میں گزرنا تھا تاکہ مجھے ہمیشہ کے لئے ان جہنمی بدروحوں کے آسیب سے چھٹکارا نصیب ہو جائے۔"

دن کے وقت میں گوالیار شہر کے اس شمشان گھاٹ پر جا کر برج والے کھنڈر کو دور سے دیکھ آیا۔ شمشان گھاٹ پر ایک منحوس اور مردہ سناٹا اور ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ جس چبوترے پر مُردوں کو جلایا جاتا تھا' وہاں راکھ ہی راکھ اُڑ رہی تھی۔ ایک کالی بلی مُردوں کی ہڈیاں تلاش کرنے کی کوشش میں اس راکھ کو کرید رہی تھی۔ شمشان گھاٹ کے عقب میں چھوٹے سے ٹیلے پر ایک کھنڈر نظر آتا تھا' جس کی دیوار کے ساتھ ایک برج اوپر کو اٹھا ہُوا تھا۔ اس کھنڈر کے اوپر مُردار خور گدھ منڈلا رہے تھے۔ جیسے وہاں کسی مُردہ لاش پر جھپٹنے کی تیاریاں کر رہے ہوں۔ خوف کی ایک لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ مجھے خیال آنے لگا کہ کہیں کل میری بھی مُردہ لاش کھنڈر کی چھت پر تو نہیں پڑی ہوگی۔۔۔ میں نے ایک جھٹکے سے اس خیال کو اپنے ذہن سے نکال دیا، کیونکہ مجھے تو ہر حالت میں اس آسیب زدہ چڑیلوں کے کھنڈر میں یہ رات بسر کرنی ہی تھی۔

شمشان گھاٹ گوالیار کے ایک قریبی ہی جنگل میں واقع تھا۔ اس جنگل میں داخل ہونے سے پہلے آبادی ختم ہو جاتی تھی' خاردار جھاڑیوں اور گنجان درختوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ یہاں صرف ایک پگڈنڈی سی بنی ہوئی تھی' جس پر سے مردہ لاشوں کو جلانے کے واسطے شمشان گھاٹ لے جایا جاتا ہوگا۔ اس پگڈنڈی پر موت کی خاموشی چھائی ہوئی تھی اور ہر قدم پر محسوس ہوتا تھا کہ ابھی کسی درخت کے پیچھے سے کوئی بدروح نکل کر

چمٹ جائے گی۔ دن کے وقت اس پگڈنڈی پر سے گزرتے ہوئے میرا خوف کے مارے بُرا حال ہو رہا تھا۔ خدا جانے رات کے اندھیرے میں میرے ساتھ کیا گزرنے والی تھی۔ مَیں ہوٹل میں واپس آگیا۔ لیکن مَیں نے رات ہونے کا انتظار نہ کیا اور سورج غروب ہوتے ہی ہوٹل سے جنگل کی طرف چل پڑا۔ دراصل میں رات کی تاریکی میں شمشان گھاٹ کو جاتی پگڈنڈی پر سے گزرتے ہوئے گھبراتا تھا۔ برسات کا موسم ہونے کی وجہ سے پہلے روز ہی سے گوالیار کے آسمان کو بادلوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ میرے گوالیار پہنچنے سے ایک روز پہلے وہاں بڑی موسلا دھار بارش ہو چکی تھی' جس کی وجہ سے گوالیار شہر کی سڑکیں اور درخت گیلے تھے اور جنگل کے نشیبی علاقے پانی سے بھر گئے تھے۔ فضا میں حبس تھا۔ ہوا بند تھی' بادل جھکے ہوئے تھے۔ جنگل میں سے گزرتے ہوئے درختوں پر بسیرا لینے والے پرندے شور مچا رہے تھے۔ جب میں شمشان گھاٹ میں پہنچا تو آہستہ آہستہ ان پرندوں کی آوازیں ڈوب گئیں اور چاروں طرف سنسنی خیز سناٹا چھا گیا۔

میں ٹیلے کی چڑھائی چڑھنے لگا۔ اتنی گھنی جھاڑیاں تھیں کہ اوپر چڑھنا مشکل ہو رہا تھا۔ اوپر جانے والا کوئی راستہ تو تھا نہیں' جھاڑیوں کو اِدھر اُدھر ہٹا کر چڑھنا پڑ رہا تھا۔ برج والے کھنڈر تک پہنچتے پہنچتے شام کا اندھیرا گہرا ہو گیا۔ مَیں کھنڈر کے سامنے ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا' کھنڈر شکل ہی سے بھوتوں اور چڑیلوں کا مسکن لگ رہا تھا۔ شکستہ دَر و دیوار سے نحوست برس رہی تھی۔ برج اندھیرے میں ایسے لگ رہا تھا' جیسے سیاہ دھوئیں کا ستون اوپر اٹھتے ہوئے اچانک ساکت ہو گیا ہو۔ ایک گدھ اپنے بڑے بڑے پَر پھڑپھڑاتا ہوا میرے سر کے اوپر سے اُڑتا ہُوا برج پر جا کر بیٹھ گیا۔ میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ لیکن مجھے خوف اور دہشت کے ان تمام محسوسات کا مقابلہ کرنا تھا اور کھنڈر میں رات گزارنی تھی۔ یہ میری زندگی اور موت کا سوال تھا۔ مَیں نے اللہ کا نام لیا اور کلمہ پاک کا ورد کرتے ہوئے کھنڈر میں داخل ہو گیا۔ کھنڈر میں ٹوٹی پھوٹی اینٹیں اور پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ چھت ایک طرف سے ٹوٹ گئی تھی اور وہاں شگاف پڑا ہُوا تھا۔ میں

نے ایک جگہ تھوڑی سی زمین صاف کی' پتھر اور اینٹیں ایک طرف ہٹا دیں اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ کھنڈر کا دروازہ مجھ سے چار پانچ قدموں کے فاصلے پر ہی تھا۔ دروازہ کوئی نہیں تھا۔ اس کی جگہ ایک جھکی ہوئی چوکھٹ ہی باقی رہ گئی تھی' جس میں سے پتھر اور نوکیلی سلیں باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ اسے آپ دروازے نہیں ایک محراب دار بڑا سا شگاف کہہ سکتے ہیں۔ اس شگاف میں سے جنگل کے درختوں کے خاکے دکھائی دے رہے تھے جو رات کا اندھیرا چھا جانے کے بعد سائے سے نظر آنے لگے تھے۔ جیسے جیسے رات چھا رہی تھی' خاموشی زیادہ ویران' زیادہ سنسان اور زیادہ ڈراؤنی ہوتی جا رہی تھی۔

بیٹھنے سے پہلے میں نے راہ نما روح کی ہدایت کے مطابق اپنے اِردگرد ایک دائرہ کھینچ لیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر کوئی بلا مجھ پر حملہ آور ہوئی تو وہ اس دائرے کے اندر نہیں آ سکے گی۔ اس دائرے کے حصار سے باہر باہر ہی رہے گی۔ رات آہستہ آہستہ گزرنے لگی۔ جنگل کی خاموشی گہری اور ڈراؤنی ہوتی چلی گئی۔ گھڑی مَیں نے اپنی کلائی پر باندھ لی تھی' جو رات کے یا شام کے سات ہی بجا رہی تھی۔ ابھی پوری رات سر پر پڑی تھی۔ یا اللہ! مجھے اپنی پناہ میں رکھنا۔ تیری مدد کے بغیر مَیں اس آزمائش میں کیسے کامیاب ہو سکتا ہوں۔ دل میں یہی دعا بار بار مانگ رہا تھا اور خاموش بیٹھا کبھی تاریک محرابی شگاف میں سے اندھیرے میں تحلیل ہوتے درختوں کو اور کبھی کھنڈر کی چھت کے شگاف کو تکنے لگتا۔ اچانک چیخوں کی آوازیں بلند ہوئیں۔ مَیں کانپ گیا۔ یہ چمگادڑیں تھیں' جن کا ایک گروہ چیخیں مارتا کھنڈر کے بُرج میں سے نکل کر رات کی تاریکی میں جنگل کی جانب اڑ گیا تھا۔ اس کے بعد پھر وہی مہیب سکوت طاری ہو گیا۔ جب رات کے گیارہ بج گئے تو کھنڈر کے اندر سے یا باہر جنگل میں سے سیٹی کی باریک سی آواز تھوڑی دیر کے بعد آنے لگی۔ مَیں اس آواز کو پہچانتا تھا' یہ سانپ کی آواز تھی۔ پہلے ایک آواز آتی تھی' پھر تین چار سانپوں کی سیٹیوں کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ مَیں چوکنا ہو کر بیٹھا تھا۔ کچھ دیر کے بعد یہ آوازیں آہستہ آہستہ غائب ہو گئیں۔ اس کے بعد اُلو کی آواز آنے لگی۔ اس منحوس

آواز کو بھی مَیں پہچانتا تھا۔ یہ آواز دن کے وقت سنائی دے جائے تو آدمی کی روح کانپ جاتی ہے اور یہاں ڈراؤنے جنگل کی اندھیری رات میں مسلسل سنائی دینے لگی تھی۔ میں سمٹ کر دائرے کے اندر دیوار کے بالکل ساتھ لگ کر بیٹھا ہُوا تھا۔ کچھ دیر بولنے کے بعد اُلو خاموش ہو گیا۔ ایک بار پھر بھیانک سناٹے نے جنگل کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ اِس طرح رات کے بارہ بج گئے۔ جیسے ہی آدھی رات گزری اچانک سانپوں کی سیٹیوں کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے جنگل کے سارے سانپ بیدار ہو گئے ہیں۔ اس کے تھوڑی دیر بعد اُلو بھی مسلسل بولنے لگا۔ جنگل کی طرف سے خون خوار چمگادڑوں کے گروہ کے گروہ آئے اور چیخیں مارتے کھنڈر کے اوپر چکر لگانے لگے۔ مارے دہشت کے میرا جسم ٹھنڈا پڑ گیا۔ حلق بار بار خشک ہونے لگا مگر مَیں ہمت کر کے اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ ایک دو بار مَیں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں مگر اس سے کوئی فرق نہ پڑا۔ اُلو، سانپوں اور چمگادڑوں کی چیخیں اسی طرح میرے کانوں میں گونج رہی تھیں اور میرے جسم میں اترتی محسوس ہو رہی تھیں، لگتا تھا یہ آسیبی چیخیں میرے جسم کے پرزے اڑا دیں گی۔ مَیں اونچی آواز میں کلمہ پڑھنے لگا۔

اس کا یہ اثر ہُوا کہ آہستہ آہستہ چیخوں اور سانپوں کی آوازوں کا شور دھیما پڑنا شروع ہو گیا۔ ایک بار پھر جنگل پر سناٹا چھا گیا۔ کھنڈر کے اندر اور کھنڈر کے باہر تاریکی اتنی گہری ہو گئی تھی کہ کچھ نظر نہ آتا تھا۔ مَیں دل ہی دل میں کلمہ پڑھ رہا تھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے کھنڈر کے محرابی شگاف میں سے باہر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اگر کوئی بلا اندر داخل ہو تو کم از کم مجھے نظر تو آ جائے۔ اس سناٹے میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ مَیں اندھیرے میں اِدھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا مگر مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ چاپ آہستہ آہستہ میرے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ پھر ایسی آواز آئی جیسے کوئی آدمی کھڑے کھڑے دھڑام سے زمین پر گر پڑا ہو۔ ساتھ ہی کسی عورت کی چیخ بلند ہوئی اور پھر یہ چیخ بتدریج ایک لمبی کراہ میں بدلتی ہوئی تاریکی کے سمندر میں ڈوب گئی۔ مَیں نے اپنے ہوش

ں کو پوری طرح اپنے قابو میں کر رکھا تھا اور ہر قسم کے خوف اور دہشت کا پوری ے مقابلہ کر رہا تھا۔

چانک میرے بالکل قریب ہی کوئی چیز چھت سے گری۔ یہ ایک انسانی کھوپڑی تھی۔ بات یہ تھی کہ میرے چاروں طرف اندھیرا چھایا ہُوا تھا مگر اس انسانی کھوپڑی پر کسی ے سے روشنی پڑ رہی تھی اور وہ مجھے صاف نظر آ رہی تھی۔ کھوپڑی زمین سے ایک بلند ہو گئی۔ مَیں نے جو دائرہ اپنے گرد کھینچ رکھا تھا، کھوپڑی نے اس کے کنارے ے نصف قوس کی شکل میں ایک چکر لگایا اور پھر دائرے کی لائن سے ایک فٹ پیچھے کر فضا میں معلق ہو گئی۔ اس کا منہ میری طرف تھا۔ اس کی آنکھوں کی جگہ دو سیاہ ے تھے۔ ان میں بجلیاں سی چمک رہی تھیں۔ کھوپڑی کے ناک اور منہ کے شگافوں میں دُھواں نکلنا شروع ہو گیا۔ پھر ایک عورت کے رونے اور بین کرنے کی ڈراؤنی ازیں آنے لگیں۔ مَیں اپنے آپ کو کنٹرول کر کے اپنی جگہ پر جم کر بیٹھا کھوپڑی کو تکتا ۔ میں جانتا تھا کہ یہ بدی کی طاقتیں ہیں جو مجھے نیکی کے راستے پر جاتے ہوئے دیکھ کر پر حملہ آور ہو رہی ہیں۔

کھوپڑی زمین سے اچھل کر چھت کے ساتھ جا کر لگ جاتی اور پھر نیچے آ جاتی۔ وہ بار اس دائرے کے حصار کو پار کر کے مجھ تک آنے کی کوشش کرتی، لیکن جیسے ہی وہ رے کی لکیر پر آتی، اسے ایک جھٹکا لگتا اور وہ اچھل کر پیچھے کو ہو جاتی۔ کچھ دیر بعد ھوپڑی کے منہ سے ڈراؤنی آوازیں نکلنے لگیں۔ یہ آوازیں آہستہ آہستہ چیخوں کی شکل تیار کر گئیں۔ کھنڈر کی کوٹھڑی کی فضا کھوپڑی کی آسیبی چیخوں سے گونجنے لگیں۔ مَیں نے انوں ہاتھوں سے اپنے کان بند کر لئے مگر یہ آوازیں پھر بھی سنائی دے رہی تھیں۔ آخر کھوپڑی اپنی چیخوں سمیت زمین پر بار بار اپنا سر پٹختی، کھنڈر کے شگاف سے نکل کر جنگل کے اندھیرے میں غائب ہو گئی۔ اس کے بعد پھر وہی سناٹا چھا گیا۔

دس پندرہ سیکنڈ ہی گزرے ہوں گے کہ اس سناٹے میں ایک پھنکار گونج اٹھی۔ یہ

پھنکار اتنی ہیبت ناک تھی کہ میں اپنی جگہ پر ہل گیا۔ دوسری پھنکار کے ساتھ چھت سے ایک بہت بڑا سانپ فرش پر گر پڑا۔ یہ سانپ ایسا تھا کہ جس کے دو منہ تھے۔ دیکھتے دیکھتے سانپ نے دونوں پھن پھیلا دیئے۔ اس کے دونوں منہ ایک ایک دو شاخہ سرخ زبان نکال کر میری طرف بڑھ رہے تھے۔ اس کے دونوں پھن بار بار پھنکاریں مار رہے تھے۔ وہ بار بار میری طرف لپکتے مگر دائرے کی لکیر کے پاس آ کر تڑپ کر پیچھے ہٹ جاتے۔ صرف سانپ روشنی میں تھا۔ اس کے سوا کوٹھڑی میں ہر طرف سیاہ کالا اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ سانپ بہت بڑی جلیبی کی طرح پھنکارتا ہوا فرش پر چاروں طرف چکر لگا رہا تھا۔ وہ مجھے ڈسنے کو بے تاب ہو رہا تھا مگر جو دائرہ میں نے اپنے گرد کھینچ رکھا تھا' وہ اس کے اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ پیچ و تاب کھاتا ہوا آخر تھک ہار کر دروازے کے شگاف میں سے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

اگرچہ میرے دائرے نے مجھے بچایا ہوا تھا' اس کے باوجود خوف کے مارے میرا خون خشک ہو رہا تھا۔ اچانک عورتوں کے رونے اور ہچکیاں لینے کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ آوازیں دروازے کے شگاف کی طرف سے آ رہی تھیں۔ میں نے شگاف کی طرف دیکھا۔ شگاف میں چار سیاہ پوش نمودار ہوئے' جنہوں نے ایک جنازہ اٹھا رکھا تھا۔ جنازے کے پیچھے چار سیاہ پوش عورتیں سر جھکائے ہاتھوں میں موم بتیاں تھامے روتی' بین کرتی چلی آ رہی تھیں۔ سیاہ پوشوں نے جنازہ میرے دائرے کی لکیر سے دو فٹ پیچھے رکھ دیا اور خود ایک طرف ہو کر سروں کو جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ چاروں سیاہ پوش عورتیں جنازے کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ وہ بدن پر لرزہ طاری کر دینے والی آوازوں میں دیر تک بین کرتی رہیں۔ پھر ان میں سے ایک عورت نے مردے کے اوپر ڈالی ہوئی چادر ہٹا کر پرے پھینک دی۔ مُردہ کفن میں لپٹا ہوا تھا۔ چاروں موم بتیاں جنازے کے چاروں کونوں میں جل رہی تھیں۔ ان کی روشنی صرف مردے اور چاروں سیاہ پوش عورتوں پر ہی پڑ رہی تھی۔ انہوں نے مردے کا کفن ہٹا دیا۔ میں اپنے دائرے کے حصار کے اندر بیٹھا انہیں دیکھ ر

ھے مردے کا پیلا بے جان جسم روشنی میں صاف نظر آ رہا تھا۔ تابوت کے پہلو میں یک سیاہ پوش عورت نے میرے دیکھتے دیکھتے مُردے کے پیٹ میں ہاتھ ڈالا اور جب اہر نکالا تو اس کے ہاتھ میں مردے کا جمے ہوئے خون میں لتھڑا ہوا دل تھا۔ وہ مُردے کھانے لگی۔

اس کے ساتھ ہی دوسری سیاہ پوش عورتوں نے بھی مُردے کا گوشت نوچ نوچ کر کھانا ع کر دیا۔ ان کے منہ سے عجیب دہشت خیز آوازیں نکل رہی تھیں۔ وہ مجھے دکھا دکھا مُردے کا گوشت کھا رہی تھیں۔ مجھ سے یہ مکروہ منظر دیکھا نہ گیا۔ میں نے آنکھیں بند لیں۔ میرے کانوں میں ان چڑیلوں کے مُردہ کھانے کی مکروہ آوازیں برابر آ رہی تھیں۔ نک مجھے ایک چیخ سنائی دی۔ یہ چیخ کسی مرد کی تھی۔ میں نے جلدی سے آنکھیں کھول ۔ یہ دیکھ کر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں کہ تابوت میں سے مُردہ اٹھ کھڑا ہوا ۔ اس کا پیٹ کھلا ہوا تھا۔ انتڑیاں باہر لٹک رہی تھیں۔ جگہ جگہ سے جسم کی بوٹیاں چی ہوئی تھیں۔ اس نے میری طرف رحم طلب نظروں سے دیکھا اور دردانگیز ہچکیاں یتے ہوئے کہا:

"مجھے ان چڑیلوں سے بچاؤ۔ مجھے ان چڑیلوں سے بچاؤ۔"

اور وہ تابوت میں سے نکل کر دونوں بازو پھیلا کر میری طرف لپکا۔ میں ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔ لیکن پھٹے ہوئے پیٹ والے مُردے کو دائرے کی لکیر کے پاس آ کر ایک جھٹکا لگا اور وہ چیخ مار کر تابوت پر گر پڑا۔ چاروں سیاہ پوش چڑیلیں خون خوار درندوں ایسی آوازیں نکالتی مردے پر ٹوٹ پڑیں۔ مُردے کا جسم تابوت کے اندر اُوپر کو اُچھل رہا تھا۔ چڑیلیں اس کی بوٹیاں نوچ رہی تھیں۔ مُردہ ایک بار پورا زور لگا کر اچھلا اور اپنے کٹے پھٹے جسم اور لٹکتی ہوئی انتڑیوں کے ساتھ کھنڈر کے دروازے کی طرف بھاگا۔ چاروں سیاہ پوش چڑیلیں چیختی چلاتی اس کے پیچھے دوڑیں اور پھر یہ شیطانی ٹولہ بھی دروازے کے شگاف میں سے نکل کر جنگل کی تاریکی میں غائب ہو گیا۔ ان کے غائب ہوتے ہی میرے

سامنے پڑا مردے کا تابوت بھی غائب ہو گیا۔

میں نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر وقت دیکھا۔ رات کے دو بجنے والے تھے۔ ابھی کافی رات باقی تھی۔ مجھے سورج کے طلوع ہونے تک اسی آسیبی کھنڈر میں بیٹھے رہنا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ دیکھیں اب کونسا ڈراؤنا منظر ابھرتا ہے۔ فضا پر ایک بار پھر موت ایسی خاموشی چھا گئی تھی۔ اچانک ماحول میں گھنگھروؤں اور ڈھولک کی نغمہ ریز آوازیں گونجنے لگیں۔ میں حیران ہُوا کہ اس آسیبی ماحول میں یہ موسیقی کی جھنکاریں کہاں سے آنے لگی ہیں۔ آوازیں قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھیں۔ میں دروازے کے شگاف کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہاں مجھے تین عورتوں کے دھندلے دھندلے ہیولے نظر آئے جو رقص کرتی آ رہی تھیں۔ یہ ایک ایسا تماشہ تھا جس کی مجھے وہاں ہرگز توقع نہیں تھی۔ بعد میں مجھے احساس ہُوا کہ جہنمی بدروحیں مجھ پر غالب آنے کے لئے اور مجھے نیکی کے راستے سے ہٹانے کے لئے اپنے تمام حربے استعمال کر رہی تھیں۔ اب جو حربہ انہوں نے استعمال کیا تھا وہ سب سے زیادہ خطرناک تھا۔

تینوں رقص کرتی ہوئی عورتیں میرے سامنے آ کر گھنگھروؤں اور ڈھولک کی تھاپ پر ناچنے لگیں۔ آپ کو یقین نہیں آئے گا' لیکن میں آپ کو حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ یہ تینوں کی تینوں عورتیں سڈول جسم والی بڑی حسین تھیں اور تینوں کی تینوں سر سے پاؤں تک ننگی تھیں۔ مجھ پر اس ہیجان خیز منظر کا پہلا ردِعمل یہ ہُوا کہ مَیں نے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ عورتیں میرا نام لے کر مجھے بلانے لگیں۔ ان کی آواز میں جسمانی لذت کے بلاوے تھے۔ میں نے اپنی آنکھیں بند رکھیں۔ ان عورتوں کی آوازیں بڑی ترنم ریز تھی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے دور کہیں گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ کوئی محبت بھرے لہجے میں کہتی:

"میری جان! میری طرف دیکھو۔ کیا میں خوبصورت نہیں ہوں؟"

کوئی میرا نام بڑے جذباتی لہجے میں لے کر کہتی:

"میرے پاس آ جاؤ۔ میں تمہیں محبت کرنا سکھا دوں گی' تم مجھ سے دور کیوں بیٹھے ہوں۔

میں تم پر اپنے جوان جسم کی تمام لذتیں قربان کرنے آئی ہوں۔"

کوئی محبت کی ٹھنڈی آہیں بھرتی اور کہتی:

"زمین کے نیچے اور زمین کے اوپر اس سے بڑھ کر اور کوئی مسرت نہیں کہ تم میری آغوش میں آ جاؤ۔ آنکھیں کھول کر میرے جسم کے نازک نقوش کو دیکھو۔"

ان کی آواز میں ایسا طلسم تھا کہ میں نے بے اختیار ہو کر آنکھیں کھول دیں۔ مجھے آنکھیں کھولتے دیکھ کر تینوں عورتیں زیادہ جوش و خروش سے رقص کرنے لگیں۔ ان کے نازک اعضا کبھی نمایاں ہوتے اور کبھی میری نظروں سے چھپ جاتے۔ وہ میرے دائرے کی لکیر کے قریب آ کر مجھے اپنے ہیجان خیز رقص سے اپنی طرف بلاتیں۔ ایک لمحے کے لئے مجھ پر شیطان غالب آ گیا۔ میرے اندر ایک آندھی سی چلنے لگی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہُوا۔ مجھے کھڑا ہوتے دیکھ کر تینوں عورتوں کے رقص نے طوفانی شکل اختیار کر لی۔ ڈھولک کی لَے تیز ہو گئی۔ گھنگھرو زور زور سے چھنکنے لگے' وہ میری طرف ہاتھ بڑھا بڑھا کر کہتیں:

"ہم تمہاری ہیں۔ تم ہم سے دور کیوں ہو۔ ہمارا ہاتھ تھام کر ہمارے پاس آ جاؤ۔ ہم تمہیں کام دیوتا کی انتہائی لذتوں سے ہمکنار کرنے کو بے تاب ہیں۔"

میرے کان میں کام دیوتا کا نام پڑا تو میرے اندر جو جذبات کی آندھی چل رہی تھی وہ ایک دم سے رک گئی۔ میں اپنے ہوش و حواس میں واپس آ گیا۔ میں جلدی سے بیٹھ گیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ سب جہنم کی بدروحیں ہیں جو میرے اِردگرد کھنچے ہوئے دائرے کے اندر آنے سے ناکام ہو کر اب مجھے اس دائرے سے باہر لانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ یہ خیال میرے دل میں قدرت کی طرف سے آیا تھا' اس لئے کہ میں سچے دل سے گناہوں سے توبہ کر چکا تھا۔ میں بیٹھا تو رقص کرتی عورتوں میں ایک بے چینی' ایک ہلچل سی مچ گئی۔ ان کے گناہ آلود رقص میں حیوانیت آ گئی۔ وہ چڑیلوں کی طرح حلق سے ڈراؤنی آوازیں نکالنے لگیں۔ میں ایمان کی قوت کے ساتھ اپنی جگہ پر جم کر بیٹھ چکا تھا۔ اب یہ

شیطانی طاقتیں مجھے میری جگہ سے نہیں ہلا سکتی تھیں۔ تینوں عورتیں دیوانہ وار گردش کرنے لگیں' وہ زور زور سے زمین پر پیر مار رہی تھیں۔ ان کے گھنگھرو ٹوٹ کر بکھرے گئے۔ ان کے سیاہ بال ہوا میں اڑنے لگے اور پھر ان سیاہ بالوں نے سیاہ سانپوں کی شکلیں اختیار کرلیں اور ان عورتوں کے حلق سے سانپ کی پھنکاریں بلند ہونے لگیں۔ ان کے جسم سیاہ پڑنے شروع ہو گئے اور ان کے جسموں سے دھواں نکلنے لگا۔ ان کی چیخیں فلک شگاف ہو گئیں اور وہ چیختی چلاتی جنگل کی تاریکی میں غائب ہو گئیں۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

میرا خیال تھا کہ اب ان بدروحوں کا جہنمی کھیل ختم ہو گیا ہو گا۔ لیکن ابھی میری آزمائش کی کٹھن گھڑی آنے والی تھی۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ کھنڈر کی تاریک دیوار شق ہو گئی اور اس میں سے ایک غضب ناک شکل نمودار ہوئی۔ یہ ایک سیاہ فام شیطان تھا' جس کے گلے میں سانپ لٹک رہے تھے۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی خونخوار عفریت اپنے تاریک غار سے نکل آیا ہے۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ کمان تھی' جس پر تیز نوک والا تیر چڑھا ہُوا تھا۔ اس کے ترکش میں ایسے سینکڑوں خونی تیر تھے' جن کی چھریوں ایسی نوکیں چمک رہی تھیں۔ اس کی آواز میں بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گرج تھی' وہ آتے ہی اپنی لٹکتی ہوئی زبان اور شب تاریک سے بھی زیادہ سیاہ فام ڈراؤنے چہرے کے ساتھ مجھ پر جھک گیا۔ اس کے پاؤں دائرے کی لکیر سے باہر تھے لیکن اس کا جسم جھکے ہوئے درخت کی طرح مجھ پر خم کھا کر جھکا ہُوا تھا۔ اس کے حلق سے ایسی آواز نکل رہی تھی' جیسے آتش فشاں پہاڑ کی گہرائیوں میں دہکتا ہُوا لاوا کھول رہا ہو' سسکار رہا ہو۔ میں سمٹ گیا' سہم گیا' مگر میں ثابت قدمی سے اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ جہنمی عفریت ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے بازو پھیلا کر مجھے پکڑنے کی کوشش کی۔ وہ مجھے پکڑ کر دائرے کے حصار سے باہر کھینچنا چاہتا تھا۔ میں چٹان کی طرح جم کر بیٹھا رہا۔ جہنمی شیطان کا بازو ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گیا جیسے اسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔

اس نے کمان اٹھالی۔ کمان پر تیر چڑھا ہُوا تھا۔ اس نے چلہ کھینچ کر مجھ پر تیر چلا دیا۔ ر میرے دائرے کی لکیر کے اوپر آکر کسی نظر نہ آنے والی دیوار سے ٹکرا کر نیچے گر پڑا۔ نمی عفریت بار بار چلہ چڑھا کر مجھ پر تیر برسا رہا تھا اور تیر میرے حصار کی دیوار سے ٹکرا کرا کر نیچے گر رہے تھے۔ اس کے ترکش کے سارے تیر ختم ہو گئے۔ بجلی سی چمکی' یانک کڑک کے ساتھ بادل اس طرح گرجے جیسے آسمان پھٹ گیا ہو اور یہ جہنمی عفریت ہی قیامت خیز چیخیں بلند کرتا' جدھر سے آیا تھا' اس طرف غائب ہو گیا۔ اس کے دفع ونے کے بعد میں نے خدا کا شکر ادا کیا جس نے مجھے اتنی توفیق عطا کی تھی کہ میں اپنی جگہ پر ثابت قدمی سے بیٹھا رہا۔ پھر وہی آسیبی سناٹا چھا گیا۔ ابھی جنگل میں رات کا اندھیرا بدستور پھیلا ہُوا تھا۔ ابھی صبح کی روشنی نمودار نہیں ہوئی تھی۔ ابھی میری آزمائش کا وقت ختم نہیں ہُوا تھا۔ ابھی وہ بلا نمودار ہونے والی تھی جو میری ساری مصیبتوں' میری تمام تباہیوں اور میری زندگی کے تمام عذابوں کی اصل بنیاد تھی۔ یعنی پاتال کی چڑیل!

میں نے اسے پہلی نظر میں ہی پہچان لیا۔ اس سے ڈرنے کی بجائے میں اپنی جگہ پر چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھے میرے دائرے کے حصار کے اندر ہی تباہ کرنے کا کوئی خوفناک حربہ استعمال کرے گی۔ اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ دہشت ناک ہو گیا تھا۔ آنکھوں سے انگاروں کی آگ کچھ زیادہ ہی دھک رہی تھی۔ جسم کے بال کانٹوں کی طرح کھڑے تھے اور سر میں سے دھواں زہریلے سانپوں کی طرح لہرا لہرا کر اٹھ رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ترشول تھا اور دوسرے ہاتھ میں تیز دھار والا فولادی چکر تھا۔ اس چکر کو گھما کر دشمن پر پھینکتے ہیں۔ چکر گھومتا ہُوا' اڑتا ہُوا جاتا ہے اور دشمن کی گردن اڑا دیتا ہے' وہ اپنے نوکیلے دانت کھولے دور کھڑی مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھنے لگی۔ اس کے پیچھے عورتوں کی چیخوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ مجھے اس کی گرجتی ہوئی کھوکھلی گونج والی آواز آئی:

"تم سمجھتے ہو کہ میرے قبضے سے نکل جاؤ گے؟ مورکھ! یہ تمہاری بھول ہے۔ میں

تمہیں ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سلانے آ گئی ہوں۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے گھورتا رہا اور اس بات کا منتظر رہا کہ دیکھوں وہ کیا کرتی ہے' کس انداز سے مجھ پر حملہ آور ہوتی ہے۔ پاتالی چڑیل نے خونی چکر کو ترشول میں ڈال کر اتنی زور سے گھمایا کہ اس کی گنجار سے ایسے لگا جیسے کوئی طوفانی بگولہ کھنڈر میں داخل ہو گیا ہو۔ پھر اس نے ایک جھٹکے سے ترشول ہوا میں چھوڑ دیا۔ میں نے سہم کر گردن نیچے کر لی اور دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو ڈھانپ لیا۔

خونی چکر زبردست گونج کے ساتھ چکراتا ہوا میرے سر کے اوپر سے گزر گیا۔ اس کی شوکر سے میرے کانوں کے پردے پھٹتے محسوس ہوئے۔ خونی چکر ساری کوٹھڑی میں گردش کر رہا تھا۔ کبھی نیچے ہو جاتا' کبھی اوپر کو اٹھ جاتا۔ ہر بار وہ تیزی سے میری طرف آتا اور ایک غوطہ کھا کر میرے سر اور میری گردن کے ساتھ ٹکرانے کی بجائے ایسے اوپر کو ہو جاتا جیسے کسی نے اسے نیچے سے اوپر اچھال دیا ہو۔ پاتالی چڑیل اچھل اچھل کر خونی چکر کو حکم دے رہی تھی۔ وہ اپنی زبان میں حکم دے رہی تھی' جسے میں سمجھتا تھا۔ یہ ملیچھ ہے' اس کے ٹکڑے کر دو۔ یہ ہمارے دھرم کا دشمن ہے' اس کی گردن اڑا دو۔ میری زبان پر کلمۂ پاک کا ورد جاری تھا اور اسی کی برکت تھی کہ پاتالی چڑیل کا خونی چکر میرے جسم کو چھونے کی بھی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ آخر خونی چکر گردش کرتے کرتے ایک طرف کو بار بار جھکنے لگا اور پھر اس کو آگ لگ گئی اور وہ دروازے کے شگاف میں گرتے ہی غائب ہو گیا۔ اپنے ہلاکت خیز ہتھیار کو ناکام ہوتے دیکھ کر پاتالی چڑیل کا غیض و غضب طوفان کی شکل اختیار کر گیا۔

وہ ایک آفت کی طرح چھلانگ لگا کر میرے سامنے آ گئی۔ اس کی انگارہ ایسی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ وہ زخمی لومڑی کی طرح غرا رہی تھی۔ اس کے نوکیلے دانت ہونٹوں سے باہر نکل آئے تھے۔ ترشول کو تلوار کی طرح لہراتی' کبھی اس طرف

جاتی' کبھی دوسری طرف کو دوڑتی۔ آخر اس نے بالکل میرے سامنے آ کر پوری طاقت سے تین چھریوں والا ترشول مجھ پر پھینک دیا۔ میں جلدی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ ترشول ضرور میرا کام تمام کر دے گا۔ لیکن مَیں نے دیکھا کہ ترشول میرے جسم پر لگنے سے پہلے میرے کھینچے ہوئے دائرے کی نظر نہ آنے والی دیوار سے ٹکرا کر دائرے کے باہر ہی گر گیا تھا۔ پاتالی چڑیل آگ بگولا ہو گئی۔ اس کے جسم سے دھوئیں کے بادل اٹھنے لگے۔ اس کے بالوں سے بھرے ہوئے سیاہ ہاتھوں کی انگلیوں کے ناخن تیز چھریوں کی طرح باہر نکل آئے تھے۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا' وہ مجھے چیر پھاڑ کر رکھ دینا چاہتی تھی۔ مَیں نے اسے مخاطب کر کے کہا:

"او منحوس چڑیل! میں تیرے پنجے سے نکل آیا ہوں' تو اب میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ یہاں سے دفع ہو جا۔"

مَیں نے بلند آواز میں کلمہ شریف پڑھا تو پاتالی چڑیل کے سارے جسم کو جیسے آگ سی لگ گئی۔ پہلے اس کے بدن سے دھواں اٹھتا تھا' اب سرخ آگ کے شعلے بلند ہونے لگے۔ وہ زمین پر گر کر تڑپنے لوٹنے اور دیوانہ وار ہاتھ پاؤں چلا کر اپنے جسم کی آگ کو بجھانے کی ناکام کوشش کرنے لگی اور اسی طرح چیختی چلاتی ہاتھ پاؤں مارتی زمین پر لڑھکتی ہوئی کھنڈر کے شگاف میں سے باہر جنگل کی ڈھلتی ہوئی رات کی تاریکی میں گم ہو گئی۔ میں نے ایک بار پھر خدا کا شکر ادا کیا۔ گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ ابھی رات کے چار نہیں بجے تھے۔ چار بجے صبح کی لو لگ جاتی ہے۔ مجھے ابھی دائرے کے اندر ہی بیٹھے رہنا تھا' جب تک کہ صبح نہیں ہو جاتی۔

11

کھنڈر میں پھر وہی آسیب زدہ خاموشی چھا گئی۔

میری نگاہیں دروازے کے شگاف پر لگی تھیں کہ کب باہر پچھلے پہر کی نیلگوں روشنی نمودار ہوتی ہے۔ اس کے بعد کوئی ڈراؤنا واقعہ پیش نہ آیا۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ میری آزمائش ختم ہو گئی ہے۔ کلمۂ پاک کا ورد میری زبان پر جاری تھا۔ میں ہر سانس پر خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اس نے مجھے اس کٹھن آزمائش میں ثابت قدم رہنے کی توفیق عطا کی۔

اتنے میں کوٹھڑی کے دروازے کے شگاف میں بے معلوم دھیمی دھیمی روشنی نمودار ہونے لگی۔ میرے جسم میں مسرت کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ پھر جنگل میں دور کسی درخت پر بیٹھا ہوا پرندہ چہچہایا۔ اس کے جواب میں کسی دوسرے درخت پر بیٹھا ہوا ایک اور پرندہ بولنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے جنگل میں چڑیوں اور پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں مگر میں دائرے کے اندر ہی بیٹھا رہا۔ میں اس وقت تک اپنی جگہ پر بیٹھے رہنا چاہتا تھا جب تک کہ باہر دن کی روشنی پوری طرح سے نہیں پھیل جاتی۔

آسمان ابر آلود تھا۔ سورج بادلوں کے پیچھے طلوع ہوا تو اس کی روشنی بادلوں میں سے گزر کر کھنڈر کے دروازے سے اندر آنے لگی۔ مجھے اس روشنی میں دروازے کی شکستہ محراب نظر آ رہی تھی۔

جنگل چڑیلوں کی گنجار سے گونج رہا تھا۔ دن کی روشنی ہوتے ہی ساری فضا بدل گئ

تھی۔ جب پوری طرح سے دن نکل آیا تو میں بسم اللہ پڑھ کر اٹھا اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ دائرے میں سے باہر قدم رکھ دیا۔ مجھے کچھ نہ ہوا۔ کسی بدروح نے مجھ پر حملہ نہ کیا۔ میں کھنڈر سے نکل کر باہر آ گیا۔ مَیں نے درختوں کی شاخوں میں سے اوپر آسمان کی طرف دیکھا' آسمان پر بادل اسی طرح چھائے ہوئے تھے۔ رات کو بارش نہیں ہوئی تھی۔ اب میرا اس منحوس کھنڈر میں کوئی کام نہیں تھا۔ میں نے اپنے اوپر لگائی گئی شرط پوری کر دی تھی۔ میں اپنے اندر ایک نئی توانائی اور طاقت محسوس کر رہا تھا۔ یہ کفر کے بت خانے سے نکل کر ایمان کی روشنی میں آ جانے کی طاقت تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اب اگر جنگل میں شیر بھی آ گیا تو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ جنگل میں سے شہر کی طرف جاتی جس پگڈنڈی پر سے رات کو گزرتے وقت مجھ پر موت کا خوف طاری تھا' اب میں اس پر بے خوفی سے چل رہا تھا۔ میں گوالیار اپنے ہوٹل میں آ گیا۔ غسل کیا' وضو کیا اور کمرے میں ہی خدا کے حضور سجدۂ ریز ہو کر شکرانے کے نوافل ادا کئے۔ دلی کی طرف جانے والی گاڑی کا پتہ کیا' بمبئی سے دلی جانے والی گاڑی دوپہر کو گوالیار پہنچ رہی تھی۔ میں ہوٹل کے کمرے میں ہی بیٹھا رہا۔ کمرے میں ہی دوپہر کا کھانا منگوا کر کھایا اور گاڑی کے صحیح ٹائم پر ریلوے سٹیشن پہنچ گیا۔

ٹرین آئی تو اس میں سوار ہو گیا۔ سارے سفر میں یہی خیال لگا رہا کہ پاتالی چڑیل کہیں دوبارہ حملہ نہ کر دے لیکن ایسا نہ ہوا اور میں دلی پہنچ گیا۔ یہ اگست ۱۹۴۷ء کی آخری تاریخیں تھیں۔ پاکستان بن چکا تھا۔ ہندوستان بھی آزاد ہو چکا تھا اور دلی سٹیشن پر انڈیا کے جھنڈے لگے ہوئے تھے۔ سٹیشن پر ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ شہر میں فسادات ہو رہے ہیں۔ سٹیشن پر بھی ایک عجیب ویرانی سی چھائی ہوئی تھی۔ ہندو اور سکھ پھر رہے تھے۔ مسلمان تو اپنے لباس اور شکل و صورت سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔ وہاں مجھے کوئی مسلمان نظر نہیں آ رہا تھا۔ پاکستان سے ہندو سکھ شرنارتھیوں کی ایک ٹرین آ کر تھوڑی دیر پہلے دوسرے پلیٹ فارم پر رکی تھی' جس میں سے ہندو سکھ اتر رہے تھے۔ ادھر سے ہندوستان زندہ باد اور

ست سری اکال کے نعروں کی آواز کبھی کبھی بلند ہوتی تھی۔ سٹیشن کی فضا میں بھی کشیدگی پائی جاتی تھی۔ میں نے پہلے سوچا کہ سٹیشن سے نکل کر کسی ہوٹل میں ٹھہر جاتا ہوں۔ لیکن ایک قلی نے مجھے بتایا کہ شہر کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ قلی سکھ تھا۔ میں نے اس کے آگے اپنے آپ کو ہندو ظاہر کیا تھا۔ کہنے لگا:

"سٹیشن کے آس پاس کئی سڑکوں پر کرفیو لگا ہُوا ہے۔ دونوں فرقے کے لوگ ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہیں۔ تم ابھی شہر نہ ہی جاؤ تو اچھا ہے مہاراج۔"

شہر میں جانا خطرناک تھا۔ سٹیشن پر کوئی مسلمان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ پاکستان سے جو ہندو سکھ شرنارتھی آئے تھے وہ مسلمانوں کے بارے میں مَن گھڑت اور اشتعال انگیز افواہیں پھیلا رہے تھے اور فضا کو اور زیادہ زہر آلود کر رہے تھے۔ میں کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکا اور سیکنڈ کلاس ویٹنگ روم میں آ کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اس وقت پنجاب کی طرف کوئی ٹرین بھی نہیں جا رہی تھی۔ میرا لباس وہی پتلون اور جیکٹ تھی۔ میرا لباس مجھے نہ ہندو ظاہر کر رہا تھا نہ مسلمان ظاہر کر رہا تھا۔ ٹریولر چیک کی کاپی میری جیب میں تھی اور انڈین کرنسی میں چھ سات سو روپے بھی میرے پاس ہی تھے۔ یہاں ایک مسافر سے بات چیت کے دوران مجھے معلوم ہُوا کہ رات ایک بجے کے بعد ایک پسنجر ٹرین لاہور کو جایا کرتی ہے۔ اگر فسادات کی وجہ سے اسے کینسل نہیں کیا گیا تو وہی ایک ٹرین محفوظ ہوگی جو زیادہ فساد دہ علاقوں سے راتوں رات گزر جائے گی۔ میں نے ایک ریلوے ملازم سے تصدیق کرنی چاہی تو اس نے کہا کہ ابھی تک تو ٹرین منسوخ نہیں کی گئی، آگے کچھ پتہ نہیں کیا حالات ہوں۔

میں ویٹنگ روم میں ہی بیٹھا رہا۔ انگریزوں کے زمانے میں سیکنڈ کلاس کا بھی بڑا رعب ہُوا کرتا تھا اور ہر کوئی وہاں داخل ہونے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ آج کل تو تھرڈ کلاس اور فسٹ کلاس سب کا ماحول ایک جیسا ہو گیا ہے۔ میری انگلی میں کامنی نرتکی کی چاندی کی انگوٹھی اسی طرح موجود تھی۔ میں گاہے بگاہے اس پر نگاہ ڈال لیتا تھا۔ کئی بار خیال آیا کہ

کیوں نہ کامنی کو بلانے کی کوشش کی جائے۔ ہو سکتا ہے انگوٹھی اپنے بدن کے ساتھ رگڑنے سے وہ ظاہر ہو جائے اور مجھے وہاں سے بحفاظت نکلنے کی کوئی ترکیب بتا دے یا پھر کیوں نہ میں ریلوے یارڈ کی طرف جا کر اس کا بتایا ہُوا منتر پڑھ کر پھونکوں اور ہوا میں اُڑتا ہُوا اس علاقے سے نکل کر لاہور پہنچ جاؤں۔ لیکن اب مَیں اس قسم کا شرک کرتے ہوئے گھبراتا تھا۔ مجھے خدا کے سوا اور کسی سے مدد نہیں مانگنی چاہیے۔ خدا کے سوا کسی دوسری طاقت سے مدد طلب کرنا بہت بڑا گناہ ہے اور میں اس گناہ کی بڑی سخت سزا بھگت چکا تھا۔ چنانچہ میں نے یہ خیال اپنے دل سے نکال دیا۔ رات پڑ گئی۔ سٹیشن پر کلکتے کی جانب سے اور بمبئی کی طرف سے گاڑیاں آ جا رہی تھیں مگر مشرقی پنجاب کی طرف کوئی گاڑی نہیں جا رہی تھی۔ میں نے ساری امیدیں رات والی گاڑی پر لگا رکھی تھیں۔ وہ گاڑی پیچھے سے آتی تھی۔ رات کے سوا بارہ بجے کے قریب گاڑی آ گئی۔ معلوم ہُوا کہ یہ آگے امرتسر تک جائے گی۔ میں نے سوچا کہ امرتسر تک تو چلتے ہیں' آگے کوئی اور بندوبست ہو جائے گا۔ ابھی دونوں ملکوں کی سرحدیں بند نہیں ہوئی تھیں۔ سرحدیں کھلی تھیں اور مہاجرین اور شرنارتھوں کے قافلے آ جا رہے تھے۔ میں اس گاڑی میں سوار ہو کر امرتسر کی طرف روانہ ہو گیا۔

یہ گاڑی بھی لدھیانہ کے سٹیشن پر جا کر رک گئی۔ کیونکہ آگے حالات بہت خراب تھے۔ ٹرینوں پر بلوائی حملے کر رہے تھے اور مسلمان مسافروں کو باہر نکال نکال کر قتل کر رہے تھے۔ ٹرین کے گارڈ نے اعلان کر دیا کہ گاڑی آگے نہیں جائے گی' یہیں سے واپس دلی چلی جائے گی۔ اس سے پہلے بھی میں اس قسم کے تجربے سے گزر چکا تھا۔ مگر اس دفعہ تو میں منتر پھونک کر ہوا میں اُڑتا ہُوا لاہور پہنچ گیا تھا۔ اب مَیں ایسا کرتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ سچی بات ہے مجھے گھبرانا ہی چاہیے تھا۔ بہرحال میں نے لدھیانہ سے دلی واپس جانے کا خیال تو دل سے نکال دیا تھا' اور یہی سوچا تھا کہ بذریعہ ٹرین نہ سہی سڑک کے راستے کسی نہ کسی طرح لاہور پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ لدھیانے میں مسلمان ابھی کافی تعداد میں شہر

میں اپنے مکانوں میں ہی تھے۔ مجھے یاد آنے لگا کہ لدھیانے میں ہمارے ایک رشتے دار فرنیچر کا کاروبار کیا کرتے تھے۔ ان کی فیملی کبھی کبھی لاہور آکر ہمارے پاس ٹھہرا کرتی تھی۔ انہیں سب خواجہ صاحب' خواجہ صاحب ہی کہا کرتے تھے۔ میں لدھیانے ان کے ہاں کبھی نہیں آیا تھا۔ خیال آیا کہ ان کے ہاں چلا جائے، ہو سکتا ہے وہ بھی پاکستان جا رہے ہوں۔ مَیں بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاؤں گا لیکن مجھے ان کا گھر اور محلہ معلوم نہیں تھا۔ کسی فرنیچر والے سے ان کا مکان معلوم کیا جا سکتا تھا۔ اس وقت دن کے دس گیارہ کا وقت تھا۔ خوب گرمی پڑ رہی تھی۔ پنجاب میں یہ برسات کا سیزن ہوتا ہے۔ اس زمانے میں دریاؤں میں سیلاب بھی بڑے آئے تھے اور بارشیں بھی بہت ہوئی تھیں۔ سٹیشن پر کافی پولیس پھر رہی تھی۔

میں یہ سوچ کر سیکنڈ کلاس کے ویٹنگ روم میں چلا آیا کہ منہ ہاتھ دھو کر پہلے کچھ کھایا پیا جائے، اس کے بعد شہر کا رخ کرتا ہوں۔ سیکنڈ کلاس کا ویٹنگ روم مسافروں سے بھرا ہُوا تھا۔ مَیں نے منہ ہاتھ دھویا اور باہر پلیٹ فارم پر نکل آیا کیونکہ مسافروں کے ہجوم کی وجہ سے ویٹنگ روم کی فضا میں حبس ہو رہا تھا۔ اس ویٹنگ روم سے آگے عورتوں کے سیکنڈ کلاس کا ویٹنگ روم تھا۔ اس کے آگے ریفرشمنٹ روم کا بورڈ لگا ہُوا تھا۔ مَیں اس ریفرشمنٹ روم کی طرف جا رہا تھا کہ سیکنڈ کلاس کے ویٹنگ روم سے نسواری رنگ کی ساڑھی میں ملبوس ایک عورت نکلی جس کو دیکھ کر میں دھک سے رہ گیا۔ اس عورت نے جیسے ہی مجھے دیکھا بے اختیار میرا نام پکار کر میری طرف بڑھی اور میرے ساتھ لگ کر زار و قطار رونے لگی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ جب میں آپ کو بتاؤں گا کہ یہ عورت کون تھی تو آپ کو بھی یقین نہیں آئے گا۔ وہ عورت میری بہن عاصمہ تھی۔ مَیں نے اسے لدھیانے کے سٹیشن پر اچانک دیکھ کر حیرت میں گم ہو کر رہ گیا۔ وہ روئے جا رہی تھی۔ مَیں نے اسے حوصلہ دیا اور اس سے پوچھا کہ وہ تو امریکہ میں تھی' یہاں کیسے آگئی اور ان حالات میں جبکہ چاروں طرف فسادات کی آگ بھڑکی ہوئی ہے۔ مَیں اس کے

چہرے مہرے کو بار بار دیکھ رہا تھا کہ یہ میری بہن عاصمہ ہی ہے یا اس کی شکل کی کوئی دوسری عورت ہے لیکن وہ عاصمہ میری بہن ہی تھی۔ اس کی خاطر میں نے کیسی کیسی مصیبتیں نہیں اٹھائی تھیں' کیسے کیسے خوفناک حالات میں سے گزرا تھا۔ وہ میری بہن تھی۔ میری سب سے پیاری اکلوتی بہن عاصمہ ———— وہ کوئی اس کی ہم شکل نہیں تھی۔ وہ عاصمہ ہی تھی۔ ساڑھی کے پلو سے اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے بولی:

”کسی جگہ بیٹھ جاؤ' مَیں تمہیں سارے حالات سناتی ہوں۔“

ریفرشمنٹ روم ساتھ ہی تھا۔ مَیں اسے لے کر اندر آگیا اور ہم ایک خالی میز پر بیٹھ گئے۔ میرے جذبات میں ایک عجیب طوفان سا مچا ہُوا تھا۔ عاصمہ میری بہن میرے سامنے بیٹھی تھی اور مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ میرے سامنے جو عورت بیٹھی ہے وہ عاصمہ ہی ہے۔ حالانکہ وہ سو فیصد میری بہن عاصمہ ہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بیان کرتی مَیں نے بے تاب ہو کر پوچھا:

”عاصمہ بہن! تم اکیلی یہاں کیسے آگئیں؟“

عاصمہ نے کہا: ”مَیں اکیلی نہیں آئی' تمہارا دوست خالد میرے ساتھ آیا ہے۔ وہ شہر خواجہ ثناء اللہ کا پتہ کرنے گیا ہے کہ آیا وُہ ابھی تک لدھیانے میں ہی ہیں۔ تمہیں معلوم ہے نا ہمارے ایک رشتے دار خواجہ صاحب لدھیانے میں ہوتے تھے۔ وہ اکثر اپنی فیملی کے ساتھ ہمارے ہاں لاہور آیا کرتے تھے۔“

مَیں نے کہا: ”ہاں! مجھے آج ہی وہ یاد آ رہے تھے مگر میں ان کا نام بھول گیا تھا مگر عاصمہ تمہیں یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ تم امریکہ سے کب آئیں؟“

عاصمہ نے کہنے لگی: ”مَیں ایک ہفتہ پہلے لاہور آئی تھی۔ ارشد (عاصمہ کا خاوند) مجھے ڈیلس ایئرپورٹ پر جہاز میں چڑھا گیا تھا۔ اسے بھی میرے ساتھ آنا تھا مگر اس کی کاروباری مصروفیات کچھ ایسی تھیں کہ میرے ساتھ نہ آسکا۔ میرا بھی اچانک لاہور آنے کا پروگرام بن گیا۔ اصل میں' مَیں نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ تم میرے ساتھ ہو۔ ہم ایک

جنگل میں سے گزر رہے ہیں کہ اچانک ایک طرف سے شیر آتا ہے اور تمہیں اٹھا کر لے جاتا ہے۔ مَیں چیختی چلاتی تمہارے پیچھے دوڑتی ہوں مگر شیر تمہیں لے کر غائب ہو جاتا ہے۔ پھر میری آنکھ کھل گئی اور مَیں تمہیں یاد کر کے رونے لگی۔ مَیں نے ارشد سے بات کی کہ میرا بھائی ضرور کسی مشکل میں ہے، مَیں لاہور جاؤں گی۔ مجھے ابھی لاہور بھجوا دو۔ وہ خود نہیں آسکتا تھا۔ اس نے لاہور خالد کو فون کر دیا اور مجھے جہاز پر چڑھا دیا۔ خالد مجھے لینے کراچی آگیا۔ خالد کی زبانی جب معلوم ہوا کہ تم لاہور میں نہیں ہو بلکہ دِلی، بمبئی کی طرف نکل گئے ہو تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ مَیں نے خالد کو ساتھ لیا اور دِلی جانے والی ٹرین میں بیٹھ گئی۔ یہ ٹرین فسادات کی وجہ سے امرتسر تک آ کر رک گئی۔ وہاں سے ہم ایک ایسی ٹرین میں بیٹھ کر لدھیانہ آگئے جس میں پاکستان سے ہندوستان جانے والے ہندو سکھ اور ان کی عورتیں بچے بیٹھے تھے۔ خالد نے کہا کہ یہاں خواجہ ثناء اللہ کے ہاں ٹھہر جاتے ہیں۔ آگے دِلی کے حالات کا ہمیں علم نہیں ہے۔ خواجہ صاحب سے مشورہ کر کے آگے جائیں گے۔"

مَیں نے پوچھا: "خالد کہاں ہے؟"

عاصمہ بولی: "تمہیں بتایا ہے ناں وہ مجھے لیڈیز ویٹنگ روم میں چھوڑ کر خود شہر خواجہ صاحب کے بارے میں معلوم کرنے گیا ہے کہ کیا وہ لدھیانے میں ہی ہیں۔ یہ ساڑھی میں نے خالد کے مشورے سے ہی پہنی تھی تاکہ یہی معلوم ہو کہ مَیں بھی ہندو سکھ ہوں۔"

عاصمہ نے بے تاب ہو کر میرا ماتھا چوم لیا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی:

"خدا کا شکر ہے کہ مجھے میرا بھائی مل گیا۔ اب ہم یہیں سے واپس لاہور چلے جائیں گے۔ خالد ابھی آ ہی رہا ہوگا۔ تم دِلی کیوں چلے گئے تھے؟ اچھا! لاہور چل کر ساری باتیں کروں گی۔"

مَیں نے کہا۔ "خالد کو اکیلے شہر نہیں جانا چاہیے تھا۔ شہر میں تو کرفیو لگا ہوا ہوگا۔"

عاصمہ نے کہا۔ "وہ ایک مسلمان فوجی کے ساتھ گیا ہے۔ بس آ ہی رہا ہوگا۔"

مَیں نے کہا: "مَیں خود اسے جا کر دیکھتا ہوں۔"

عاصمہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی:

"خدا کے لئے میری آنکھوں کے سامنے رہو۔ مَیں اب تمہیں اپنے سے الگ نہیں ہونے دوں گی۔ خالد آ ہی رہا ہوگا۔ ہم یہیں سے کسی گاڑی میں بیٹھ کر واپس لاہور چلے جائیں گے۔"

مَیں اسے کیا بتاتا کہ لدھیانہ سٹیشن سے کوئی گاڑی لاہور نہیں جا رہی۔ عاصمہ سے اچانک مل جانے پر مَیں ابھی تک حیرت میں گم تھا۔ لیکن خالد کے آ جانے سے مجھے حوصلہ ہو گیا تھا کہ اب لاہور واپس جانے کی کوئی نہ کوئی تدبیر نکال لیں گے۔ عاصمہ نے میری انگلی میں چاندی کی انگوٹھی دیکھ کر پوچھا:

"یہ انگوٹھی تم نے کہاں سے لی تھی؟ چاندی کی لگتی ہے؟"

مَیں نے کہا۔ "ہاں چاندی کی ہے۔ بمبئی کی ایک دکان سے خریدی تھی، بس مجھے اچھی لگی مَیں نے لے لی۔"

عاصمہ نے اس کے بعد انگوٹھی میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ وہ بار بار ریفرشمنٹ روم کے دروازے کی طرف دیکھتی۔ کہنے لگی:

"خالد بھائی کو اب تک آ جانا چاہیے تھا؟" مَیں نے کسی قدر برہم ہو کر کہا:

"تم لوگوں نے بڑی حماقت کی جو ان حالات میں اس طرف چل پڑے۔ خالد نے بھی تمہیں نہیں سمجھایا کہ ہر طرف آگ لگی ہوئی ہے۔"

عاصمہ نے معذرت خواہ لہجے میں کہا:

"خالد بھائی کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ مَیں نے ہی اسے مجبور کیا تھا کہ خدا کے لئے مجھے میرے بھائی کے پاس لے چلو۔ وہ ضرور کسی مصیبت میں ہے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تم مجھے مل گئے۔"

عاصمہ بے چینی سے دروازے کی طرف بار بار دیکھتی، کہنے لگی:

"اسے گئے کافی دیر ہو گئی ہے۔ اب تک اسے آ جانا چاہیے تھا۔ تم یہاں بیٹھو' میں اسے جا کر دیکھتی ہوں۔"

مَیں اسے روکتا ہی رہ گیا اور وہ ریفرشمنٹ روم سے نکل گئی۔ مَیں حیران تھا کہ اس میں اتنی دلیری کہاں سے آ گئی ہے۔ اس کے جانے کے فوراً بعد میں بھی باہر آ گیا۔ مَیں نے عاصمہ کو پلیٹ فارم کے گیٹ سے باہر جاتے دیکھا تو اپنے آپ کو کوسنے لگا کہ مَیں نے ان حالات میں اسے اکیلی کیوں جانے دیا۔ مَیں تیز تیز قدموں سے چل کر گیٹ پر آ گیا۔ عاصمہ مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ مَیں وہیں بنچ پر بیٹھ گیا۔ پندرہ بیس منٹ گزر گئے تو مجھے تشویش ہوئی کہ خدا خیر کرے۔ میری بہن کسی مصیبت میں نہ پھنس گئی ہو۔ مَیں اٹھ کر گیٹ سے باہر چلا گیا۔ دور سے مجھے عاصمہ آتی نظر آئی۔ وہ تیز تیز چل رہی تھی۔ میرے پاس آ کر کہنے لگی:

"خالد بھائی نے خواجہ صاحب کا مکان تلاش کر لیا ہے' مگر جب میں نے اسے بتایا کہ سلیم بھائی مجھے مل گیا ہے اور وہ سخت ناراض ہے کہ ہم لوگ ان حالات میں گھر سے کیوں نکل کھڑے ہوئے تو وہ بڑا پریشان ہو گیا۔ کہنے لگا مَیں سلیم بھائی کے سامنے نہیں جاؤں گا۔ مَیں نے اسے بہت سمجھایا کہ بھائی تمہیں کچھ نہیں کہے گا' میرے ساتھ چلو مگر وہ ریل کے ایک خالی ڈبے میں جا کر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا: "مجھے سلیم کے سامنے جاتے ہوئے شرم آ رہی ہے۔"

مَیں نے کہا: "مجھے اس کے پاس لے چلو۔ بڑا بے وقوف ہے۔ اب جو ہونا تھا ہو گیا۔"

"آؤ میرے ساتھ۔"

یہ کہہ کر عاصمہ ریلوے یارڈ میں اس طرف چل پڑی جدھر ریل کے کچھ خالی ڈبے کھڑے تھے۔ اس طرف کوئی آتا جاتا نہیں تھا۔ عاصمہ ایک ڈبے کے پاس جا کر رک گئی۔ یہ فسٹ کلاس کا ڈبہ تھا' جس کے گہرے رنگ کے شیشے کھڑکیوں پر چڑھے ہوئے تھے اور اندر نگاہ نہیں جاتی تھی۔ عاصمہ بولی:

"بھائی تم یہاں ٹھہرو۔ میں اسے جا کر بتاتی ہوں کہ بھیا آ گئے ہیں۔"

اتنا کہہ کر عاصمہ ڈبے کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ دس پندرہ سیکنڈ کے بعد عاصمہ نے ڈبے کے اندر سے مجھے آواز دی۔

"بھائی آ جاؤ اندر۔"

خالد کی حماقت پر مجھے غصہ بھی آ رہا تھا اور اس کے اس طرح ڈبے میں چھپ کر بیٹھنے پر ہنسی بھی آ رہی تھی۔ میں ڈبے میں داخل ہو گیا۔ ڈبے کی ساری کھڑکیاں بند تھیں۔ نسواری رنگ کے موٹے شیشے کھڑکیوں پر چڑھے ہوئے تھے جس کی وجہ سے ڈبے میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مجھے نہ تو وہاں خالد نظر آیا اور نہ عاصمہ ہی دکھائی دی۔ مَیں نے خالد کو آواز دی:

"خالد کے بچے کہاں چھپ کر بیٹھے ہو تم؟" یہ کیا ڈرامہ کر رہے ہو؟"

جیسے ہی میرے ہونٹوں سے یہ الفاظ نکلے ایک بجلی سی چمکی۔ میری آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ ایک چیخ بلند ہوئی اور میرے سامنے عاصمہ اور خالد کی بجائے پاتالی چڑیل کھڑی مجھے سرخ انگارہ آنکھوں سے گھور رہی تھی۔ اس کے منہ سے ڈراؤنی خرخراہٹ کی آواز نکل رہی تھی اور سر کے بالوں میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ترشول تھا۔ میں نے ڈبے سے بھاگنا چاہا لیکن میرے پاؤں من من کے بھاری ہو گئے تھے۔ ڈبے کے فرش نے میرے پاؤں کو جکڑ لیا تھا۔ پاتالی چڑیل نے غیض و غضب کے ساتھ پوری قوت سے ترشول مجھ پر پھینکا۔ میں جلدی سے جھک گیا۔ ترشول میرے سر کے اوپر سے شُو کی آواز کے ساتھ نکل گیا اور پھر ڈبے میں اڑنے لگا۔ پاتال چڑیل چیخ مار کر اچھلی اور مجھ سے دو فٹ کے فاصلے پر آ گئی۔ میں نے کلمۂ پاک کا ورد شروع کر دیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ پاتال چڑیل ہی تھی جو میری بہن عاصمہ کا روپ بدل کر مجھ پر حملہ آور ہوئی تھی۔ اس کے بالوں اور جسم سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ میری طرف بڑھائے۔ اس کے ناخن چھریوں کی طرح باہر کو نکلے ہوئے تھے۔ وہ کسی وحشی جانور کی آواز میں بار بار کہہ

رہی تھی۔ "مرن گھاٹ چلو۔ میرے ساتھ مرن گھاٹ چلو' مرن گھاٹ پر تمہاری چتا تیار
ہے۔ میں اپنے ہاتھ سے تمہیں جلا کر راکھ کروں گی۔"

وہ میری گردن کو دبوچنے کے لئے جھپٹی۔ میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اچانک ٹرین
کے ڈبے کی چھت میں روشنی کا شعلہ سا چمکا اور وہ شعلہ ایک کڑاکے کے ساتھ اس طرح
پاتالی چڑیل پر گرا جس طرح درخت پر بجلی گرتی ہے۔ پاتالی کے سارے جسم کو آگ لگ
گئی۔ وہ آگ میں جل رہی تھی۔ بھسم ہو رہی تھی۔ چلا رہی تھی' چیخ رہی تھی۔ اپنے
جسم کو زور زور سے ہاتھوں سے پیٹ رہی تھی اور ایک ہی جگہ چکر کھاتی جا رہی تھی۔
میں سہمی ہوئی آنکھوں سے یہ بھیانک منظر دیکھ رہا تھا۔ پاتالی چڑیل کا جسم جل کر کوئلے کی
طرح ہو گیا اور اذیت ناک چیخوں کی آواز کے ساتھ دیکھتے دیکھتے فضا میں تحلیل ہو کر غائب
ہو گیا۔ میرے پاؤں فرش نے جیسے چھوڑ دیئے۔ میں نے دہشت زدہ ہو کر ڈبے کے
دروازے سے باہر چھلانگ لگا دی۔ میں ریلوے لائن پر گرا' جلدی سے اٹھا اور پلیٹ فارم
کی طرف بھاگنے لگا۔ پلیٹ فارم تک پہنچتے پہنچتے میرا سانس پھول گیا تھا۔ میں ایک بنچ پر
دھم سے گر پڑا اور سینے پر ہاتھ رکھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ خدا نے مجھے موت کے منہ
سے بچا لیا تھا۔ اگر اچانک چھت میں سے شعلہ لپک کر پاتالی پر نہ گرتا تو میرا زندہ بچنا
ناممکن تھا۔ پاتالی چڑیل کا یہ حملہ انتہائی ہلاکت خیز تھا۔ اس نے میری بہن کا روپ دھار کر
مجھے اپنے جال میں ایسا بری طرح سے پھنسا لیا تھا کہ وہ ایک ہی جھٹکے میں میری گردن تن
سے جدا کر سکتی تھی۔ لیکن عین وقت پر خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی غیبی امداد پہنچ گئی اور
نہ صرف یہ کہ میں موت کے منہ سے باہر نکل آیا بلکہ وہ منحوس پاتالی چڑیل بھی اپنے
عبرت ناک انجام کو پہنچ گئی۔

میرا سانس معمول کے مطابق چلنے لگا تھا۔ میرے ہوش و حواس نارمل ہو گئے تھے۔
مجھے اپنا آپ بھی ہلکا پھلکا محسوس ہونے لگا تھا۔ لیکن پھر بھی مجھ پر بہت خوف طاری تھا اور
میں دیر تک بنچ پر سہما ہوا بیٹھا رہا۔ اچانک سٹیشن کے باہر گولیاں چلنے لگیں۔ لوگوں کا شور

بلند ہوا۔ پلیٹ فارم پر کچھ لوگ دیوانہ وار دوڑتے ہوئے نمودار ہوئے اور ریلوے
لائینوں کی طرف بھاگنے لگے۔ ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا۔ دن کی روشنی پھیلی ہوئی
تھی۔ میں نے سکھوں کو دیکھا۔ ان کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں اور وہ بھاگتے ہوئے
آدمیوں پر وار کر رہے تھے۔ ظاہر ہے بھاگنے والے مسلمان تھے جو کوئی گر پڑتا وہ اسے
تلواریں مار مار کر وہیں قتل کر دیتے۔ میں خوف زدہ ہو کر اٹھا اور جلدی سے پلیٹ فارم کی
دوسری طرف ریلوے لائن پر کود گیا اور وہاں سے دوڑ کر دوسرے پلیٹ فارم پر چڑھ گیا
اور دوسرے پلیٹ فارم کو عبور کر کے ریلوے کے شیڈ میں گھس گیا۔ وہاں بے شمار بوریاں
ایک دوسری کے اوپر رکھی ہوئی تھیں۔ میں بوریوں کے پیچھے چھپ کر سٹیشن کی طرف
دیکھنے لگا۔ سٹیشن پر شور و غوغا مچا ہوا تھا۔ فائرنگ کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ صاف ظاہر
تھا کہ جو مسلمان اپنا گھر بار چھوڑ کر سٹیشن پر آ گئے تھے ہندو اور سکھ انہیں قتل کر رہے
تھے۔ میرے لئے سوائے اس کے اور کوئی راستہ نہیں تھا کہ اس علاقے سے جتنی دور
نکل سکتا ہوں نکل جاؤں۔

میں جہاں چھپا ہوا تھا' اس کا جائزہ لیا۔ یہ ریلوے کا گودام تھا' اس کا ایک عقبی دروازہ
بھی تھا۔ میں دوڑ کر دروازے کے پاس آیا۔ اس طرف بھی ریل کی پٹڑیاں تھیں۔ ایک
ریلوے انجن خالی بوگی کو لئے شنٹ کرتا جا رہا تھا۔ وہ ریلوے یارڈ سے باہر شمال کی طرف
جا رہا تھا۔ اس کی رفتار ہلکی تھی۔ میں ریل کی پٹڑیوں کو پھلانگتا ہوا انجن کے پیچھے لگی خالی
بوگی میں چڑھ کر دروازے میں ہی بیٹھ گیا۔ انجن شنٹ کرتے کرتے ریلوے سٹیشن سے
کافی دور نکل گیا تو مجھے کسی حد تک اپنے محفوظ ہونے کا احساس ہوا۔ شنٹ کرنے والے
انجن عام طور پر ریلوے یارڈ کی حدود میں ہی رہتے ہیں۔ ان کا کام ایک ریلوے بوگی کو
دوسری ریلوے بوگی کے ساتھ جوڑنا ہوتا ہے لیکن یہ انجن ریلوے یارڈ کو پیچھے چھوڑ آیا
تھا اور اس کی رفتار بھی تیز ہو گئی تھی۔ اس کا رخ دلی کی طرف نہیں بلکہ آگے جالندھر کی
طرف تھا۔ شاید یہ بوگی کسی اگلے سٹیشن پر لے جائی جا رہی تھی۔ اس طرح میں خطرے

کے مقام سے آگے نکل آیا۔

کھیت خالی پڑے تھے۔ دور کہیں کہیں گاؤں کے مکانوں سے دھوئیں کے بادل اُٹھ رہے تھے۔ سکھ ان دیہات میں مسلمانوں کا قتل عام کر کے ان کے گھروں کو نذرِ آتش کر رہے تھے۔ انجن کی رفتار اور تیز ہو گئی تھی۔ انجن ایک ریلوے کراسنگ پر سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ سکھوں کا ایک جتھہ نیزے، بلمیں اور تلواریں ہاتھوں میں لئے گھوڑوں پر سوار کھیتوں میں سے جالندھر کی طرف جا رہا تھا۔ بعد میں معلوم ہونے والے واقعات کے مطابق سکھوں کے یہی وہ جتھے تھے، جو پاکستان کی طرف ہجرت کرتے ہوئے مسلمان مہاجرین کے قافلوں پر حملہ کر کے نہتے مسلمانوں کو قتل کرتے تھے۔ انجن ریلوے ٹریک پر دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ یہ احساس مجھے ایک حد تک مطمئن کئے ہوئے تھا کہ میں لاہور یعنی پاکستان کے قریب ہوتا جا رہا ہوں۔ مَیں اب کسی نہ کسی طرح پاکستان پہنچنا چاہتا تھا۔ ابھی تک مَیں نے کامنی نرتکی کی دی ہوئی انگوٹھی کو دوبارہ آزما کر نہیں دیکھا تھا۔ مَیں ایسا کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ میں خدا کے سوا کسی سے مدد نہیں مانگنا چاہتا تھا۔ کامنی کا بتایا ہُوا مجھے وہ منتر بھی یاد تھا جس کو پھونک کر اس نے مجھے ہوا میں اڑایا تھا لیکن میں اس منتر پر بھی لعنت بھیجتا تھا۔ مَیں ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہتا تھا جو شرک کے گناہ کے زمرے میں آتا ہو۔ مَیں اپنے اس ایمان پر ثابت قدمی سے قائم تھا کہ زندگی اور موت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر اللہ نے میری موت لکھ دی ہے تو مجھے کائنات کی کوئی طاقت، دنیا کا بڑے سے بڑا طلسمی منتر بھی موت سے نہیں بچا سکتا۔ لیکن اگر میری زندگی اللہ میاں کی طرف سے ابھی باقی ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اور دنیا کا بڑے سے بڑا طلسمی منتر بھی مجھے ہلاک نہیں کر سکتا۔

مَیں ڈبے کے دروازے سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس خالی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا اور باہر کھیتوں کو دیکھ رہا تھا۔ ایک بار میں نے کھڑکی سے سر نکال کر آگے کی جانب دیکھا تو ریلوے کا سگنل نظر آیا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ دن کی روشنی گلابی ہونے لگی تھی۔

انجن کی رفتار ہلکی ہو گئی۔ آگے کوئی سٹیشن تھا جو چھوٹا سا تھا۔ اس کا ایک ہی پلیٹ فارم تھا۔ دوسری طرف ریلوے لائن اور آگے کھیت ہی کھیت تھے۔ ریلوے انجن یہاں آ کر ٹھہر گیا۔ پلیٹ فارم پر مجھے آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ ان کی باتوں سے معلوم ہُوا کہ ریلوے کی اس بوگی میں کوئی سامان لاد کر واپس لدھیانہ لے جایا جائے گا۔ مجھے واپس نہیں جانا تھا۔ مَیں بوگی کے دوسرے دروازے میں سے اتر گیا، جدھر ریل کی پٹڑی اور آگے کھیتوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا، مَیں ریلوے لائن کے ساتھ لاہور کی جانب چل پڑا۔ پلیٹ فارم پر میں نے دیکھ لیا تھا کہ وہاں سکھ زیادہ تھے۔ سٹیشن پر رکنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

ریلوے لائن پر چلتے چلتے میں کافی آگے نکل آیا تھا۔ دل میں یہی خیال تھا کہ آگے کوئی گاؤں یا قصبہ آیا تو وہاں کسی مسلمان کے گھر میں پناہ لے لوں گا اور پھر ان کے ساتھ ہی پاکستان کی طرف ہجرت کر جاؤں گا۔ یہ ضرور دیکھ لوں گا کہ وہاں کسی مسجد کے مینار نظر آ رہے ہیں یا نہیں۔ مسجد کے مینار نظر آ گئے تو یقینی طور پر وہاں مسلمان ضرور ہوں گے۔ پیدل چلتے چلتے مجھے پسینہ آ رہا تھا۔ اگست کا مہینہ ویسے بھی گرمی اور حبس کا مہینہ ہوتا ہے۔ آرام کرنے کے لئے اس لئے کہیں رک نہیں رہا تھا کہ شام کا دھندلکا بڑھتا چلا آ رہا تھا اور میں اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے کسی گاؤں وغیرہ میں پہنچ جانا چاہتا تھا تاکہ وہاں کسی مسجد کے مینار دور سے دیکھ سکوں۔ شام کے بڑھتے پھیلتے دُھندلکے میں بائیں جانب میری نظر ایک گاؤں پر پڑی۔ گاؤں کے کچھ مکانوں کے خاکے سے نظر آ رہا تھا، ایک طرف درختوں کا جھنڈ تھا، جہاں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ ایک مینار کا ہیولہ سا بھی دکھائی دیا۔ یہ مسجد کا مینار ہی ہو سکتا تھا۔

مَیں ریلوے لائن سے اتر کر گاؤں کی طرف چل پڑا۔

کھیت سنسان پڑے تھے۔ کہیں کوئی آدمی نہیں تھا۔ گاؤں کے باہر ایک جوہڑ تھا۔ ایک خالی گڈ تالاب کے کیچڑ میں آدھی دھنسی ہوئی تھی۔ مینار مسجد ہی کا تھا۔ گاؤں پر سناٹا چھایا

ہُوا تھا۔ درختوں کے جھنڈ میں سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ مَیں مسجد کی طرف بڑھا۔ مسجد کے صحن میں تین چار انسانی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ مجھ پر دہشت سی طاری ہو گئی۔ یہ مسلمان تھے اور انہیں سکھوں ہندوؤں نے شہید کر دیا تھا۔ میں مسجد سے نکلنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ آدمیوں کے دوڑنے کی آوازیں آئیں۔ ساتھ ہی ست سری کال کا نعرہ سنائی دیا۔ یہ سکھوں کا کوئی جتھہ تھا' میں بھاگ کر مسجد کی چھت پر چڑھ گیا۔ کسی سکھ نے مجھے باہر سے چھت کا زینہ چڑھتے دیکھ لیا۔ اس نے چلا کر کہا:

"اوئے اِک مُسلا حالے جیوندا جے۔" یعنی ایک مسلمان ابھی زندہ ہے۔

مَیں نے سکھوں کو تلوار لئے مسجد کے صحن میں داخل ہوتے دیکھا۔ مَیں سمجھ گیا کہ اب اللہ کی ذات ہی مجھے موت سے بچا سکتی ہے۔ مَیں نے ہمت نہ ہاری۔ آدمی کو جان بڑی پیاری ہوتی ہے۔ وہ مرتے دم تک جان بچانے کی جدوجہد کرتا ہے۔ یہ عجیب بات دیکھنے میں آئی ہے کہ آدمی بیمار ہو کر بستر پر نہ پڑا ہو' اگر وہ صحت مند حالت میں ہے اور اچانک اس پر دشمن اسے ہلاک کرنے کی نیت سے حملہ کر دیتے ہیں تو اس کے اندر ایک زبردست طاقت آ جاتی ہے۔

سکھ دس پندرہ تھے تلوار لئے مسجد کی سیڑھیاں چڑھ کر میرے پیچھے آ رہے تھے۔ مسجد کی چھت پر آتے ہی میں نے دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ اس طرف مسجد کی دیوار کے ساتھ جانوروں کے چارے کا بہت بڑا ڈھیر لگا ہُوا تھا۔ مَیں اس کے اوپر گرا اور گرتے ہی لڑھک گیا۔ اٹھا اور کھیتوں کی طرف دوڑ پڑا۔ سکھوں نے بھی مسجد کی چھت سے چارے کے ڈھیر پر چھلانگیں لگا دیں تھیں اور نعرے لگاتے میرے پیچھے آ رہے تھے۔ ان کے اور میرے درمیان فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ موت میرے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔ میں آخر کتنی دور تک دوڑ سکتا تھا۔ کسی نہ کسی جگہ تھک کر یا کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر مجھے گرنا ہی تھا اور اس کے بعد سکھوں کی تلواروں نے میرے جسم کا قیمہ کر دینا تھا۔

کامنی نرتکی کی انگوٹھی میری انگلی میں موجود تھی۔ دماغ نے کہا: "اسے اپنے جسم پر

رگڑو' شاید کامنی آ جائے اور تمہاری جان بچ جائے۔"

پر دماغ نے کہا: "وہ منتر پڑھو جس کو تین بار پڑھ کر تم ہوا میں اڑ سکتے ہو۔ شاید منتر کام کر جائے اور تم اذیت ناک موت سے بچ جاؤ۔" لیکن دل نے کہا: "سلیم! اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہو کر تم نے شرک کا گناہ نہ کرنے کا جو عہد کیا ہے اس پر قائم رہنا۔ اللہ تعالیٰ سے عہد شکنی نہ کرنا۔ اللہ تعالیٰ سے وفاداری کرتے ہوئے اگر تمہیں موت بھی آ جاتی ہے تو اسے ہنسی خوشی قبول کر لو۔ گناہ گار بن کر زندہ رہنے سے بہتر ہے کہ اللہ کی راہ میں اپنی جان دے دو۔ تمہارے لئے جنت کے دروازے کھل جائیں گے۔"

مَیں نے دماغ کے ورغلانے والے خیالوں کو جھٹک دیا اور دل کی نیک ہدایت پر عمل کرتے ہوئے دوڑتا چلا گیا۔ اس وقت مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے میں اللہ کی راہ پر دوڑتا چلا جا رہا ہوں۔ جنت کے دروازے کی طرف دوڑ رہا ہوں۔ یقین کریں میرے دل سے موت کا سارا ڈر خوف نکل گیا تھا۔ میں آخری وقت تک زندگی کی حفاظت کرنا چاہتا تھا جو اللہ کی طرف سے انسان پر عاید کیا ہُوا ایک فرض ہے۔ لیکن میں گوشت پوست کا بنا ہُوا انسان تھا اور انسانی جسم کے دوڑنے کی ایک حد ہوتی ہے۔ مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ میں اس حد کو کراس کر چکا ہوں۔ میری ٹانگوں نے دوڑنے سے جواب دے دیا۔ سکھ میرے سر پر پہنچ چکے تھے۔

اور پھر میں کھیت میں گر پڑا۔ پھر ایک بجلی سی میری آنکھوں کے آگے چمک گئی۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ جس وقت مجھے ہوش آیا تو میں اسی طرح کھیت میں پڑا تھا۔ پہلے مجھے ایسے لگا کہ مَیں مر چکا ہوں' میرے جسم کے ٹکڑے ہو چکے ہیں۔ صرف دماغ میں روح کی تھوڑی سی توانائی باقی ہے جس کی وجہ سے مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں کھیت میں پڑا ہوں۔ مَیں ہاتھ پاؤں ہلاتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ دس بارہ سکھوں نے مجھ پر تلواروں اور کرپانوں سے حملہ کیا تھا۔ میری تو ٹانگیں بازو سب کٹ چکے ہوں گے۔ لیکن مجھے مدھم اور بے معلوم سا احساس ہونا شروع ہو گیا تھا کہ میرے جسم کے اعضا صحیح سالم موجود

ہیں۔ میں اوندھے منہ پڑا تھا۔ میں نے اپنا ایک بازو ہلایا، پھر دوسرا بازو ہلایا، پھر پاؤں کو حرکت دی۔ میرے اعضا سالم حالت میں تھے۔ مَیں زندہ تھا' مَیں بچ گیا تھا۔ خدا نے مجھے بچا لیا تھا۔ مَیں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے چاروں طرف رات کی تاریکی تھی۔ مَیں نے اپنے جسم پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ میرے جسم پر کہیں بھی کوئی زخم نہیں تھا۔ اِردگرد سناٹا تھا۔ میں اٹھ کر ریلوے لائن کی طرف چلنے لگا۔ ریلوے لائن کو میں محفوظ سمجھتا تھا۔ مَیں حیران تھا کہ وہ بجلی سی کونسی چمکی تھی؟ لیکن اتنا مجھے یقین تھا کہ ابھی میری زندگی لکھی ہوئی تھی اور اللہ تعالیٰ نے مجھے سکھوں کی خونی تلواروں سے بچا لیا ہے۔ کیسے بچایا؟ یہ ایک ایسا راز ہے جو آج تک جبکہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں' میری سمجھ میں نہیں آیا اور مَیں نے اس راز کو' اس معمے کو حل کرنے کی کبھی کوشش بھی نہیں کی۔

مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ رات کتنی گزر چکی ہے۔ آسمان پر تارے نکلے ہوئے تھے۔ مَیں ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلا جا رہا تھا۔ مَیں ایسے چل رہا تھا جیسے آدمی خواب میں چلتا ہے۔ موت کا خوف میرے دل سے نکل چکا تھا۔ میری روح جیسے تمام گناہوں کی آلودگیوں سے پاک ہو چکی تھی۔ میں کئی میل تک پیدل چلتا رہا۔ مجھے کوئی اتنی تھکاوٹ بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ دور کچھ فاصلے پر مجھے رات کی تاریکی میں روشنی جھلملاتی نظر آنے لگی۔ ذرا قریب گیا تو یہ روشنی سرخ ہو گئی۔ یہ ریلوے سگنل کی روشنی تھی۔ کوئی سٹیشن تھا۔ چلتے چلتے میں سٹیشن پر پہنچ گیا۔ پلیٹ فارم پر ایک گاڑی کھڑی تھی' جس کے ڈبوں میں اندھیرا چھایا ہُوا تھا۔ پلیٹ فارم کے گیٹ کے سائبان میں ایک بلب جل رہا تھا۔ اس کی مدھم روشنی میں' مَیں نے کچھ فوجیوں کو دیکھا جو ڈبوں کے آگے کھڑے تھے۔ جیسے ہی میں ریلوے لائن کی طرف سے پلیٹ فارم پر چڑھا مجھے ایک فوجی نے روک لیا۔ "کون ہو تم؟" اس نے پوچھا:

مَیں نے کہا: "مسافر ہوں۔"

دو اور فوجی جوان پاس آ گئے۔ ایک نے پوچھا:

"اوئے تم ہندو ہو کہ مسلمان ہو؟"

مَیں نے کہا: "مسلمان ہوں۔"

"کہاں سے آ رہے ہو؟" ایک اور فوجی نے پوچھا: مَیں نے سانس بھر کر کہا:

"بہت دور سے آ رہا ہوں۔ کیا یہ گاڑی لاہور کی طرف جا رہی ہے؟"

انہوں نے مجھے ایک ڈبے میں بٹھا دیا۔ معلوم ہُوا کہ یہ مسلمان فوجیوں کی ٹرین تھی جو پاکستان جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی چل پڑی۔ ڈبے میں کافی فوجی جوان تھے۔ ان کے پاس اسلحہ بھی تھا۔ کسی فوجی نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ وہ آپس میں باتیں کرتے رہے۔ گاڑی کے شور میں ان کی باتوں کی زیادہ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ کسی فوجی نے کہا:

"جالندھر آ رہا ہے اُوئے۔ سٹینڈ ٹُو ہو جاؤ۔"

فوراً دو دو فوجی رائفلیں لے کر ڈبے کے دروازے میں کھڑے ہو گئے۔ جالندھر شہر کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ گاڑی کی سپیڈ کم ہو گئی تھی مگر وہ کہیں نہ رکی' جالندھر سٹیشن کو پیچھے چھوڑتی ہوئی نکل گئی۔ پھر صبح کا اجالا پھیلنے لگا۔ دونوں طرف کھیت تھے۔ مشرقی پنجاب کا یہ وہ علاقہ تھا جہاں ہندو اور سکھ نہتے مسلمانوں کا وحشیانہ قتلِ عام کر رہے تھے۔ یہ وہ قیمت تھی جو آج کی نوجوان پاکستانی نسل کے آباؤ و اجداد پاکستان کے لئے ادا کر رہے تھے۔ معصوم بچوں' بوڑھوں عورتوں کے خون کی یہ وہ بے مثال قربانیاں تھیں جو آج کی پاکستانی قوم کے آباؤ و اجداد دے رہے تھے۔ کھیت سنسان پڑے تھے۔ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ کتنی ہی لاشیں پڑی ہوئی نظر آئیں۔ ان میں بچوں اور عورتوں کی لاشیں بھی تھیں۔ یہ ہمارے وہ بچے اور ہماری وہ مائیں بہنیں تھیں' جنہیں پاکستان کے نام پر شہید کر دیا گیا تھا اور جن کی لاشیں بے گور و کفن پڑی تھیں۔ ٹرین کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ امرتسر شہر آ گیا۔ فوجی ٹرین امرتسر کے سٹیشن پر سے بھی بغیر رکے گزر گئی۔ امرتسر سے لاہور کا فاصلہ زیادہ نہیں ہے۔ پاکستان کی سرحد واہگہ تھی۔ پاکستان قریب آ رہا تھا۔ مَیں کھڑکی میں سے

باہر دیکھ رہا تھا۔ دشمن کا علاقہ ختم ہو رہا تھا۔ پاکستان کی سبز سرزمین شروع ہونے والی تھی۔ میری نگاہ اپنی انگلی میں پڑی ہوئی کامنی نرتکی کی انگوٹھی پر پڑ گئی۔ میں کفر والی اس نشانی کو اپنے ساتھ پاکستان کے اسلامی ملک کی مقدس فضاؤں میں نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ مَیں نے انگلی میں سے چاندی کی انگوٹھی اتاری اور اسے کھڑکی کے باہر بُت پرستوں کی زمین پر پھینک دیا۔ اس وقت مجھے ایسے محسوس ہُوا جیسے مَیں نے اپنے دل کے بُت خانے کا آخری بُت بھی پاش پاش کر دیا ہو۔

ٹرین سرزمینِ پاک میں داخل ہو چکی تھی۔ ہر طرف سبز ہلالی پرچم لہرا رہے تھے۔ لٹے پٹے مہاجرین کے قافلے پاکستان میں داخل ہو رہے تھے۔ ان کے خستہ حال چہروں پر پاکستان کے سبز ہلالی پرچم کو دیکھتے ہی رونق آ جاتی تھی۔ مَیں بھی اپنے گھر پہنچ گیا۔ اکبری منڈی کا نقشہ بدلا ہُوا تھا۔ خالد مجھے اپنے مصری شاہ والے گھر پر ہی مل گیا۔ ہم دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ پاکستان بن جانے کی ہم دونوں کو بھی بے حد خوشی تھی۔ اسی روز رات کو میں نے اپنی بہن عاصمہ کو امریکہ میں فون کر کے بتایا کہ مَیں پاکستان پہنچ گیا ہوں۔ پیاری بہن تھی' بھائی کی آواز سن کر فرطِ مسرت سے اس سے بات نہیں ہو رہی تھی۔ اپنے نئے آزاد وطن پاکستان میں مَیں نے اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا۔ میری زندگی میں ایک بڑا خوشگوار انقلاب آ چکا تھا۔ مَیں نے ہر قسم کے غیر اسلامی شعائر سے توبہ کر لی تھی۔ پابند صوم و صلوٰۃ زندگی گزارنے لگا۔ اللہ تعالیٰ نے کاروبار میں بڑی ترقی عطا کی۔ میرا کاروبار بڑھتا چلا گیا۔ مَیں نے شادی کر لی۔ میرے ہاں کئی اولادیں ہوئیں۔ ایک پورا خاندان بن گیا۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ آج میرا شمار شہر کے مخیر اور نیک دل تاجروں میں ہوتا ہے۔ کئی فلاحی اداروں کا سرپرست ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور انسانوں کے ساتھ بھلائی میری زندگی کا اصول بن چکا ہے۔

اس وقت میں زندگی کی آخری منزلیں طے کر رہا ہوں۔ میری اولادوں کی اولادیں ہو

گئی ہیں۔ بہت بڑا خاندان وجود میں آ چکا ہے۔ کبھی کبھی جب گزرے ہوئے واقعات کو یاد کرتا ہوں تو یقین نہیں آتا کہ مَیں اس قسم کے ہولناک حالات سے گزر چکا ہوں۔ اپنی داستان ختم کرتے ہوئے میں آپ سے ایک بات ضرور کرنی چاہوں گا کہ اپنے اللہ کے سوا اور کسی سے مدد طلب نہ کریں۔ اپنے وطنِ پاکستان سے محبت کریں۔ اپنے دل کو بُرے خیالات سے پاک رکھیں اور اپنی روح کو گناہوں سے آلودہ نہ کریں۔ یاد رکھیں! اُنہی اصولوں پر عمل کر کے آپ زندگی میں بھی کامیاب ہوں گے اور آخرت میں بھی سرخرو ہوں گے۔